اندھیارے

اُجالے

آباد شاہ پوری

مکتبہ چراغِ اسلام۔ ۴۰۔ بی اردو بازار۔ لاہور

اندھیارے اُجالے

آباد شاہ پوری

مکتبۂ چراغِ اسلام ۴۰-بی، اردو بازار- لاہور

اہتمام : محمّد حنیف

مقامِ اشاعت : مکتبۂ چراغِ اسلام، ۴۰ بی اردو بازار۔ لاہور

اشاعتِ اوّل : جون ۱۹۷۹ء

تعداد : ایک ہزار

مطبع : ایورگرین پریس۔ لاہور

قیمت : ۲۲/۵۰ روپے

خوش نویس : سلطان احمد، گجرات

ترتیب مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

سرِ آغاز

ہم کوئی خبر پڑھتے ہیں
کسی مضمون کا مطالعہ کرتے ہیں
کوئی حادثہ ہماری آنکھوں کے سامنے پیش آتا ہے یا اس کی خبر ہم تک پہنچتی ہے
کوئی تہوار یا تقریب مناتے ہیں۔

یہ سب کچھ پڑھ اور دیکھ کر ہم پر بس ایک دم بھر کی تاثراتی کیفیت طاری ہوتی ہے اور پھر غفلت کے اندھیاروں میں کھو جاتے ہیں۔ ہمارے دل کے تار ذرا بھی مرتعش نہیں ہوتے اور نہ زندگی میں انقلاب لانے والی، سوچ کی کوئی کرن ہمارے ذہن میں اجالا کرتی ہے۔ حالانکہ اس خبر، مضمون، حادثے اور تقریب میں عبرت کا گراں مایہ سامان ہوتا ہے۔ میری یہ کتاب ایسے مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے کسی خبر کو پڑھ کر یا کسی واقعے سے متاثر ہو کر آج سے اٹھارہ انیس برس پہلے "جہانِ پیام" کے نام سے لکھے۔ یہ مضامین وقتی خبروں اور واقعات پر مشتمل ہونے کے باوجود آج بھی مستقل افادیت رکھتے ہیں۔ ان مضامین کے لکھنے کا مقصد درحقیقت فکر و نظر کی تربیت اور کردار و عمل کا تزکیہ تھا جس کی ہمارے بوڑھوں اور جوانوں کو دو عشرے پہلے کی بہ نسبت آج کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ ان کی اسی افادیت کی بنا پر میں نے ان مضامین کو ہفت روزہ "ایشیا" اور روزنامہ "تسنیم" اور بعض دوسرے جرائد کی فائلوں کے انبار میں سے نکال کر کتابی صورت دے دی ہے۔ موضوع اور مندرجات کے اعتبار سے قارئین انہیں

بالکل تروتازہ پھولوں کی طرح شگفتہ اور شاداب پائیں گے۔ ایک آدھ مضمون کو چھوڑ کر میں نے سب مضامین کی از سر نو نوک پلک سنواری اور ان میں اضافہ کیا ہے۔ اس طرح کہن سالی کی گرد جھاڑ کر انہیں بالکل ایک نیا رنگ روپ دے دیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا مقصد یہ ہے کہ ہم اپنے گرد و پیش رونما ہونے والے واقعات سے عبرت و نصیحت کا درس لینا سیکھیں اور اپنے فکر و نظر اور کردار و عمل میں وہ انقلاب لائیں جو حقیقی اسلامی زندگی کا مطلوب و مقصود ہے۔

۲۷ صفر المظفر ۱۳۹۹ھ
مُطابق
۲۷ جنوری ۱۹۷۹ء

آباد شاہ پوری

ذاتِ باری تعالیٰ

ماسکو ریڈیو نے چیلنج کیا ہے کہ اگر اللہ ہے تو کوئی معجزہ دکھائے۔ یہ چیلنج ہوم سروس میں ماسکو سے نشر کیا گیا۔ چیلنج کرتے ہوئے کہا گیا کہ وہ کس قسم کا خدا ہے جو اپنے وجود کو ثابت نہیں کر سکتا۔ اگر واقعی اس کا وجود ہے تو وہ ایسا معجزہ کیوں نہیں دکھاتا کہ کسی کو اس کے وجود کی حقیقت میں شک نہ رہے۔

اس چیلنج کو اشتراکیوں کے چھچھورے پن ہی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اللہ کو اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے کوئی اور معجزہ دکھانے کی کیا حاجت ہے جبکہ اس کا سب سے بڑا معجزہ یہ وسیع و عریض اور بے کراں کائنات ہے جس میں اشتراکی روس اپنی ساری مادی قوتوں اور بلند بانگ دعووں کے باوجود ایک ذرۂ بے مقدار کی بھی حیثیت نہیں رکھتا، جس کا پُرحکمت مربوط اور ہم آہنگ نظام پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ کارخانہ آپ سے آپ وجود میں نہیں آ گیا۔ اس کی خالق و صانع کوئی حکیم و دانا ہستی ہے، وہی اس کارخانۂ حیات کو اس طرح چلا رہی ہے کہ کوئی بے ضابطگی اور بے قاعدگی نہیں آنے پاتی۔

اس کارخانۂ حیات کا ذرہ ذرہ اس حکیم و مدبّر کے وجود کی شہادت دے رہا ہے اور جن لوگوں کے دل کی آنکھیں نہیں پھوٹیں، جب وہ اس کائنات کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿آل عمران ۱۹۱﴾

والے ہمارے رب! تو نے یہ سارا کارخانہ بے کار نہیں پیدا کیا۔ تیری ہستی پاک ہے
پس ہمیں آگ کے عذاب سے بچائیو۔

یعنی یہ اللہ کے وجود ہی کو تسلیم نہیں کرتے بلکہ یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ یہ کارخانۂ حیات اس ہستی نے بے مقصد پیدا نہیں کیا، اس کی ذات اس بے مقصد کام کرنے سے بہت بلند اور پاک ہے۔ پھر یہی نہیں کہ اس کائنات کو پیدا کرنے کی ایک غرض و غایت ہے بلکہ ایک روز یہ کائنات ختم ہو جائے گی اور انسان کو اس ذاتِ والا صفات کے حضور حاضر ہونا، اس روز اسے اپنی زندگی بھر کے اس طرزِ عمل کی جواب دہی کرنا ہو گا جو اس نے اللہ کی اس کائنات میں اختیار کیے رکھا اور ایک ایک لمحۂ حیات کا حساب دینا ہو گا جو اس طرزِ عمل کو اختیار کرتے ہوئے اس نے گزارا۔

اللہ نے اپنی آخری کتاب میں جگہ جگہ ان آیات و آثار کا ذکر کیا ہے جو انفس و آفاق میں چاروں طرف پھیلی ہوتی ہیں اور جو اللہ کے وجود پر ناطق و شاہد ہیں۔ ایک جگہ فرمایا:

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۝ (البقرۃ ۱۶۴)

آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں، رات دن کے آنے جانے میں اور اس کشتی میں جو لوگوں کی منفعت کا سامان اٹھائے سمندر میں چلتی ہے اور اس پانی میں جو اللہ آسمان سے نازل کرتا ہے اور جس سے مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے، ان ہر نوع کے حیوانات میں جو اس نے زمین پر پھیلا دیے ہیں، ہواؤں کے چلنے میں اور زمین و آسمان کے درمیان چھائے ہوئے بادل میں عقل رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

سورۂ اعراف میں فرمایا:

وَهُوَ الَّذِیْ یُرْسِلُ الرِّیٰحَ بُشْرًا بَیْنَ یَدَیْ رَحْمَتِہٖ حَتّٰۤی اِذَاۤ اَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰہُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَنْزَلْنَا بِہِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِہٖ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ ؕ اور وہ اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے آگے خوش خبری کے لیے بھیجتا ہے، پھر جب وہ پانی سے لدے ہوئے بادل اٹھا لیتی ہیں انہیں کسی مردہ زمین کی طرف حرکت دیتا ہے اور وہاں مینہ برسا کر اس مری ہوئی زمین سے طرح طرح کے پھل نکال لاتا ہے:

اور یہ تو آفاق کی شہادتیں ہیں، سب سے بڑی شہادت انسان کے اپنے نفس میں ہے۔ سورۂ ذاریات میں ارشاد ہوا ہے:

وَفِی الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ وَفِیْۤ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ؕ اور زمین میں یقین رکھنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں اور پھر خود تمہارے اپنے نفس میں نشانیاں ہیں پھر تم خدا کی دی ہوئی بصیرت و بصارت سے کام کیوں نہیں لیتے؟

مگر جیسا کہ ہم نے کہا ان آثار و شواہد کو دیکھ کر اللہ کے وجود پر وہ لوگ ایمان لاتے ہیں جن کی بصیرت کی آنکھیں پھوٹ نہیں گئی ہوتیں۔ بصیرت سے محروم لوگوں کے لیے تو اللہ نے خود کہہ دیا ہے:

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَۃٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِہَا ۚ وَاِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْہُ سَبِیْلًا ۚ میں عنقریب اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں، وہ خواہ کوئی نشانی دیکھ لیں کبھی اس پر ایمان نہیں لائیں گے (ان کے زیغ قلب کا تو یہ عالم ہے کہ) اگر سیدھا راستہ نظر آبھی جائے تو اسے اختیار نہیں کریں گے اور اگر ٹیڑھا راستہ دیکھ لیں تو اس پر ہو لیں گے۔

(الاعراف ۱۴۶)

پس اگر انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی نشانیاں اشتراکیوں کی نظر میں اللہ کا وجود ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہیں تو انہیں چاہیے اللہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ بھی دکھا دے وہ اس کا وجود تسلیم نہیں کریں گے بلکہ اس معجزے کی گوناگوں مادی توجیہات اور تاویلات میں الجھ جائیں گے۔

وَلَوْ أَنَّنَا نَزَّلْنَا إِلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتَىٰ وَحَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا (الانعام: ۱۱۲) "اگر ہم ان پر فرشتے بھی نازل کر دیتے اور مُردے ان سے باتیں کرتے اور دنیا بھر کی چیزوں کو ان کی آنکھوں کے سامنے جمع کر دیتے تب بھی یہ ایمان لانے والے نہ تھے۔"

دراصل اللہ تعالیٰ کی یہ سنّت نہیں ہے کہ وہ معجزوں کے ذریعے اپنی ذات کو منوائے یا اپنا دین انسانوں پر نافذ کرے۔ کفارِ مکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار کہتے کہ اگر آپ واقعی اللہ کی طرف سے مبعوث کیے گئے ہیں تو کوئی نشانی دکھائیے۔ وَيَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِنْ رَبِّهِ (الرعد: ۲۷) کبھی دعوتِ حق قبول کرنے کے لیے منتظر رہتے کہ اللہ فرشتوں کے پرے لیے بادلوں کے اندر سے زمین پر اتر آئے؟ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ اللَّهُ فِي ظُلَلٍ مِنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِكَةُ (البقرۃ: ۲۱۰) کبھی کہتے اللہ نے جو دعوت نازل کی ہے اگر وہ واقعی حق ہے تو ہمارے اس اعراض و انکار کی سزا دینے کے لیے وہ ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا کسی اور دردناک عذاب سے دوچار کر دے۔ اللَّهُمَّ إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ (الانفال: ۳۲) کبھی کہتے کہ اللہ نے آپ کے ساتھ کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا۔ لَوْلَا أُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ (الانعام: ۸) مگر اللہ نے ان ساری باتوں کے جواب میں ہمیشہ یہی بات کہی کہ انفس و آفاق میں جو نشانیاں اور معجزے پھیلے

ہوئے ہیں تم ان پر نظر ڈالو۔

وَفِي الْأَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ۙ وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ۭ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ (الذّٰریٰت ۲۱)

"زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لیے اور خود تمہارے اپنے وجود میں ہیں، کیا تم کو سُوجھتا نہیں؟"

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو دعوت تمہیں دے رہے ہیں اس پر کھلے دل اور کانوں سے توجہ دو اور سوچو کہ یہ دعوت اسی حکیم و خبیر ذات کی طرف سے ہے یا نہیں جس کی حکمت و آگاہی کی خبر یہ "نشانیاں" اور معجزے دے رہے ہیں۔ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ۝ (ھود ۱)

باقی رہی یہ بات کہ جس قسم کا "معجزہ" تم دیکھنا چاہتے ہو ہم وہ دکھائیں تب مانو گے تو جس روز تمہیں یہ معجزہ دکھا دیا گیا تمہاری وہ مہلتِ عمل بھی ختم ہو جائے گی جو ہم نے تمہیں دے رکھی ہے۔ تم اس زمین پر اینڈتے پھرتے نظر نہ آؤ گے۔ تمہاری رگِ حیات کاٹ دی جائے گی۔

خدا کے وجود سے انکار کچھ اشتراکیوں ہی کی اُپج نہیں ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کو یہ چیلنج پہلی مرتبہ دیا گیا ہے۔ ماضی میں اپنے اپنے وقت کے بڑے بڑے فرعون انکار و جحود کا ایسا ہی مظاہرہ کرتے رہے ہیں، مگر جب ان پر کوئی ناگہانی مصیبت آن پڑی یا فرشتۂ اجل نے ٹینٹوا آن دبایا تو ان کی زبان پر آپ سے آپ اللہ کا نام جاری ہو گیا۔ فرعون نے وجودِ باری تعالیٰ کے "دلائل" مانگے۔ حضرت موسیٰؑ نے دلائل دیے اور ایسے دلائل کہ لاجواب ہو گیا، مگر اس کے باوجود وہ انکار پر اڑا رہا اور اپنے وزیر ہامان سے کہنے لگا کہ ذرا ایک بلند و بالا عمارت تو بنواؤ، میں اس پر چڑھ کر دیکھوں موسیٰؑ کا خدا ہے کہاں؟ میں تو اسے بالکل جھوٹا سمجھتا ہوں۔ فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَطَّلِعُ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى ۙ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ (القصص ۳۸)۔

لیکن جب نیل کی گہرائیوں میں فرشتہ اجل نے اس کی گردن آ دبوچی تو بے اختیار پکار اٹھا۔ اٰمَنۡتُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیۡۤ اٰمَنَتۡ بِهٖ بَنُوۡۤا اِسۡرَآءِیۡلَ وَاَنَا مِنَ الۡمُسۡلِمِیۡنَ "میں نے مان لیا کہ خداوند حقیقی اس کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں بھی سر اطاعت جھکا دینے والوں میں سے ہوں" مگر اس وقت اس کا ایمان لانا اس کے لیے کچھ بھی نفع بخش نہ تھا۔ آٰلۡـٰٔنَ وَقَدۡ عَصَیۡتَ قَبۡلُ وَكُنۡتَ مِنَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ "اب ایمان لاتا ہے حالانکہ اس سے پہلے تک تو نافرمانی کرتا رہا اور فساد کرنے والوں میں سے تھا۔" اب تو تیری لاش ہی کو ہم بچائیں گے تاکہ تو بعد کی نسلوں کے لیے نشانِ عبرت بنا رہے۔ فَالۡیَوۡمَ نُنَجِّیۡكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوۡنَ لِمَنۡ خَلۡفَكَ اٰیَةً" (یونس ۹۰-۹۲)

کامریڈ خروشیف کے گرو لینن، فرعون کی روحانی اولاد تھے۔ زندگی بھر خدا کے وجود کے منکر رہے اور اپنے ربِّ اعلیٰ ہونے کی ڈونڈی پیٹتے رہے، لیکن جب فرشتۂ موت نے ان کی رگ رگ سے جان کھینچ کھینچ کر نکالنا شروع کی، تو بے اختیار زبان پر خدا کا نام آ گیا اور یہ تو کچھ زیادہ عرصے کی بات نہیں جب نازی جرمنی کے بمبار ماسکو اور دوسرے بڑے بڑے روسی شہروں کو تباہ کر رہے تھے اور ہٹلر کی فوجیں طوفان کی طرح یلغار کرتی اور علاقوں پر علاقے فتح کرتی لینن گراڈ اور ماسکو پر امڈ رہی تھیں اور سوویٹ روس چند روز کا مہمان نظر آتا تھا سٹالن نے گرجوں اور مسجدوں کے بند تالے کھلوا دیے اور عوام سے کہا کہ وہ خدا کے آگے جھک جائیں اور اس سے مدد طلب کریں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب سارے مادی سہارے ٹوٹ جاتے ہیں اور انسان کی ساری صلاحیتیں اور قوتیں جواب دے کر اسے بے بسی کے گرداب میں ڈال دیتی ہیں، اس وقت اس کی فطرت میں گندھا ہوا ایمان باللہ اسے اللہ کا سہارا لینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ خود خروشیف صاحب مختلف مواقع پر خدا کی ہستی کا سہارا لیتے ہوئے اس کا نام زبان پر لا چکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ خدا کا نام محض عادتاً زبان پر آ جاتا ہے حالانکہ یہ عادت نہیں وہ فطرت

بولتی ہے جیسے سوویٹ روس میں چالیس برس سے جبر و تشدد کے ہتھیاروں اور تعلیم و تربیت کے جدید ترین حربوں سے متواتر کچلا جا رہا ہے۔ کم از کم دو نسلیں ایسی اٹھ چکی ہیں جن کے دل و دماغ میں تعلیم و تربیت اور وسائل ابلاغ کے ذریعے یہ بٹھایا گیا ہے کہ خدا کا کوئی وجود نہیں۔ عادت تو وہ ہوتی ہے جو انسان اپنے گرد و پیش کے ماحول اور اس ماحول میں پلتے ہوئے معاشرے میں رائج افکار و نظریات اور تہذیبی قدروں سے اخذ کرتا ہے اور وہ اس کے طور اطوار میں رچ بس جاتی ہے۔

(۲۱ جولائی ۱۹۵۹ء)

بحقِ دلبند و راہِ مصطفٰےؐ رو

۱۲ ربیع الاوّل کا دن عالمِ انسانیت کا مایۂ فخر دن ہے۔ اس روز وہ پاک ہستی پہلوئے آمنہ سے ہویدا ہوئی جس کے لیے معمارِ کعبہ ابراہیم خلیل اللہ نے دعا کی تھی اور جس کی نوید مسیح علیہ السلام دے گئے تھے۔ اس مقدس ہستی کا یومِ ولادت جو گمراہ انسانیت کے لیے ہدایت کا نور لے کر آئی، جس نے دکھی انسانیت کو پیامِ راحت و سکون دیا۔ اس کو حلال و حرام اور زندگی کے راست اور غلط رویوں میں تمیز کرنے کی کسوٹی مہیا کی۔ اس کے زخموں پر مرہم رکھا، اس کی ان بیڑیوں کو کاٹا جو غیر اللہ کی بندگی نے اس کے پیروں میں ڈال رکھی تھیں، اس کی پشت سے وہ بوجھ اتارے جس کے تلے وہ صدیوں سے دبی اور کچلی جا رہی تھی، یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف - ۱۵۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت دنیا میں تشریف لائے ساری دنیا کفر و ضلالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہی تھی، جن قوموں اور ملکوں میں انبیائے کرامؑ نے کبھی ہدایت کے چراغ جلائے تھے، وہ یا تو بجھ چکے تھے یا اس طرح ٹمٹما رہے تھے کہ حیاتِ اجتماعی میں پھیلے ہوئے اندھیاروں میں ان کی لو گم ہو کر رہ گئی تھی۔ رہی وہ قومیں اور ملک جو ہدایتِ الٰہی کی روشنی سے کلیتہً محروم چلے آتے تھے تو وہاں ظُلُمٰتٌ بَعْضُهَا

فَوقَ بَعضٍ (تہہ در تہہ تاریکیوں) کا سماں تھا۔ خدائے واحد و لاشریک سے منہ موڑ کر انسان ہر جگہ ذلیل و خوار ہو رہا تھا۔ انسانی معاشرہ مختلف طبقات میں تقسیم تھا اور ہر طبقہ اپنے سے زیر دست طبقے کا خدا بنا ہوا تھا۔ عرب کا ان گھڑ بدوی معاشرہ تھا یا روم و ایران کی مہذب و متمدن سوسائٹیاں، ہر جگہ جنگل کا قانون رائج تھا۔ کمزور اور بے کس، طاقتوروں کے ہاتھوں کچلے جا رہے تھے۔ جہاں انسانی معاشرہ حضارت کے دور میں داخل نہیں ہوا تھا وہاں انارکی کا دور دورہ تھا اور جہاں متمدن حکومتیں قائم تھیں وہاں سیاست و معیشت کے ظالمانہ نظام نے انسانیت کو اپنے چنگل میں جکڑ رکھا تھا۔ اخلاقی و اجتماعی امراض نے ہر جگہ آشیانہ بنا لیا تھا۔ یا تعیش و تکلفات اور غفلت و سرمستی کی زندگی تھی جس میں اس دور کے حکمران اور اونچے طبقات غرق تھے یا مظلومی و بے چارگی اور محکومی و غلامی کے شب و روز تھے جن کی گردش میں متوسط اور نچلے طبقات پس رہے تھے۔ اخلاقی پستی، جنسی بے راہ روی اور نفس پرستی، عالمی وبا کی صورت میں پھیلی ہوئی تھی طبقہ واریت، قومیت اور امتیازِ نسل و نسب نے انسانی معاشرے کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ اس جنون میں سرشار قومیں اور قبیلے ہمیشہ ایک دوسرے سے دست بگریباں رہتے تھے اور دھرتی کا چہرہ ابنِ آدم کے لہو سے لالہ گوں تھا۔

ایسے عالم میں حضور سرورِ عالم صلّی اللہ علیہ وسلّم پیدا ہوئے، ایسی فضا میں حضورؐ پروان چڑھے اور یہی شب و روز تھے جب چالیس برس کی عمر میں حضورؐ ہدایتِ الٰہی کا نور اور حیاتِ انسانی کی کایا پلٹ دینے والا نسخۂ کیمیا لے کر غارِ حرا سے نکلے۔ اس نور سے آپؐ نے زندگی کی تاریک راہیں روشن کیں اور بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھایا اور اس نسخۂ کیمیا سے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی بدل کر رکھ دی۔ اسے ماسوا کے آستانوں سے ہٹا کر خدائے وحدہٗ لاشریک کے آگے سربسجود کیا، اس کو ذلّت و خواری کے مقام سے اٹھا کر عزت و شرف کی مسند پر بٹھایا۔

اسے ایک منضبط دستورِ حیات اور آئینِ حکمرانی دیا۔ صلح و جنگ اور دوستی و دشمنی کے قوانین و ضوابط دیئے۔ معاشرت کے آداب اور اقتصاد و معیشت کے انداز سکھائے۔ تہذیبِ اخلاق کے اصول عنایت کیے۔ آدم کے منتشر و پراگندہ اور نسل و نسب، قوم و وطن اور مختلف طبقات میں بٹے ہوئے بیٹوں کو سلکِ وحدت میں منسلک کیا اور ان کی شیرازہ بندی کی۔ ان کے اجتماعی اور اخلاقی امراض کا مداوا کیا اور ایک ایسا صحت مند معاشرہ تشکیل دیا جس کی نظیر تاریخِ انسانی پیش کرنے سے عاجز ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس کے افراد عیش و تکلفات سے متنفّر، سادگی کے پیکر اور محنت و مشقّت کے خوگر تھے، جس کے آقا خادم اور غلام آقا تھے، جس میں طبقہ واریت، نسلی و قبائلی تفوق اور وطنی و قومی تعصب نام کو نہ تھا، اعزاز و اکرام کا مقام صرف اس فرد کو حاصل تھا جو سب سے زیادہ خدا ترس اور متّقی ہوتا تھا، جس کی سلامت روی اور اخلاقی احساس کا یہ عالم تھا کہ مجرم خود آ کر اقبالِ جرم کرتے تھے اور مطالبہ کرتے تھے کہ انہیں سزا دے کر اس جرم کی آلائش سے پاک کیا جائے جس کے افراد امین، دیانت دار، عفیف، خدا خوف، فرض شناس اور حق بین و حق آگاہ تھے۔ جن کا جینا مرنا سب اللہ کے لیے اور اس نظامِ زندگی کے لیے تھا جو حضور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم نوعِ انسان کی نجات و فلاح کے لیے لائے تھے۔

آج انسانیت پر پھر وہی عالم طاری ہے جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ولادت اور بعثت کے وقت طاری تھا۔ دنیا پھر اسی طرح ضلالت اور گمراہی کے اندھیروں میں گم ہوتی جا رہی ہے۔ انسانی معاشرہ پھر اسی طرح طبقات، قومیتوں اور نسلی و وطنی گروہوں میں بٹ چکا ہے۔ انسان پھر اسی طرح انسان کا خدا بن گیا ہے اور اجتماعی و اخلاقی امراض نے پھر انسانی زندگی کو اجیرن بنا دیا ہے۔ طاقت وروں کی سرمستی و رعونت اور کمزوروں کی بے بسی و بیچارگی کا پھر وہی سماں ہے۔ جو برائیاں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے تشریف لا کر

کائی تھیں۔ نوعِ انسانی پھر ان میں جکڑی جاچکی ہے۔ اور جو بوجھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے انسانیت کی پشت سے اتارے تھے وہ اس پر پھر لادے جاچکے ہیں۔ انسان پھر دکھی ہی دکھی ہے اور اپنے دکھ درد کے مداوا کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ لیکن وہ امّت جس کے پاس یہ مداوا اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حیاتِ طیبہ کی صورت میں ہے اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت جس پر یہ فرض عائد کرتی ہے کہ وہ اس سے اپنے اور نوعِ انسان کے دکھوں کا علاج کرے، وہ کچھ رسوم اور تقریبات انجام دے کر مطمئن ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یوم میلاد النبیؐ اپنے دامن میں کوئی دعوت رکھتا ہے تو وہ یہ ہے کہ امّت یہ سوچے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ تعالیٰ نے جو دعوتِ حق دے کر دنیا میں بھیجا تھا، اس پر وہ خود اپنی زندگی میں کہاں تک عمل پیرا ہے اور حاجت مندِ دنیا کو کس حد تک پہنچا رہی ہے۔ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ۔

(۱۲؍اگست ۱۹۶۲ء)

آخرت ناگزیر ضرورت ہے:

مراکش کے پانچ کریانہ فروش ایک جیل میں زندگی کے آخری دن کاٹ رہے ہیں۔ جلد ہی کسی روز انہیں ایک صحن میں لے جایا جائے گا اور وہاں انہیں گولی ماردی جائے گی۔ یہ سزا انہیں زیتون کے تیل میں جو مراکش میں بطور خوراک کام میں لایا جاتا ہے۔ ہوائی جہازوں میں استعمال ہونے والے ایرو انجن آئل ملاکر بیچنے کے الزام میں دی گئی ہے۔ ایرو انجن آئل ایک خطرناک زہر ہے۔ اس ملاوٹ کے سبب مکینز کے دس ہزار مرد، عورتیں اور بچے عمر بھر کے لیے اپاہج ہو گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے اعضا فالج کی وجہ سے بالکل معطّل ہو چکے ہیں اور وہ زندہ لاش بن کر رہ گئے ہیں، بہت سوں کے ہاتھ یا پاؤں جواب دے چکے ہیں اور بہت سے ایسے ہیں جن کا آدھا دھڑ مارا جا چکا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کسی ملک میں اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کے نتائج، اور وہ بھی فوری نتائج، اتنے سنگین نکلے ہیں اور مراکش غالباً پہلا ملک ہے جہاں ملاوٹ کے جرم میں مجرموں کو سزائے موت سنائی گئی ہے۔ اخبار "پیپلز" کے نامہ نگار خصوصی لارڈ ماگہم نے زہر خورانی کی یہ خبر سن کر مراکش کا دورہ کیا تھا۔ اس دورے کے تاثرات اس نے اخبار مذکور میں شائع کیے ہیں۔ مجرموں کو سنائی جانے والی سزائے موت کا ذکر کرتے ہوئے لارڈ ماگہم رقمطراز ہے:

"لیکن میرے خیال میں انہیں گولی مار دینے سے بھی انصاف کا تقاضا پورا نہیں ہوگا۔ میں نے ان ننگ انسانیت کریانہ فروشوں کی ہوسِ جلبِ زر کا شکار ہونے والے دس ہزار

اشخاص کے ساتھ دو مہینے گزرے ہیں۔ اجادر کا ازالہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مرنے والوں کی دلدوز چیخوں سے جو ہولناک سماں پیدا ہو گیا تھا میں اسے فراموش نہیں کر سکتا۔ میں نے بعض وحشی عرب آقاؤں کو اپنے غلاموں کے ساتھ اذیت ناک سلوک کرتے دیکھا ہے اور ان کی کرب ناک کراہیں سنی ہیں مگر جو نظارہ میں نے مراکش کے اس شہر میں کیا، کوئی دوسرا منظر اتنا کرب ناک نہ تھا۔ میں نے انسانوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو دکھ درد سے کراہتے دیکھا ہے۔ یہ لوگ جس اذیت اور دکھ کا شکار ہوتے ہیں۔ اس کے پیش نظر میرے نزدیک ان کے لیے سزائے موت کافی نہیں۔ یہ سزا لوگوں کے ان بے شمار مصائب اور مستقل عذاب کا مداوا نہیں ہو سکتی جو انہیں ان تاجروں کے ہاتھوں اٹھانا پڑا ہے۔"

اور واقعہ یہ ہے کہ ان تاجروں کے ہولناک جرم کے مقابلے میں یہ انتہائی سزا ناکافی ہے اور ایسے ہی واقعات پر ایک سلیم الفطرت انسان ضرورت محسوس کرتا ہے کہ مجرموں کو ان کے جرائم کا ٹھیک ٹھیک بلا کم و کاست بدلہ ملنا چاہیے۔ لیکن اس زندگی میں آپ ان کے لیے کوئی بھیانک سے بھیانک سزا تجویز کر دیں وہ اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتی۔ مثلاً ان ننگِ انسانیت مجرموں کو آپ گولی سے اڑائیں۔ یا ان کا ایک ایک عضو کاٹ کر ماریں، جس اذیت میں دس ہزار انسان زندگی بھر کے لیے مبتلا کر دیے گئے ہیں اور اس کا جو اثر خاندانوں اور پورے معاشرے پر مترتب ہو گا، معاشرے کی مقرر کردہ سخت سے سخت تر سزا بھی اس اذیت اور اثر کا ازالہ نہیں کر سکتی۔ پھر اسی دنیا میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ بہت سے افراد اپنے کیے ہوئے جرائم کی سزا پانے سے صاف بچ جاتے ہیں۔ کبھی عدالت کا ناقص نظام، صحیح انصاف کرنے میں آڑے آتا ہے، کبھی انسان خود ایسے ہتھکنڈے اختیار کرتا ہے کہ عدالت تک پہنچنے کی نوبت ہی نہیں آتی، کبھی انسان اتنا طاقت ور اور صاحبِ اقتدار ہوتا ہے کہ نہ تو کمزور اور محکوم لوگ اس کے مظالم کا بدلہ اس سے لے سکتے ہیں اور نہ عدالتیں ہی ان مظالم کا کوئی مداوا کرتی ہیں کہ وہ ان کا اپنا بنایا ہوا آلہ ہوتی ہیں۔ پھر بے شمار گناہ ایسے ہوتے ہیں جن کی پکڑ دنیا کی

عدالتیں نہیں کر سکتیں، لیکن جن کے اخلاقی اثرات کسی معاشرے کو تباہی کے راستے ڈال کر اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتے ہیں۔

اسی طرح بے شمار لوگ ہیں جو نیکی اور صلاح کی زندگی بسر کرتے اور نیکی کو سربلند کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں اور بدی کی طاقتوں سے نبرد آزما رہتے ہیں۔ زندگی بھر بد لوگوں کے ہاتھوں مصائب اٹھاتے ہیں، مادی مفادات سے ہاتھ دھو لیتے ہیں اور دنیا میں تنگ دستی اور مظلومی کی زندگی گزارتے ہیں۔ اس کے برعکس بدکار اور ظالم لوگ دنیا میں عیش و عشرت سے رہتے ہیں۔ ہر قسم کے مالی فوائد سمیٹتے اور مادی مفادات سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔

عقل کہتی ہے کہ ان دونوں گروہوں کا انجام یکساں نہیں ہونا چاہیئے کہ مر کر ہمیشہ کے لیے مٹی ہو جائیں، بلکہ انہیں ان کی نیکی اور بدی کا بدلہ ملنا چاہیئے۔ اور دنیوی زندگی میں قانونِ جزا و سزا کے اسی کمزور پہلو کو دیکھ کر اور حقیقی انصاف کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے انسانی فطرت مطالبہ کرتی ہے کہ کوئی عدالت ایسی ہونی چاہیئے جہاں انسان اپنے نیک اور بُرے اعمال کا ٹھیک ٹھیک، نہ بیش نہ کم، نیک اور برا بدلہ پا سکے۔

اسلام میں آخرت کا تصور انسان کے اسی فطری مطالبے کو پورا کرتا ہے۔ یہ تصور بتاتا ہے کہ انسان کو دنیوی زندگی کے چند روز بسر کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے مر کر مٹی نہیں ہو جانا ہے بلکہ اسے دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور زندہ کرنے کے بعد اسے اس عدالت میں حاضر کیا جائیگا جس کا قاضی اور حاکم اللہ تعالیٰ ہوگا۔ اس عدالت میں انسان کا نامۂ اعمال کا ایک ایک ورق الٹا جائے گا اور اس نے دنیا کی زندگی میں جو بھی بُرے اعمال کیے تھے ان کو تولا جائے گا۔ فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ ۝ (القارعۃ ۶ تا ۹)

اس کی نیکیوں کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دیا جائے گا اور اس کے بُرے اعمال کی بلاکم و کاست سزا دی جائے گی۔ جو جرائم اس نے دنیا میں کیے تھے اور بچ نکلا تھا یا سزا تو پائی تھی مگر جرائم کے مقابلے میں کم تر، ان کی نوعیت اور اثرات و نتائج کو تول کر اسے ٹھیک ٹھیک سزا دی جائے گی۔

دنیا کی عدالتوں میں تو سفارش، رشوت اور اثر و رسوخ سے بھی کام چل جاتا ہے۔ مال و دولت، دوستیاں اور بڑے لوگوں کی سرپرستیاں بھی مجرموں کو کیفر کردار کو پہنچنے سے بچا لے جاتی ہیں لیکن آخرت کی عدالت میں نہ کوئی سفارش کام آئے گی نہ رشوت اور دوستی۔

یوما لا تجزی نفس عن نفس شیئا ولا یقبل منھا شفاعة ولا یؤخذ منھا عدل ولا ھم ینصرون ० (البقرہ : ۴۸)

اِمتحان گاہ میں

پچھلے دنوں ایک امتحان میں شامل ہونے کا اتفاق ہوا۔ گھر سے روانگی سے لے کر امتحان گاہ میں داخلے اور امتحان سے فراغت تک ایک عجیب تاثر دل و دماغ پر چھایا رہا اور اب جو میں ان شب و روز کا جائزہ لیتا ہوں تو ایک ایسی حقیقت درس عبرت لیے سامنے آتی ہے جس کی طرف کبھی بھول کر بھی انسان نظر نہیں ڈالتا۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت دل پریشان بھی تھا اور شرمسار بھی۔ اس لیے کہ امتحان کی تیاری خاطر خواہ نہ ہو سکی تھی۔ یہ بات نہ تھی کہ وقت نہ ملا تھا۔ وقت خاصا ملا تھا مگر کچھ آج کل کرتے گزر گیا اور کچھ دنیا کے گوناگوں گورکھ دھندوں کی نذر ہو گیا۔ اور وقت آپ جانتے ہیں بڑا گریز پا ہوتا ہے، کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ کوئی اُس کا ساتھ دیتا ہے تو خوب ورنہ اسے کفِ افسوس ملتا چھوڑ کر ہوا ہو جاتا ہے۔ انسان کے ذرا سے توقف یا لحظہ بھر کی غفلت سے وقت کا کارروان کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے۔

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دُور شد

چنانچہ وقت گزر گیا تھا اور اب وہ گھڑی سر پر آ گئی تھی جب یہ پتہ چلنا تھا کہ وقت غفلت و لاپروائی میں گزرا یا ہوشیاری و آگاہی میں۔ چنانچہ پریشانی و شرمساری نے آ لیا تھا۔ پریشانی تو وقت کے ضیاع کی تھی اور شرمساری، غفلت اور لاپروائی

کے نتیجے کا تصور کر کے جو بہر حال ایک روز سامنے آنے والا ہے۔ ایسا نتیجہ جو زندگی پر اچھے یا بُرے اثرات مرتّب کرے گا۔

امتحانی مرکز میں امتحان گاہ میں داخل ہونے سے پہلے عجب منظر تھا۔ سینکڑوں امیدوار آخری لمحاتِ مہلت کو غنیمت جان کر انہیں زیادہ سے زیادہ کام میں لانے کی سعی میں مصروف تھے۔ پریشانی کی پرچھائیاں چہروں سے ہویدا، نگاہیں مضطرب اور ذہن محوِ مطالعہ و تفکّر۔ کچھ ایسے بھی تھے جو فکر اور پریشانی سے بالکل آزاد، گپیں ہانک رہے تھے، جیسے انہیں آزمائش کا کوئی مرحلہ ہی درپیش نہیں۔ بہت سے ایسے تھے جنہیں امتحان سے زیادہ یہ معلوم کرنے سے دلچسپی تھی کہ امتحانی مرکز کے نگران اور سپرنٹنڈنٹ وغیرہ کون اور کس قسم کے لوگ ہیں اور ان کا "وسیلہ" کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

وقتِ مقررہ پر امتحان گاہ میں داخل ہوئے اور اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔ نگرانِ اعلیٰ نے ہدایات دیں اور تنبیہات کیں۔ گھڑی نے ساڑھے سات بجائے، کاپیاں اور پرچے تقسیم ہوئے اور پھر ہر شخص امتحانی پرچے کا جواب لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ امتحان دینے والوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو وقت سے پہلے ہی پرچہ دے کر رخصت ہو گئے، تاہم اکثریت اس وقت اٹھی جب وقت ختم ہو گیا۔ باہر نکلے۔ تو بہت سے چہرے مطمئن اور کھلے ہوئے تھے اور بہت سے افسردہ اور پریشان۔

روزانہ امتحان گاہ سے باہر اور اندر کم و بیش یہی منظر ہوتا۔ پہلے ہی روز ایک صاحب پکڑے گئے۔ کہتے ہیں اُن کے پاس نوٹس تھے۔ نگران کی نظر پڑتے ہی انہوں نے نوٹس پھینک دیئے اور صاف مُکر گئے۔ نگرانِ اعلیٰ سے انگریزی میں خُوب خُوب گرم باتیں ہوئیں، پھر خدا جانے کیا ہُوا۔ بس اتنا پتہ چلا کہ طوفان تھم گیا ہے،

مگر دو ایک روز کے بعد طوفان دوبارہ امڈ کر پھٹ پڑا۔ وہی نگران ان صاحب کے کمرے میں متعین ہوئے۔ انہوں نے پرچہ لینے سے انکار کر دیا اور امتحان گاہ سے باہر جانے لگے مگر نگرانِ اعلیٰ نے روک لیا کہ آپ ڈیڑھ گھنٹے سے پہلے امتحان گاہ سے نہیں جا سکتے۔ ان کا کہنا تھا ہمیں کون روک سکتا ہے؟ ہم پرچہ نہیں دیں گے۔ نگرانِ اعلیٰ انہیں بٹھاتے تھے اور یہ "واک آؤٹ" پر تلے ہوئے تھے۔ پھر صاحب بہادر کی زبان میں گرم گرم باتیں ہوئیں اور جب الفاظ کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو اردو میں بنکارے، قیامت کے دن میں آپ کا گریبان پکڑوں گا۔ بصد مشکل ان کا جوش اور غصہ ٹھنڈا کیا گیا۔

امتحان ختم ہوا تو جن کے پرچے اچھے ہوئے تھے انہوں نے خدا کا شکر ادا کیا اور جو مطمئن نہ تھے وہ ممتحن کا پتہ چلانے اور ان تک پہنچنے کے وسیلے اور سفارشیں سوچنے اور ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ میں اس سارے عرصے میں سخت بے چین اور مضطرب رہا۔ امتحان سے فارغ ہو جانے کے بعد جتنا وقت ملتا وہ سارا اگلے روز کے پرچے کی کتابیں دیکھنے میں گزرتا۔ حتیٰ کہ اس شدید محنت نے صحت پر بھی اثر ڈالا۔ مگر صحت کی پروا نہ کرتے ہوئے میں نے اپنی غفلت اور کوتاہی سے پیدا ہونے والی کمی پورا کرنے کی کوشش کی۔

اب جو میں پیچھے مڑ کر نظر ڈالتا ہوں تو یہی کیفیت اس امتحان گاہ کی دکھائی دیتی ہے جسے دنیا کہتے ہیں اور جس میں ہم اور آپ رنگ رلیاں منانے اور عیش و عشرت کی بساط بچھانے کے لیے نہیں، امتحان دینے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ جی ہاں یہ دنیا دار الامتحان ہے، یہاں انسان کو امتحان کی غرض سے بھیجا گیا ہے۔ یہ امتحان اس کے ہوش سنبھالتے ہی شروع ہو جاتا ہے مگر وہ یہی کہتا ہے کہ "ابھی بہت وقت ہے" امتحان کی تیاری کر لے گا اور پرچے پر جواب لکھ لے گا۔ اس کے صبح و شام بس اسی غفلت میں گزرتے جاتے ہیں اور جب مہلتِ عمل بظاہر تھوڑی سی رہ جاتی ہے تو پھر

ہوش آتا ہے۔ غفلت میں ضائع جانے والے وقت پر پریشان ہوتا ہے اور کفِ افسوس ملتا ہے۔ "پرچے" کو دیکھتا ہے اور اپنے عمل کے جواب کاپی پر ثبت کرتا ہے۔ بہت سے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں نہ وقت کے ضیاع کا رنج ہوتا ہے اور نہ اس بات کی فکر کہ امتحان میں ناکام ہو گئے تو کیا بنے گا؟ وہ آخری لمحات مہلت بھی اسی بے فکری اور عیش و مستی کے عالم میں گزار دیتے ہیں۔ بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو امتحان کی تیاری کرنے، یا امتحان گاہ کے نگرانِ اعلیٰ کی جو ممتحن بھی ہے، ہدایات پر عمل پیرا ہونے، اس کی تنبیہات کو آویزۂ گوش بنانے اور ٹھیک ٹھیک جواب دینے کے بجائے سہاروں کی تلاش میں رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ سہارے مل گئے تو بیڑا پار ہے۔ اگر چہ جواب کی کاپی کوری چھوڑ کر جائیں یا بداعمالیوں سے سیاہ کر کے۔ وہ کسی پیر، مرشد، ولی اور بزرگ کا دامن پکڑتے ہیں اور "ممتحن" کی نگاہِ کرم حاصل کرنے کے لیے ان کی سفارش اور وسیلے پہ تکیہ کرتے ہیں۔ اور پھر جب امتحان گاہ سے رخصت ہونے کا وقت آتا ہے تو کچھ ایسے ہوتے ہیں جو بہت شاداں و فرحاں رخصت ہوتے ہیں۔ فرشتے ان پہ نازل ہوتے ہیں اور انہیں کامیابی و کامرانی کا مژدۂ جانفزا سناتے ہیں۔ يَآ أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ ارْجِعِيٓ إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥ فَادْخُلِي فِي عِبٰدِي ٥ وَادْخُلِي جَنَّتِي ٥ (اے نفسِ مطمئن، چل اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ (تو اپنے انجامِ نیک سے) خوش (اور اپنے رب کے نزدیک) پسندیدہ ہے، شامل ہو جا میرے نیک بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں) (الفجر، ۲۷-۳۰) کچھ امید و بیم کی حالت میں ہوتے ہیں جنہیں اپنے ممتحن کی نگاہِ رحمت کا سہارا ہوتا ہے کہ وہ اس کے غلط جوابات سے درگزر کر کے تھوڑے سے بہت جو صحیح جوابات ہیں ان میں برکت کرے گا۔ کبھی اپنی کوتاہیوں اور زیادتیوں کا خیال کرتے ہیں تو آنکھیں اشک بار ہوتی ہیں اور دل بدست دعا کہ اے اللہ ہمارے گناہوں سے درگزر فرمانا

اور ہمیں دامن مغفرت میں ڈھانپ لینا اور اپنے نیکوکار بندوں کی صف میں شامل کرنا اور روزِ محشر رسوا نہ کرنا۔ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ (آل عمران: ۱۹۳، ۱۹۴)

اور کچھ وہ ہوتے ہیں جو سیاہ چہرے اور افسردہ دل لیے رخصت ہوتے ہیں۔ امتحان کا نتیجہ ان کے سامنے ہوتا ہے۔ ناکامی و نامرادی ان پر سایہ فگن ہوتی ہے اور موت کے فرشتے انہیں مار پیٹ رہے ہوتے ہیں۔ وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ (الانفال - ۵۰)

اور جب نتیجے کا دن آئے گا تو جو امتحان میں کامیاب ہوں گے انہیں کامیابی کی سند دائیں ہاتھ میں دی جائے گی اور وہ مسرت کے مارے پکار اٹھیں گے۔ هَآؤُمُ اقْرَءُوْا كِتٰبِيَهْ ۝ اِنِّىْ ظَنَنْتُ اَنِّىْ مُلٰقٍ حِسَابِيَهْ ۝ (الحاقۃ - ۱۹-۲۰)

(لو پڑھو میرا اعمال نامہ میں خوب جانتا تھا کہ ایک روز میرا حساب ہونے والا ہے۔

اور پھر اس کامیابی کے صلے میں انہیں جنت کی مسرت بھری ابدی زندگی عطا ہو گی۔ فَهُوَ فِىْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ فِىْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ قُطُوْفُهَا دَانِيَةٌ ۝ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝ (الحاقۃ ۲۱ - ۲۴) وہ پُرمسرت زندگی سے بہرہ یاب ہوں گے، بلند بہشت ان کی جائے قیام ہو گی جس کے میوے جھکے ہوئے ہوں گے۔ ان سے کہا جائے گا، لو مزے سے کھاؤ پیو یہ ان اعمال کا صلہ ہے جو تم نے ایامِ ماضی میں انجام دیے تھے۔

اور جو لوگ اس امتحان میں ناکام ہوں گے انہیں اپنے وہ سفارشی اور بزرگ کہیں نظر نہ آئیں گے جن کا دامن پکڑ کر سمجھا کرتے تھے کہ پرچہ کورا اور سیاہ ہوتے

باوجود ان کی سفارش سے کامیابی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان سے کہے گا: وَمَا نَرٰی مَعَكُمْ شُفَعَآءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰٓؤُا لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝ اب ہم تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے جن کے متعلق تم سمجھتے تھے کہ تمہارے کام بنانے میں ان کا بھی کچھ حصہ ہے۔ تمہارے آپس کے رابطے سب ٹوٹ گئے اور وہ سب تم سے گم ہو گئے جن کا تم زعم رکھتے تھے۔ (الانعام-۹۴)

اور جو لوگ اس امتحان میں ناکام ہوں گے، ان کا اعمال نامہ ان کے بائیں ہاتھ میں دے دیا جائے گا۔ وہ اس اعمال نامے کو پا کر کہیں گے "کاش یہ ہمیں دیا ہی نہ ہوتا اور ہمیں اپنے حساب کتاب کا پتہ ہی نہ چلتا۔ اے کاش کہ ہم پر موت ہی طاری رہتی۔ نہ ہمارے مال نے ہمیں کوئی فائدہ پہنچایا، نہ ہمارا دبدبہ اور اقتدار ہی باقی رہا" وَ اَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ بِشِمَالِهٖ ۙ فَيَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ لَمْ اُوْتَ كِتٰبِيَهْ ۝ وَلَمْ اَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝ يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝ مَآ اَغْنٰى عَنِّيْ مَالِيَهْ ۝ هَلَكَ عَنِّيْ سُلْطٰنِيَهْ (الحاقۃ ۲۵-۲۹) انہیں اعمال نامہ دینے کے بعد پکارا جائے گا۔ خُذُوْهُ فَغُلُّوْهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيْمَ صَلُّوْهُ ۝ ثُمَّ فِيْ سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوْهُ ۝ اِنَّهٗ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ الْعَظِيْمِ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ ۝ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هٰهُنَا حَمِيْمٌ ۝ وَلَا طَعَامٌ اِلَّا مِنْ غِسْلِيْنٍ ۝ لَّا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ ۝ (الحاقۃ ۳۰-۳۷) اسے پکڑو اور طوق پہنا کر جہنم میں جھونک دو پھر اسے ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں جکڑ دو۔ یہ عظیم تر خدا پر ایمان نہیں رکھتا تھا اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتا تھا۔ پس آج اس کا یہاں کوئی یار غمخوار نہیں ہے۔ زخموں کے دھوون کے سوا اس کے لیے کوئی کھانا نہیں جسے خطا کاروں کے سوا کوئی نہیں کھاتا۔

ہم دنیا کے امتحانات کی تیاری میں تو پھر بھی کچھ نہ کچھ لگے رہتے ہیں جو بہت بڑا اور اصلی امتحان ہم سے لیا جا رہا ہے اس میں کامیاب ہونے کے لیے کچھ نہیں کرتے ۔ (۲۸ جون ۱۹۶۱ء)

متاعِ چند روزہ

بظاہر ایک بے مایہ سی خبر ہے۔ میو ہسپتال کے قریب ایک دیہاتی نوجوان ہٹا کٹا، صحت مند، چاق و چوبند چلا جا رہا تھا، اچانک چکرا کر گرا اور دیکھتے ہی دیکھتے دم توڑ گیا۔ طبی معائنے پر پتہ چلا کہ حرکتِ قلب بند ہو گئی تھی۔ یہ ہے انسان ضعیف البنیان! جو اپنی زندگی میں نہ ختم ہونے والی آرزوؤں اور اندیشہ ہائے دراز میں کھویا رہتا ہے، لوگوں کے حق مارتا ہے، کمزوروں اور زیر دستوں پر دستِ ستم دراز کرتا ہے، فریب، بے ایمانی اور مار دھاڑ سے مال و دولت جمع کرتا ہے، ناانصافی اور ظلم کا مرتکب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اکڑتا اور اینڈتا ہے، دولت، قوت اور اقتدار کے نشے میں سرمست خدا و خلق کے حقوق پامال کرتا ہے، عظیم الشان کوٹھیاں اور فلک بوس عمارات تعمیر کرتا ہے، عیش و عشرت کے سامان فراہم کرتا ہے گویا اُسے اِس دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے حالانکہ اسے کچھ خبر نہیں ہوتی کہ سانس کی آمد و شد کا جو سلسلہ جاری ہے کس وقت رک جائے گا۔ فرشتۂ اجل کس لمحے اس کا گلا آن دبائے گا اور وہ اس سلسلے کو روک دے، مال و جاہ، عزت و عظمت، حکومت و اقتدار، عمارات، کوٹھیوں اور باغیچوں کو اسی دنیا میں چھوڑ کر خالی ہاتھ چل بسے گا۔

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

انسان کی زندگی جس کی آرزوئیں اور تمنائیں لا انتہا و دراز ہیں، حباب آسا زندگی

ہے۔ کہنے والے نے کیا ٹھیک کہا ہے:

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلا ہے پانی کا

پانی کی سطح پرسکون اور ہموار ہوتی ہے۔ اچانک ہوا کا ایک ننھا سا جھونکا اس سے ٹکراتا ہے۔ سطح آب پر ایک جنبش سی پیدا ہوتی ہے اور ایک بلبلا نمودار ہو جاتا ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے یہ بلبلا پھوٹ جاتا ہے اور پانی کے سینے پر ایک ہلکے سے ارتعاش کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ یہی مثال اس دنیا میں انسانی زندگی کی ہے۔ انسان بحرِ حیات میں ایک بلبلے کی طرح نمودار ہوتا ہے اور چند ساعتیں سانس لینے کے بعد دنیا میں اس کے خاکی وجود سے تعلق رکھنے والا کوئی نشان نہیں رہتا۔ مگر انسان اس مختصر سی زندگی کے لیے کیا کچھ نہیں کرتا؟ اس کے ایک ایک لمحے کے فکر و عمل کا انداز یوں ہوتا ہے جیسے موت کا پیالہ وہ کبھی نہیں پیئے گا، قیامت تک کے لیے زندگی کا پٹہ لکھوا لایا ہے۔ حالانکہ وہ دن رات اپنے سامنے انسانی قافلوں کو دارِ فنا سے عالمِ بقا کی طرف کوچ کرتے دیکھتا ہے اور خود اپنے ہاتھوں سے اپنے عزیزوں، دوستوں اور شناساؤں کو مٹی میں دفن کرتا ہے۔ وہ عزیز، دوست اور شناسا جن میں سے بہت سے ابھی کچھ دیر پہلے چنگے بھلے زندگی کے کاروبار میں مشغول تھے، مگر جب رب کا بلاوا آ گیا تو ان کی زندگی کی بساط لپیٹتے کچھ بھی وقفہ نہ لگا۔

موت سے یہ بے فکری اگر کسی ایسی قوم اور اس کے افراد میں پائی جاتی ہو جو حشر و نشر اور حیات بعد الموت کی قائل نہیں اور جو اس بات پر ایمان نہیں رکھتی کہ اسے مر کر اللہ کے حضور اپنے اعمالِ زندگی کی جواب دہی کرنی ہے تو کچھ ایسی تعجب انگیز بات نہیں لیکن جو قوم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتی ہو، ان کی تعلیمات

کو حرزِ جاں بنانے کی مدعی ہو، اس امر کی قائل ہو کہ اس کی یہ دنیوی زندگی چند روزہ ہے، اسے ایک روز مرنا ہے اور مر کر خاک نہیں ہو جانا بلکہ دوبارہ زندہ ہونا اور اپنے پروردگار کے حضور پیش ہو کر اس زندگی کے ایک ایک لمحے کا حساب دینا ہے، وہ اجتماعی حیثیت سے بھی اور اس کے افراد انفرادی طور پر بھی موت سے اس طرح بے فکر نہیں ہو سکتے جتنا کہ وہ دیکھے جاتے ہیں۔ قرآن کریم اور احادیث رسول ؐ میں توحید اور رسالت پر ایمان کے بعد سب سے زیادہ زور آخرت کی زندگی پر دیا گیا ہے کہ فی الحقیقت اس زندگی پر ایمان صادق و کامل ہی ایک انسان کو دنیا کی زندگی میں راہِ راست پر قائم رکھ سکتا ہے۔

قرآن کریم میں جگہ جگہ دنیا کی چند روزہ زندگی کا ذکر ہوا ہے اور آخرت کی ابدی زندگی میں راحت و آسائش کے حصول کی طرف اپنے مخاطبین کو توجہ دلائی گئی ہے۔ ایک مقام پر اس فانی زندگی کی مثال اس طرح بیان فرمائی:

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ ط حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ لا اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ط كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (یونس ۲۴)

دنیا کی یہ زندگی (جس کے نشے میں تم مست ہو) اس کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا تو زمین کی پیداوار جس کو آدمی اور جانور سب کھاتے ہیں، خوب گھنی ہو گئی، پھر عین اس وقت جبکہ زمین اپنی بہار پر تھی اور کھیتیاں بنی سنوری کھڑی تھیں اور ان کے مالک سمجھ رہے تھے کہ اب ہم ان سے فائدہ اٹھانے پر قادر

ہیں یکایک رات کو یا دن کو ہمارا حکم آگیا اور ہم نے اسے اس طرح غارت کر کے رکھ دیا۔ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں اس طرح ہم نشانیاں کھول کھول کر پیش کرتے ہیں، ان لوگوں کے لیے جو سوچنے سمجھنے والے ہیں۔

آخرت کے مقابلے میں دنیا کی یہ زندگی کس قدر بے حقیقت ہے، قرآن کریم نے اس کا ذکر مختلف مقامات پر کیا ہے۔ سورۂ یونس ہی میں ارشاد ہوتا ہے:

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ''

(۴۵)

جس روز اللہ ان کو اکٹھا کرے گا تو دنیا کی زندگی انہیں ایسے محسوس ہوگی، گویا یہ محض گھڑی بھر آپس میں جان پہچان کو ٹھہرے تھے۔

سورۂ المومنون میں ارشاد ہوا ہے کہ جب روز محشر برپا ہوگا اور اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے لوگ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوں گے تو اللہ ان سے پوچھے گا۔ كَمْ لَبِثْتُمْ فِى الْاَرْضِ عَدَدَ سِنِيْنَ (زمین میں تم کتنے سال رہے ہو؟) چاہے دنیا میں کتنے ہی سو سال جیے ہوں گے انہیں یہ ساری مدت چند ساعتوں سے زیادہ محسوس نہ ہوگی وہ جواب میں کہیں گے۔ لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ (ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ وہاں ٹھہرے تھے) ایک اور مقام پر فرمایا ہے؛ وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ۝ (الرعد - ۲۶) (یہ لوگ دنیا کی زندگی میں مگن ہیں حالانکہ دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں ایک متاع قلیل کے سوا کچھ بھی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام کو دنیا کی اس عارضی زندگی میں گم ہو جانے سے بچنے کی ہر وقت تلقین فرماتے رہتے تھے۔ عبد اللہ ابن عمرؓ روایت کرتے

ہیں کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا مونڈھا پکڑ کر فرمایا : "دنیا میں اس طرح رہو گویا تم راہ چلتے مسافر ہو" یعنی جس طرح ایک مسافر کسی عارضی مقام پر جا کر اپنا گھر نہیں بنا لیتا اور اس کی دلچسپیوں میں نہیں کھو جاتا اسی طرح تم بھی اس دار فنا کو جو تمہاری عارضی جائے قیام ہے مستقل ٹھکانا بنا کر اس کی زیب و زینت میں نہ کھو جاؤ، بلکہ تمہارا طرز عمل اس راہ چلتے مسافر کا سا ہونا چاہیئے جو ٹھنڈی اور سایہ دار جگہ دیکھ کر وہاں گھڑی دو گھڑی کے لیے سستانے کی خاطر رک جاتا ہے۔ وہ جتنی دیر بھی وہاں ٹھہرتا ہے اپنی منزل مقصود اس کی نظر میں رہتی ہے اور وہاں پہنچنے کی فکر ہر آن دامنگیر رہتی ہے، وہ اس ٹھنڈی اور سایہ دار جگہ پر ریجھ کر نہیں بیٹھ رہتا۔ ایک دوسری روایت میں ان الفاظ کا اضافہ ہے "اور تو اپنے آپ کو مردوں میں شمار کر جو قبروں کے اندر ہیں۔" یعنی یہ مت بھولو کہ سانس کی جو آمد و شد جاری ہے اور جس پر تمہاری زندگی کا دارومدار ہے وہ کسی وقت بھی رک سکتی ہے اور تمہیں مردوں کی صف میں پہنچا سکتی ہے۔

كُلُّ امْرِئٍ مُصَبَّحٌ فِيْ اَهْلِهٖ
وَالْمَوْتُ اَدْنٰى مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهٖ

(آدمی اپنے اہل و عیال میں اس عالم میں صبح کرتا ہے کہ موت اس کے جوتے کے تسموں سے زیادہ قریب ہوتی ہے۔)

حضورؐ دنیوی زندگی کی ناپائداری کو مسلمانوں کے ذہن میں بٹھانے کی ہر ممکن کوشش فرماتے۔ کبھی ارشاد ہوتا "دنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں اس طرح ہے جیسے کوئی شخص دریا میں انگلی ڈالے اور پھر دیکھے کہ انگلی کیا چیز ساتھ لے کر آئی" یعنی کس قدر پانی انگلی کے ساتھ لگا ہے۔ کبھی فرماتے "جو شخص اپنی دنیا کو عزیز و محبوب رکھتا ہے وہ اپنی آخرت کو ضرر پہنچاتا ہے اور جو شخص اپنی آخرت کو

عزیز رکھتا ہے وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچاتا ہے تم اس چیز کو اختیار کرو جو باقی رہنے والی ہے اور فنا پذیر شے کو چھوڑ دو" ــــ اور جاوداں شے پر فنا پذیر شے کو ترجیح دینا حماقت نہیں تو اور کیا ہے!

یا اھل اللذات دنیا لا بقاء لھا
ان اغترار بظل زائل حمق

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کسی مسلمان کو دنیا کے کاموں میں ضرورت سے زیادہ منہمک پاتے، تو سخت ناپسندیدگی کا اظہار فرماتے۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک روز نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم باہر نکلے۔ ہم بھی آپؐ کے ہمراہ تھے۔ آپؐ کو ایک مقام پر ایک بلند گنبد نظر آیا۔ دریافت فرمایا: "یہ کس کا ہے؟" عرض کیا گیا کہ فلاں انصاری نے بنایا ہے۔ آپؐ خاموش ہو گئے۔ وہ گنبد والے انصاری خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، تو انہوں نے سلام کیا، لیکن آپؐ نے منہ پھیر لیا۔ اس نے کئی مرتبہ سلام کیا لیکن آپؐ نے ہر بار جواب دینے کے بجائے منہ پھیر لیا۔ چہرۂ مبارک پر غصّے کے آثار دیکھ کر انصاری نے صحابہؓ سے پوچھا۔ اللہ کے رسولؐ مجھ سے خفا نظر آتے ہیں؟ صحابہؓ نے بتایا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم تمہارے اس گنبد کے پاس سے گزرے تھے تو دریافت فرمایا تھا کہ یہ گنبد کس نے بنوایا ہے؟ وہ انصاری اسی وقت گئے اور کدال لے کر اس گنبد کو گرا دیا۔ پھر ایک روز رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا گزر اس طرف سے ہوا۔ پوچھا "وہ گنبد کیا ہوا؟" عرض کیا گیا۔ "بنانے والے نے آپ کی ناراضی کے پیشِ نظر اسے منہدم کر دیا ہے۔" آپؐ نے فرمایا: "خبردار ہر عمارت اپنے بنانے والے کے لیے وبال ہے بجز اس عمارت کے جس کے بغیر زندگی گزارنا مشکل ہو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

"دنیا مومن کے لیے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے جنت۔"

قید خانے میں کس کا جی لگتا ہے؟ چاہے کتنی ہی راحتیں اور نعمتیں فراہم کر دی جائیں، کون انسان قید خانے کی زندگی کو پسند کرتا ہے اور اس زندگی کو انتہا محبوب سمجھتا اور اس میں اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ آزادی کی زندگی بھول جائے؟ اس کے برعکس آزادی کی زندگی ہر وقت اس کے ذہن پر چھائی رہتی ہے، وہ اس کے لیے دن رات تڑپتا اور آرزو کرتا ہے، اسی کے خواب دیکھتا ہے، اسی سے ہم کنار ہونے کی خواہش دل میں پالتا اور اسی کے لیے ہر ممکن تگ و دو کرتا ہے۔ مومن کی یہی کیفیت دنیا میں ہوتی ہے۔ اس کے نزدیک اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے، دنیا کی زندگی اسے قید خانے کی زندگی معلوم ہوتی ہے۔ دنیا کی نعمتوں اور آسائشوں کو وہ کوئی اہمیت نہیں دیتا، نہ ان سے کسی قسم کا انہماک رکھتا ہے۔ زندگی کے جو سامان اللہ نے اسے مستعار دیے ہیں وہ انہیں اس قید خانے میں دلچسپی اور دلجمعی کا سامان پیدا کرنے میں نہیں لگاتا بلکہ اس کی ساری دلچسپیوں اور تمناؤں کا مرکز آخرت کی زندگی ہوتی ہے۔ اس زندگی کی "آزاد فضا" میں پہنچنے کے لیے وہ ہر وقت بے تاب رہتا اور اس کے لیے جدوجہد کرتا ہے۔ وہ اپنی دنیوی زندگی کے شب و روز حدود الٰہی کا پابند ہو کر اس طرح گزارتا ہے، جس طرح قیدی، قید خانے کے قوانین و ضوابط کی پابندی میں گزارتے ہیں اور اس کی سختیوں، صعوبتوں اور لذاتِ دنیوی سے محرومیوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتا ہے۔

رہا کافر چونکہ دنیوی زندگی ہی اس کے نزدیک حقیقی زندگی ہے۔ اس لیے دنیا کو قید خانہ نہیں جنت سمجھتا ہے۔ اس کی لذتوں اور نعمتوں سے جی بھر کر بہرہ یاب ہونے کی سعی کرتا ہے۔ اس کے نزدیک خدا کا قانون کوئی قانون نہیں اور اس قانون کی قائم کردہ حدیں کوئی

وجود نہیں رکھتیں۔ وہ شتر بے مہار کی طرح جس کھیت میں چاہتا ہے منہ مارتا ہے اور جس طرف اس کی نفسانی خواہشات لے چلتی ہیں، چل کھڑا ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے زندگی ہے تو یہی دنیا کی زندگی اور یہی جنت ہے اگر انسان اسے اپنی تگ و دو سے بنا لے۔

دنیا کی ہلاکت خیز رنگینیوں میں ڈوب جانے سے بچانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو تلقین فرمایا کرتے تھے کہ وہ موت سے غافل نہ ہوں، اسے ہر دم نگاہ و خیال میں رکھیں۔ قبرستان جانے کی ترغیب دیتے تاکہ دنیوی زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کا احساس قلب و ذہن میں اُجاگر رہے۔ زندگی کی طویل طویل امیدیں باندھنے سے منع فرماتے۔ ارشاد ہوتا: موت قریب ہے اور انسان کی آرزو دراز۔ ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ اپنے سامنے ایک لکڑی زمین میں گاڑی پھر ایک اور لکڑی اس پہلی لکڑی کے پہلو میں اور ایک تیسری لکڑی ان دونوں سے خاصی دور نصب کی، پھر فرمایا "تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟" صحابہؓ نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسولؐ بہتر جانتے ہیں" آپؐ نے فرمایا "یہ پہلی لکڑی انسان ہے اور یہ جو اس کے پہلو میں دوسری لکڑی ہے اس کی موت ہے اور یہ تیسری انسان کی امید ہے۔ انسان امیدوں اور آرزوؤں میں گرفتار رہتا ہے اور وہ کبھی ختم ہونے نہیں پاتیں، اچانک پہلو میں کھڑی ہوئی موت اسے آلیتی ہے۔"

آخرت کی یاد ذہنوں میں زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے حضورؐ فرمایا کرتے موت سے ڈرتے رہا کرو" ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے تشریف لائے دیکھا لوگ ہنس رہے ہیں۔ فرمایا "اگر تم لذتوں کو فنا کر دینے والی کا اکثر ذکر کرتے رہو، تو تمہیں کبھی ہنسی نہ آئے اور لذتوں کو فنا کر دینے والی موت ہے بس اسے تم ہر وقت یاد رکھو۔"

(۱۷ ستمبر ۱۹۵۹ء)

موت کا ایک دن معیّن ہے

لارڈ برٹرینڈرسل برطانیہ ہی کے نہیں، یورپ بھر کے مشہور مفکّر اور فلسفی ہیں۔ انہوں نے ۱۹۳۶ء میں پیشین گوئی کی تھی کہ میں یکم جون ۱۹۶۲ء کو نوّے سال کی عمر پاکر مر جاؤں گا۔ اپنی یہ پیشین گوئی انہوں نے ایک خود نوشتہ تعزیتی مضمون میں شائع کر دی تھی۔ چند ہفتے ہوئے ان کا ایک بیان برطانیہ کے اخبار نیوز کرانیکل میں شائع ہوا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں ابھی تک اپنی اس پیشین گوئی پر قائم ہوں۔ یکم جون ۱۹۶۲ء کو موت ماضی الحیلہ کے ساتھ میرا رابطہ منقطع کر دے گی۔ البتّہ جوں جوں وقت قریب آتا جا رہا ہے کسی حد تک اعصابی بے چینی محسوس کرنے لگا ہوں۔

انسان کی موت کب آئے گی، یہ ایک ایسا راز ہے جسے ذات باری ہی جانتی ہے جس کے ہاتھ میں زندگی کا سر رشتہ ہے، لیکن انسان نے جہاں خدائی کے دوسرے شعبوں میں حصّہ دار بننے کی کوشش کی ہے وہاں غیب کے رازہائے سربستہ سے آگاہی کا دعوٰی بھی کیا ہے، چنانچہ نجومی اور رمّال لوگوں کی زندگی اور موت کے زائچے ایک زمانے سے تیار کرتے چلے آتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان بیچاروں کو خود اپنی زندگی اور موت کے بارے میں کوئی خبر نہیں ہوتی۔ ہارون الرشید کا قصّہ ہے کہ اسے کسی نجومی نے بتایا کہ امیر المومنین کی زندگی بس تین ماہ رہ گئی ہے۔ ہارون الرّشید بڑا متفکر ہو گیا اور شب و روز کی گردش کے ساتھ ساتھ اس کا فکر بھی بڑھتا چلا گیا۔ ہر وقت کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ سلطنت کے

کاموں سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ ہر وقت پریشان گم سم، چہرہ پیلا زرد ہو گیا۔ ہر وقت موت ہی کا فکر قلب و دماغ پر مسلّط تھا۔ وزیر ہارون کی اس حالت پر بڑا حیران تھا۔ آخر ایک روز اس نے پُوچھا۔ امیر المومنین آپ ہر وقت مغموم و متفکر نظر آتے ہیں؟ ہارون الرشید نے نجومی کی پیشین گوئی کہہ سنائی۔ وزیر نے عرض کی کہ امیر المومنین! نجومی جھوٹ کہتا ہے، اسے کچھ خبر نہیں ہے۔ ہارون نے کہا بھلا جھوٹ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس نے بار بار زائچہ تیار کیا تھا۔ وزیر نے کہا۔ امیر المومنین! نجومی کو حاضری کا حکم دیجئے، چنانچہ نجومی دربار میں بلایا گیا۔ وزیر نے پُوچھا۔ تم لوگوں کی زندگی اور موت کا وقت بھی جانتے ہو؟ نجومی نے جواب دیا۔ جی حضور۔ وزیر نے کہا، اچھا بتاؤ تم کے سال اور جیو گے۔ نجومی نے زائچہ تیار کر کے حساب لگایا اور بولا حضور چالیس برس۔ وزیر نے جلّاد کو حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دو۔ چشم زدن میں نجومی کی گردن کٹ کر دُور پڑی تھی اور بے سر لاشہ فرشِ خاک پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اب وزیر نے خلیفہ سے کہا کہ امیر المومنین! جو شخص اپنی موت کا وقت نہیں جانتا تھا وہ کسی دوسرے شخص کے بارے میں ٹھیک طور پر کیسے بتا سکتا ہے کہ وہ کب مرے گا؟

بہر حال نجومی چاہے اپنی موت کا وقت نہ جانتے ہوں، وہ دوسروں کی موت اور زندگی کے زائچے اب بھی تیار کرتے ہیں۔ ایک فلسفی نے اس میدان میں قدم رکھا تو اس نے نجومیوں کے برعکس دوسروں کے بجائے اپنی موت کی پیشین گوئی کی۔ آخر نجومی اور فلسفی میں کچھ تو فرق ہونا چاہیئے تھا۔ ویسے زندگی بھر فلسفہ بگھارتے بگھارتے پیشین گوئیوں پہ اتر آنا بجائے خود دلچسپ بات ہے، خصوصاً ایسے لوگوں کی زبان سے پیش گوئی تو اور بھی زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے جو احساس و شہود سے ماورا اور کسی بات کے قائل نہیں ہوتے۔

اس فلسفی کا کہنا ہے کہ اس نے اکتیس برس پہلے جو پیشین گوئی کی تھی وہ اس پر آج

بھی قائم ہے۔ البتہ جوں جوں "وقتِ موعود" قریب آ رہا ہے وہ اپنے دل کی گہرائیوں میں اضطراب اور بے قراری محسوس کرنے لگا ہے۔ وہ کہتا ہے یہ اضطراب اور بے چینی صرف اس لیے ہے کہ یکم جون ۱۹۶۲ء کو اس کا رشتہ ماضیِ بعید سے کٹ جائے گا۔ حالانکہ مستقبل کے لمحات حال بنتے ہیں، حال ماضی اور ماضی، ماضیٔ بعید۔ لیکن زمانے کی اس رفتار سے شاید ہی کسی نے کبھی کوئی بے چینی محسوس کی ہوگی۔ شاید ہی کسی کے دل میں اضطراب پیدا ہُوا ہو کہ اس کا ہوا، عمر بڑی تیزی سے اُڑا چلا جا رہا ہے۔ اس کی زندگی کے عزیز ترین لمحات ماضیِ بعید کی تاریکیوں میں گم ہوتے جا رہے ہیں اور جو وقت جا رہا ہے پھر کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔ خصوصاً وہ لوگ جو مادّہ پرست ہیں اور جنہیں اس زندگی کے بعد کسی دوسری زندگی کا یقین نہیں ہے اور جو

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

کے فلسفے پر عمل پیرا ہو کر دن رات عیش و نشاط کی سرمستیوں میں غرق رہتے ہیں۔ ان کے دل میں کبھی اس بات پر اضطراب کی ہلکی سی لہر بھی اٹھنے نہیں پاتی کہ بڑے ہی حسین و جمیل لمحات ان سے چھنتے جا رہے ہیں۔ پھر بھلا وہ ماضیٔ بعید سے اپنے تعلق کے کٹ جانے کے تصوّر پر کیوں کر مضطرب ہو سکتے ہیں؟

دراصل بات یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں دوسری زندگی کا جو احساس گندھا ہُوا ہے اور جو خارجی اثرات کے تحت اکثر اس طرح سو جاتا ہے کہ اس کی موجودگی کا علم بھی نہیں ہو پاتا، انسان جب اپنی موت کا تصوّر کرتا ہے تو یہ احساس انگڑائی لینے لگتا ہے پھر انسان جس عقیدہ و نظریہ کا حامل ہوتا ہے اس کے مطابق احساس کی اس انگڑائی کے اثرات اس پر مرتّب ہوتے ہیں۔ اگر ایک شخص مومن ہے اور دوسری زندگی پر ایمان رکھتا ہے اور یہ ایمان بالکل ہی ناتوان نہیں ہو چکا ہوتا تو اس کو یہ احساس اسے حُسنِ عمل پر اکساتا ہے اور ماضی کی تغافل کیشیوں، نافرمانیوں، معصیتوں اور بے عملیوں پر رُلاتا ہے

وہ اپنے اللہ کے حضور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتا ہے۔ اس کا دل اس تصور سے مضطرب ہو جاتا ہے کہ جب قیامت کے روز اس کا مالک و آقا اور خالق و رب دریافت کرے گا کہ اس نے اپنی جوانی، اپنی صحت، اپنی دولت اور اپنی عمر کن کاموں میں صرف کی، اس نے دنیا میں رہ کر آخرت کی زندگی کے لیے کیا سامان فراہم کیا تو اس کے پاس اس کا کیا جواب ہوگا۔

لیکن اگر کوئی شخص مومن نہیں ہے بلکہ کافر و ملحد یا دہریہ ہے تو جب وہ خیال کرتا ہے کہ اس کی زندگی کا رشتہ اب دنیا سے کٹ جانے والا ہے، عیش و نشاط سے لبریز دنیا سے، تو وہ ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کا فلسفہ کہتا ہے کہ بس زندگی اسی دنیا تک محدود ہے مگر اس کی فطرت کی گہرائیوں میں رچا بسا دوسری زندگی کا احساس انگڑائی لینے لگتا ہے اور اس سے اس کا دل مضطرب ہو جاتا ہے۔ اس کا جی اس دنیا اور اس کی مسرتوں کو چھوڑنا نہیں چاہتا۔ وہ اس تصور سے غمگین ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی کا آفتاب بس گھڑی دو گھڑی میں ڈوب جانے والا ہے اور پھر وہ اس کی ایک ایک شے کو حسرت سے تکنے لگتا ہے اس کی فطرت میں گندھا ہوا احساس اس سے کہتا ہے کہ کیا زندگی کا یہ سارا کھیل اس لیے تھا کہ انسان ایک روز اپنے گرد و پیش کی حسین و دلفریب، آنکھوں کو خیرہ اور عقل کو مرعوب کر دینے والی دنیا کو اس طرح خالی ہاتھ چھوڑ کر موت کی اتھاہ تاریکیوں میں گم ہو جائے گا؟ اور اس سوال کا صحیح جواب نہ پا کر وہ بے قرار اور مضطرب ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے اس کی زندگی کا آفتاب موت کے افق کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ اس اضطراب اور بے چینی میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ فی الحقیقت یہ اضطراب اسی احساس سے پیدا ہوتا ہے مگر چونکہ فلسفہ و عقل کی تہیں اس پر پڑی ہوتی ہیں اس لیے انسان محسوس نہیں کر پاتا اور وہ اس کی ایسی توجیہات کرنے لگتا ہے جیسی توجیہہ برٹرینڈ رسل نے کی ہے۔ برٹرینڈ رسل کی پیشین گوئی غلط نکلی۔ ان کا انتقال ۱۹۶۲ء میں نہیں ۱۹۷۰ء میں ہوا۔ اس طرح یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ انسان غیب داں نہیں ہے۔

وہ نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا اور اس کی موت کب آئے گی۔ یہ وہ راز ہے جس کے بارے میں ٹپوے تو لگائے جا سکتے ہیں لیکن دو اور دو چار کی طرح کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ منجم اور غیب دانی کا دعویٰ کرنے والے جھوٹے ہیں۔ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے کسی انسان میں یہ قدرت نہیں کہ وہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانک سکے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اس علم سے نوازا تھا لیکن محدود دائرے میں صرف ان امور تک جن کا تعلق انسان کی دینی، اخلاقی اور تہذیبی زندگی سے تھا۔

موت کے تصور سے پیدا ہونے والے اضطراب کے ذکر پر ایک تاریخی واقعہ یاد آ گیا ہے۔ عبدالملک بن مروان ایک مرتبہ مشہور تابعی ابوحازم سلمہ بن دینار کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے متعدد سوالات دریافت کیے۔ ابوحازم پوری بے باکی کے ساتھ اس کے سوالات کا جواب دیتے رہے۔ ان میں سے ایک سوال یہ تھا کہ "ہم موت سے کیوں ڈرتے ہیں؟" ابوحازم نے فرمایا "اس لیے کہ تمہاری دنیا آباد ہے اور آخرت ویران — آباد جگہ سے ویران میں منتقل ہونے پر تمہیں خوف آتا ہے۔"

برٹرینڈ رسل کی یہ پیشین گوئی غلط نکلی۔ اُن کا انتقال ۱۹۶۲ء میں نہیں ۱۹۷۰ء میں ہوا۔ اس طرح یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی کہ انسان غیب دان نہیں ہے۔ وہ نہیں جانتا کل کیا ہوگا اور اُس کی موت کب آئے گی۔ یہ وہ راز ہے جس کے بارے میں ٹپوے تو لگائے جا سکتے ہیں لیکن دو اور دو چار کی طرح کوئی بات نہیں کہی جا سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ منجم اور غیب دانی کا دعویٰ کرنے والے جھوٹے ہیں۔ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے اور کسی انسان میں یہ قدرت نہیں کہ وہ پردۂ غیب کے پیچھے جھانک سکے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اس علم سے نوازا تھا، لیکن محدود دائرے میں صرف ان اُمور تک جن کا تعلق دینی، اخلاقی اور تہذیبی زندگی کے اس نظام سے تھا جو اللہ نے انہیں دے کر انسانوں کی طرف بھیجا تھا اور جو ان کے اس مشن کے لیے از حد ضروری تھا۔

(مئی ۱۹۵۹ء)

آخرت کی منزلِ اوّل

ضلع سیالکوٹ میں معدے کی ایک پُراسرار وبا پھوٹ نکلی ہے۔ موت کا بازار گرم ہے اور شہروں اور دیہات میں بری طرح خوف و ہراس پھیل گیا ہے۔ وبا کا آغاز بالکل حقیر سا تھا، لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہ پھیلتی چلی گئی حتیٰ کہ ضلع گوجرانوالہ کے بعض دیہات بھی اس کی زد میں آ گئے۔ وبا کی ہلاکت آفرینی کا یہ عالم تھا کہ لوگ دہشت زدہ ہو کر اپنے عزیزوں کی لاشیں بے گور و کفن چھوڑ کر بھاگنے لگے۔ آخری سرکاری اطلاعات کے مطابق اس وبا کی روک تھام کے مؤثر انتظامات کر لیے گئے ہیں۔ متعلقہ حکّام نے اُمید ظاہر کی ہے کہ وبا پر جلد قابو پا لیا جائے گا، تاہم خوف و ہراس بدستور طاری ہے اور وبا زدہ علاقوں سے ابھی تک لوگ نکل نکل کر بھاگ رہے ہیں۔ یہ بیماری ہیضے سے ملتی جلتی ہے، مگر ہیضہ نہیں ہے۔ انسدادی ٹیکے لگائے جا رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود بہت سے لوگ اس بیماری کا شکار ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر اسے گیسٹرو انٹرویٹز قرار دیتے ہیں، مگر اس کا علاج بھی کارگر نہیں ہو رہا، چنانچہ اب انسدادی تدابیر پر زور دیا جا رہا ہے۔

اس دنیائے حادثات میں رونما ہونے والا ہر حادثہ اپنے دامن میں عبرت و موعظت کا سامان رکھتا ہے۔ خصوصاً وہ لوگ تو اس کے ہر واقعے سے درسِ عبرت لیتے ہیں جو آنکھیں رکھتے ہیں، جن کا ایمان ہے کہ دنیا کا کوئی واقعہ اذنِ الٰہی کے بغیر رونما نہیں ہوتا اور ہر حادثے کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی مشیّت اور مصلحت کارفرما ہوتی ہے۔

اس واقعے کا عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ آج جبکہ طبّی سائنس ترقی کی رفعتوں کو چھو رہی ہے، انسان امراض اور ان کے اسباب و عوامل پر پوری طرح حاوی ہو چکا ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی بیماری تک کے لیے تیر بہدف ادویہ تیار کر لی گئی ہیں، صحت اور تندرستی برقرار رکھنے کے لیے موثر ترین ذرائع اور وسائل ڈھونڈے جا چکے ہیں اور وباؤں اور امراض کے انسداد کی جدید ترین تدبیروں پر کامیابی سے عمل ہو رہا ہے اور انسان یہ سمجھنے لگا ہے کہ اس نے بیماریوں کو شکست دے دی ہے اور صحت و تندرستی کے اسرار سے آگاہ ہو گیا ہے، ان ساری باتوں کے باوجود ایسی پُراسرار وباؤں کا پھوٹ پڑنا کہ انسان کا علم و تجربہ ان کی حقیقت بے نقاب کرنے سے عاجز آ جائے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لشکر بے حد و بے حساب ہیں جن کے آگے انسان آج بھی اسی طرح بے بس و مجبور ہے جس طرح وہ صدیوں پہلے تھا۔

انسان سوچتا ہے اس نے بیماریوں اور وباؤں پر قابو پا لیا ہے، صحت و تندرستی کے اصول تلاش کر لیے ہیں جن پر عمل پیرا ہو کر وہ ایک لمبے عرصے تک زندہ رہ سکتا ہے، موت اس کے آگے مفتوح ہو چکی ہے۔ اب نوخیز غنچے بن کھلے مرجھانے نہیں پائیں گے اور اٹھتی جوانیاں اپنی بہار دکھائے بغیر خزاں میں نہیں بدلیں گی، نسلِ انسانی کا گلشن عمرِ طبیعی سے پہلے طوفانِ مرگ سے پامال نہ ہو گا ـــ اور یہی سوچ اسے نسلِ انسانی کے مستقبل کے متعلق غلط راہوں پر ڈال دیتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے جو انسان دنیا میں آ چکے ہیں وہ موت کی گرفت سے کم از کم اپنی طبعی مدتِ عمر تک محفوظ ہو گئے، لیکن آنے والے ہیں کہ ان کا تانا بندھا ہوا ہے۔ ادھر جو لوگ پہلے سے موجود ہیں ان کی بہت بڑی اکثریت کو کھانے پینے اور رہنے سہنے کا سامان پوری طرح میسّر نہیں، ملکوں اور قوموں کے وسائلِ رزق محدود ہیں، زمینیں تنگ ہیں اور اگر نوواردین کا سلسلہ پر روز اسی رفتار سے جاری رہا تو وہ وقت دور نہیں جب وسائلِ رزق جواب دے جائیں گے

اور زمین پر کھڑے ہونے کی جگہ نہیں رہے گی۔ چنانچہ اسے اس خیالی مشکل کا حل یہ سوجھتا ہے کہ آنے والوں کی تعداد پر پابندی لگا دی جائے۔ گلشن حیات میں صرف اتنے ہی غنچے کھلنے کی اجازت دی جائے کہ پہلے سے موجود پھولوں کی نشاط خیزیوں پہ کوئی اثر نہ پڑے۔ حالانکہ جس اللہ نے انسان کو زندگی بخشی ہے، اس کے قبضۂ قدرت میں اب بھی ایسے گوناگوں ہتھیار ہیں جن سے وہ انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی کی کانٹ چھانٹ کر سکتا ہے۔ اور جن کے آگے انسان اپنی ساری تہذیبی و سائنسی ترقیوں کے باوجود بے بس اور مجبورِ محض ہے۔ اس کے ترکش میں بیماریوں اور وباؤں کے ایسے تیر ہیں جو آن کی آن میں کتنوں کے کتنوں اور بستیوں کی بستیاں کا صفایا کر سکتے ہیں اور جن کا علاج معالجہ تو بعد کی بات ہے بڑے بڑے ماہرینِ امراض یہ تشخیص تک نہیں کر سکتے کہ کون سی بیماری ہے۔

وبائی امراض پھوٹتے ہیں اور انسان موت کی گرم بازاری دیکھتا ہے تو وہ خوف زدہ ہو کر بھاگ نکلتا ہے۔ یہی کچھ سیالکوٹ میں دیکھنے میں آیا۔ ہوسکے لوگ اس خوف و ہراس کی جو تاویل کرنا چاہیں کریں، ایک مسلمان کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر ایمان کے فقدان یا کمی کا نتیجہ ہے۔ اگر آدمی کے دل میں یہ یقین ہو کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے اور اگر وہ آن پہنچا ہے تو اُسے وہ خود یا کوئی اور کسی تدبیر اور طریقے سے ٹال نہیں سکتا۔ اور اگر وہ وقت ابھی نہیں آیا تو وباؤں کی ہلاکت آفرینی میں گھرے رہنے اور توپوں کی آگ کا سامنا کرنے کے باوجود اس کا بال تک بیکا نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے قرآن کریم جا بجا اپنے ماننے والوں کے دلوں میں یہ بات جاگزین کرتا ہے کہ انسان کا موت کے خوف سے بھاگنا بیکار ہے۔ اذنِ خداوندی کے بغیر کوئی شخص وقتِ مقررہ سے پہلے مر نہیں سکتا۔ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا (آل عمران: ۱۴۵) موت جب آئے گی تو ہر حالت میں اپنے وقت پر آئے گی تم تقدیرِ الٰہی کا سامنا کرنے سے چاہے کتنا ہی گریز

کر دو وہ آکر رہے گی۔ تم اپنے گھروں میں اگر اطمینان سے بیٹھ جاؤ گے تو موت کا وقت آتے ہی خود بخود مرنے کے مقام کی طرف نکل کھڑے ہو گے۔ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ (آل عمران ۱۵۴) کہہ دیجیئے اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی قسمت میں موت لکھ دی گئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل دوڑتے) اور اگر تم موت سے بچنے کے لیے مضبوط قلعوں میں گھس کر بیٹھ جاؤ گے تو موت وہاں بھی تمہیں آن لے گی۔ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ (النساء ۷۸) اسی حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے: جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کی موت کسی زمین میں مقدر کر دیتا ہے تو اس زمین کی طرف اس کی حاجت بھی پیدا کر دیتا ہے یعنی وہ وہاں کسی نہ کسی کام سے جانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور فرشتۂ اجل اسے آ لیتا ہے۔

انسان حسرتوں اور آرزوؤں کا پیکر ہے، وہ جب کسی عزیز کی موت کی خبر سنتا ہے تو کف افسوس ملتا ہے کہ کاش ایسا ہوتا تو وہ نہ مرتا۔ کوئی اچھا ڈاکٹر مل جاتا، وقت پر طبی امداد پہنچ جاتی تو بچ جاتا۔ گھر سے نہ نکلتا تو حادثہ پیش نہ آتا۔ جنگ پر نہ جاتا تو مارا نہ جاتا، لیکن یہ محض حسرتیں ہیں جو اس کی زبان پر مچلنے لگتی ہیں اور یہ کسی صاحب ایمان کا شیوہ نہیں ہو سکتیں۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوتا ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِى الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ (۱۵۶) اے ایمان والو! کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پہ جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں اور وہاں کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا

ہے۔ یہ جو فرمایا ہے کہ اس قسم کی باتیں کرنا کافروں کا شیوہ ہوتا ہے اور یہ اہلِ ایمان کو زیب نہیں دیتیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ موت اور زندگی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وَاللّٰہُ یُحْیٖ وَیُمِیۡتُ ۔ اب اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ مرنے والا عزیز اس کے پاس گھر میں ہوتا تو موت سے بچ جاتا، تو گویا وہ اپنے آپ کو اتنا قوی اور طاقت ور سمجھتا ہے کہ وہ ایک شخص کی آئی ہوئی موت کو ٹال سکتا ہے یا اللہ تعالیٰ کو اتنا بے بس کہ وہ اس کی موجودگی میں کسی شخص کو موت کی نیند نہیں سلا سکتا۔ حالاں کہ یہ دونوں باتیں امرِ واقع کے اعتبار سے غلط ہیں ہمارے عزیز و اقارب، دوست احباب آئے دن ہماری آنکھوں کے سامنے موت کا شکار ہوتے ہیں اور ہماری کوئی جدّوجہد، دوڑ دھوپ اور دُعا و التجا انہیں نہیں بچا پاتی، فرشتۂ اجل ٹھیک وقت پر آتا ہے اور انہیں چھین کر لے جاتا ہے اور ہم بے بسی کے آنسو بہانے اور آہ و زاری کے سوا کچھ کر نہیں پاتے۔ بارہا دیکھا گیا ہے کہ جنگ میں ایک شخص گولیوں کی بوچھاڑ میں زندہ و سلامت بچ کر نکل جاتا ہے حالانکہ اس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں موت کا بازار گرم ہوتا ہے۔ دوسری طرف ایک شخص بظاہر ہر قسم کے خطرے سے محفوظ و مامون بیٹھا ہوتا ہے، اچانک فرشتۂ اجل اس کا گلا آ دباتا ہے جس سامانِ حفاظت پر اس کو غرّہ ہوتا ہے وہی اس کی موت کا بہانہ بن جاتا ہے، مضبوط و مستحکم مکان کی چھت گر پڑتی ہے اور وہ اس کے نیچے دفن ہو کر رہ جاتا ہے، بظاہر محفوظ مکان کو آگ پکڑ لیتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ان جانوں کو جلا کر بھسم کر دیتی ہے جن کے بسنے بسنے اور حفاظت کرنے کے لیے وہ مکان بنایا گیا تھا۔

یہ سارے واقعات بتاتے ہیں کہ موت سے رستگاری ناممکن ہے۔ یہ وقت پر آ کر رہتی ہے اور کوئی اسے نہیں ٹال سکتا۔ نہ حسرتیں اور تمنّائیں نہ جدّوجہد اور تگ و دو۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام اہلِ ایمان کو موت سے لرزنے اور خوف کھانے کے بجائے اس کا جرأت وایمان کے ساتھ سامنا کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے ایک مسلمان کی زندگی کا منہاج ایسا ہونا چاہیئے کہ وہ موت سے کانپنے کے بجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائے اور وقت آگیا ہے تو خوشی خوشی اپنی جان جانِ آفرین کے حوالے کر دے۔

نشانِ مردِ مومن با تو گویم
چو مرگ آید تبسّم بر لب اوست

موت سے لرزنے کے دو ہی سبب ہوتے ہیں اوّل انسان کا شعوری یا لاشعوری طور پر یہ احساس کہ مرنے کے بعد اسے اپنے پیدا کرنے والے کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور دنیا میں اس نے جو کچھ کیا ہے اس کی جواب دہی کرنی ہے، وہاں حسنِ عمل کی پوچھ ہوگی اور اس کا دامن اس سے بالکل تہی ہے، اس نے اپنی ساری زندگی اپنی دنیا سنوارنے میں گزار دی اور آخرت کا کوئی سامان نہیں کیا۔ اُموی خلیفہ سلیمان بن عبدالملک نے ابو حازمؒ سے دریافت کیا تھا کہ ہمیں موت سے کیوں ڈر لگتا ہے تو انہوں نے جواب دیا تھا "اس لیے کہ تمہاری دنیا آباد ہے اور آخرت ویران، چنانچہ تمہیں آبادی سے ویرانے کی طرف جاتے ہوئے ڈر لگتا ہے"!

موت کے خوف کی دوسری وجہ دنیا کی زندگی اور اس کے ساز و سامان سے محبت ہے۔ اسلام ان دونوں اسباب کا قلع قمع کرتا ہے۔ وہ اہلِ ایمان کے دلوں میں یہ حقیقت جاگزین کرتا ہے کہ دنیا کی زندگی اپنی زینتوں اور نعمتوں کے ساتھ محض لہو و لعب، تفاخر، فریب اور متاعِ غرور ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ..... وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝

(الحدید: ۲۰) (جان لو دنیا کی زندگی کھیل اور دل بہلاوا ہے، زینت اور سنگھار ہے، آپس میں

میں مال اور اولاد کی کثرت پر فخر و مباہات کرنے کا نام ہے ..... اور دنیا کی زندگی ایک متاع فریب کے سوا کچھ نہیں ہے)۔

وہ کہتا ہے کہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور اس زندگی کے مقابلے میں دُنیا کی زندگی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس لیے ہماری ساری تگ و دو کا محور آخرت کی زندگی ہونی چاہیئے۔ وہ زندگی جس میں دنیا کی زندگی کے ایک ایک لمحے اور ثانیے کا حساب لیا جائے گا اور ہمیں دنیا کی زندگی قرآن و سُنّت کے مطابق اس طرح بسر کرنی چاہیئے کہ ہم آخرت کے اس حساب میں کامیاب ہو سکیں۔

دنیا میں ایسی زندگی صرف اسی وقت بسر کی جا سکتی ہے جبکہ ہمارے دل و دماغ میں یہ خیال ہر وقت تازہ رہے کہ ہمیں ایک دن مرنا ہے۔ اور مٹی میں مل کر مٹی نہیں ہو جانا بلکہ زندہ ہو کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہونا اور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہے۔ یہی یاد انسان کو راست باز زندگی کا خوگر بناتی، اسے عیش و نشاط میں ڈوبنے اور خدا فراموشی سے بچاتی، نیک اعمال پر اکساتی اور بدی، ظلم اور طغیان سے دامن کش رہنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اگر یہ تصوّر ذہن سے اُتر جائے کہ ہمیں ایک روز مرجانا ہے اور حُسنِ عمل سے ہمارا دامن تہی ہُوا تو موت کے بعد کی زندگی بڑی کٹھن اور تکلیف دہ ہو گی اور آخرت میں عذابِ الٰہی سے دوچار ہوں گے تو پھر کوئی دوسری شے ہمیں بے راہ ہونے اور لذّاتِ دنیا میں کھو کر خدا اور رسول کو بھلا دینے سے نہیں بچا سکتی۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم مسلمانوں کو اکثر تلقین فرمایا کرتے تھے کہ وہ اس لذّتوں کو بھلا دینے والی کو یاد کرتے رہیں۔ انہیں قبرستان میں جانے کی ترغیب دیتے کہ قبریں دیکھ کر دنیوی زندگی کا انجام آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ لوگوں کو انجامِ حیات سے بے فکر دیکھتے تو ان کے دلوں میں زندگی کی ناپائداری کا احساس اُبھارتے۔ ایک مرتبہ دیکھا کہ کچھ صحابہؓ بڑی بے فکری کی باتیں کرنے اور ہنسنے میں مصروف ہیں۔ فرمایا: اگر تم لذّتوں کو بھلا دینے والی کی یاد ذہن میں تازہ رکھتے تو ہنسی

مذاق میں ڈوبنے کے بجائے دنیا اور اس کا سروسامان ترک کرکے جنگلوں میں نکل جاتے (او کما قال)

ایک مرتبہ کسی اور ایسے ہی موقع پر فرمایا ؛ جو کچھ میں دیکھتا ہوں، اگر تم دیکھ لو تو گھر بار چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جاؤ (او کما قال) ایک بار ایک تمثیل کے پیرائے میں ارشاد فرمایا ؛ انسان لمبی چوڑی اُمیدیں باندھنے میں لگا ہوتا ہے اور موت اس کے پہلو میں کھڑی ہوتی ہے۔

ایک بار فرمایا ؛ قبر صبح و شام پکارا کرتی ہے ۔ اے آدم کے بیٹے ! میں تنہائی کا گھر ہوں، کوئی رفیق ساتھ لانے کا سامان پیدا کر۔ اے آدم کے بیٹے ! میں تاریکیوں کی جگہ ہوں کسی روشنی کا اہتمام کر۔ اے آدم کے بیٹے ! میں کیڑوں مکوڑوں، سانپوں اور بچھوؤں کا مکان ہوں ان سے بچنے کی کوئی تدبیر کر۔ (او کما قال)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اسی تلقین سے صحابۂ کرامؓ کو ہر وقت موت کا (خوف نہیں) خیال دامن گیر رہتا ؛ اور وہ اپنے اعمال کی بے مائیگی پر متفکر و مضطرب رہتے۔ حالانکہ وہ چمنِ انسانیت کے گل و لالہ تھے جن کے حسنِ عمل اور بوئے ایمان سے مشامِ جانِ دنیا معطر تھی۔ جو خدا سے راضی تھے اور خدا جن سے راضی تھا۔ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہیں دنیا ہی میں جنت کی بشارت مل گئی تھی۔ وہ صبح و شام حیات بعد الممات کا سامان فراہم کرنے کی فکر میں غلطاں رہتے۔ عبادت رب بھی کرتے تو اسی نقطۂ نظر سے، بال بچوں کے حقوق ادا کرتے تو اسی خیال سے، اپنے نفس کے حقوق پورے کرتے تو اسی مقصد کے پیشِ نظر، لوگوں سے معاملات کرتے تو اسی فکر کے ساتھ اور کاروبارِ حیات میں محو ہوتے تو اسی کی خاطر ۔ لیکن اس ساری تگ و دو اور اہتمام کے باوجود ان میں کے بہترین افراد کا یہ حال تھا کہ وہ تمنا کرتے : اے کاش ! ہم تنکے ہوتے جنہیں ہوا اڑا کر کہیں لے جاتی، گھاس ہوتے کہ بھیڑ بکریاں چر لیتیں اور آخرت کی جواب دہی نہ کرنی پڑتی۔ وہ کسی چڑیا

کو دیکھتے تو اس کی زندگی پر رشک کرتے کہ وہ آخرت کی باز پرس سے آزاد بڑی بے فکری کے دن کاٹ رہی ہے۔ وہ روزِ قیامت کے احتساب کا تصور کرتے تو اس طرح روتے کہ ہچکی بندھ جاتی۔ انہیں ان کے اعلیٰ مراتب و درجات یاد دلائے جاتے، ان کی اُن خدمات کا تذکرہ کیا جاتا جو وہ دینِ حق کی راہ میں انجام دے چکے تھے، ان سے کہا جاتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے راضی اور خوش تشریف لے گئے ہیں اور مسلمان بھی آپ سے راضی اور خوش ہیں، آپ تو اللہ کے ہاں اجرِ عظیم کے مستحق ہیں۔ وہ آہ و سرد بھر کر کہتے "اجرِ عظیم؟ اے کاش ہم برابر برابر ہی چھوٹ جائیں!"

موت ہی وہ سرحد ہے جو انسان کی دنیوی زندگی اور آخرت کے درمیان حائل ہے۔ اس سرحد کو عبور کرتے ہی وہ ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جس کے ڈانڈے آخرت سے جا ملتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا قیامت کب آئے گی؟ آپ نے فرمایا جب انسان مرجاتا ہے تو اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے۔ گویا موت، آخرت کی زندگی تک پہنچنے کا مرحلۂ اوّل ہے اور قبر منزلِ اوّل۔ اس مرحلے میں کامیابی باقی مراحل کی کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضؓ قبر کی تاریکیوں اور تنہائیوں کا تصور کر کے زار زار رویا کرتے۔ حضرت عثمان رضؓ کسی قبر کے پاس کھڑے ہوتے تو آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگتے۔ حتّٰی کہ ڈاڑھی تر ہو جاتی۔ کسی نے کہا آپ جنّت اور دوزخ کا ذکر کرتے ہیں، مگر آپ کی یہ حالت نہیں ہوتی، لیکن قبر پہ آتے ہیں تو بے تحاشا روتے ہیں۔ حضرت عثمان رضؓ نے جواب دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قبر آخرت کی منزلوں میں سے پہلی منزل ہے جس نے اس منزل سے نجات پائی اس کے بعد سارا سفر اس کے لیے آسان ہے اور جو اس منزل ہی سے نجات نہ پاسکا اس کے لیے بعد کی منزلیں بڑی ہی کٹھن اور مشکل ہوں گی۔

موت کو یاد کر کے تڑپنا تمام ائمہ تابعین، تبع تابعین اور خاصانِ خدا کی زندگی کا خاص پہلو تھا۔ ابراہیمؒ بن یزید نخعی جو حافظِ حدیث اور صاحب ورع و تقویٰ بزرگ تھے۔ جب وہ مرض الموت میں مبتلا ہوئے تو آخری لمحات میں سخت اضطراب اور بے قراری نے آ لیا۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا اس سے زیادہ خطرے کا وقت اور کونسا ہو گا کہ خدا کا قاصد جنت یا دوزخ کا پیغام لے کر آئے گا۔ میں اس پیغام کے مقابلے میں یہ زیادہ پسند کرتا ہوں کہ موجودہ صورت قیامت تک قائم رہے۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیزؒ رات کے وقت علماء کی مجلس منعقد کرتے۔ اس مجلس میں موت اور قیامت کا ذکر کر کے اس طرح روتے جیسے ان کے سامنے جنازہ رکھا ہو۔ بسا اوقات موت پر غور و فکر کرنے ہی میں رات کٹ جاتی تھی۔ قبر کی ہولناکیوں کا تصور کرتے تو بے ہوش ہو جاتے۔ ایک مرتبہ اپنے ایک ہم نشین سے فرمایا "میں رات بھر غور و فکر میں جاگتا رہا"۔ اُس نے پوچھا "امیر المومنین کس چیز کے متعلق غور و فکر؟ فرمایا قبر اور اہلِ قبر کے متعلق، اگر تم مُردے کو تین دن کے بعد قبر میں دیکھو تو انس و محبت کے باوجود اس کے پاس جاتے ہوئے ڈرو گے۔ تمہیں ایسا گھر نظر آئے گا جس میں خوش وضعی، خوش لباسی اور خوشبو کے بعد کیڑے رینگتے ہوں گے، پیپ بہتی ہو گی، بدبو کے بھبکے اٹھتے ہوں گے کفن بوسیدہ ہو چکا ہو گا . . . ." یہ کہہ کر ایک چیخ ماری اور ہچکی بندھ گئی اور بیہوش ہو گئے۔

حسن بصریؒ پر موت اور قیامت کا خیال جس طرح غالب تھا اس کا اندازہ یونس بن عبید کے اس قول سے کیا جا سکتا ہے، کہتے ہیں؛

"وہ جب تشریف لاتے تو ایسا نظر آتا کہ اپنے کسی عزیز دوست کو دفن کر کے آ رہے ہیں اور جب بیٹھتے تو اس قدر اُداس ہوتے گویا وہ ایک قیدی ہیں جس کے قتل کا حکم دیا جا چکا ہے ___ اور جب ان کے سامنے دوزخ کا ذکر ہوتا تو ان پر ایسی دہشت طاری ہو جاتی جیسے دوزخ صرف انہی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔"

عبداللہؒ بن وہب ایک بلند پایہ مُحدّث، فقیہہ اور عالم باعمل تھے۔ آپ کی وفات قیامت کی ہولناکیوں کے بیان سے ہوئی۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان کے سامنے خود ان کی اپنی تصنیف کتاب "احوال یوم القیامۃ" کا ایک حصّہ پڑھ کر سُنایا۔ آپ اس سے اتنا متاثر ہوئے کہ برداشت نہ کر سکے، بیہوش ہو کر گر پڑے، بات چیت بالکل بند ہو گئی، حتّٰی کہ اسی حالت میں چند روز کے بعد انتقال ہو گیا۔ کہتے ہیں دل شق ہو گیا تھا۔

موت کے بارے میں ائمہ اسلام اور بزرگانِ دین کے چند مزید ارشادات ملاحظہ فرمائیے:

ثابتؒ بن اسلم بنانی کہتے ہیں، جو شخص موت کو زیادہ یاد کرتا ہے اس کے اعمال پر اس کا نمایاں اثر ہوتا ہے۔

سلمہؒ بن دینار کا ارشاد ہے: وہ تمام اعمال جن کی وجہ سے موت کا آنا گراں گزرتا ہے۔ انہیں چھوڑ دو، پھر جس وقت بھی موت آئے، تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

سفیانؒ بن عینیہ فرماتے ہیں: زہد دراصل صبر اور موت کے انتظار کا نام ہے۔

(۱۲ اگست ۱۹۶۰ء)

تنبیہ الغافلین

یکم مارچ کو مراکش کی تفریحی بندرگاہ اگادیر میں جو قیامتِ صغریٰ برپا ہوئی اور زلزلے سے جو تباہی آئی ہے وہ لرزہ خیز ہی نہیں، زلزلوں کی تاریخ میں عدیم النظیر بھی ہے۔ قرآن کریم میں نافرمان اور سرکش قوموں کی بستیوں کی زلزلوں سے تباہی کی داستانیں بیان کی گئی ہیں، کسی شہر پر ایسی مکمل بربادی غالباً ان تاریخی بربادیوں کے بعد کبھی نازل نہ ہوئی تھی۔ اب تک کی خبروں کے مطابق دس ہزار سے زائد انسان موت کے گھاٹ اتر گئے ہیں اور جو باقی بچ گئے ہیں خوف و دہشت کے مارے ان کی حالت مُردوں سے بدتر ہے۔ شہر کی نوّے فی صد عمارتیں کھنڈر بن گئی ہیں یا رہائش کے ناقابل ہو چکی ہیں۔

زلزلہ رات کے وقت آیا۔ ایک عینی گواہ کی روایت کے مطابق لوگ اپنے گھروں اور قیام گاہوں میں سو چکے تھے یا سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ شہر کے پانچ سینماؤں میں شو تھوڑی دیر پہلے ختم ہوئے تھے اور تماشائی اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ناگاہ دھرتی کے پیٹ میں سے ایک دہشت ناک گونج بلند ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی درندہ زمین کی پنہائیوں میں بند ہے اور باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا ہے۔ ابھی یہ آواز فضا میں تحلیل نہ ہوئی تھی کہ دھرتی کانپنے لگی۔ ایک اور چشم دید راوی کہتا ہے "ذرا تصوّر کیجیے میں آپ کو دونوں کندھوں سے

پکڑ کر پوری قوت سے جھنجھوڑتا ہوں اور پھر اچانک ایک شدید جھٹکے کے ساتھ ہوا میں اچھال کر ایک طرف پھینک دیتا ہوں۔ زلزلے کی ٹھیک یہی کیفیت تھی" — اس کے جھٹکوں نے پہلے اجادر کو جھنجھوڑا اور پھر ایک دم گویا اسے ہوا میں اچھال کر پھینک دیا۔ وہ شہر جو چند لمحے پیشتر عیش و عشرت کا گہوارہ تھا، جہاں سیاحت اور عشرت کے متوالے دور دراز سے سیر و تفریح کے لیے آتے تھے، جس کی فضا میں کچھ دیر پہلے نغماتِ نشاط بکھرے ہوتے تھے اور جس کے باسی آنے والی قیامت سے بے خبر ہوس بھری زندگی کے نشے میں سرشار اس کی حسین و دراز تمناؤں میں گم تھے، آن کی آن میں کھنڈر بن گیا۔ ہزاروں انسان حقیقتِ حال سے آگاہ ہونے سے پہلے آناً فاناً فنا کے گھاٹ اتر گئے، ہزاروں باخبر ہوتے ہوتے موت کی آغوش میں پہنچ گئے، زخمیوں اور دہشت زدہ لوگوں کی چیخوں سے ایک حشر برپا تھا۔ رات کی تاریکی نے منظر کو اور بھیانک بنا دیا تھا — اور جب جھٹکے رکے تو اجادر کا حسین و جمیل شہر عاد و ثمود کے خرابوں کی یاد تازہ کر رہا تھا۔

اجادر کی اس تباہی کو بے شمار لوگوں نے بس ایک المناک اور رنجیدہ حادثہ قرار دیا ہو گا۔ لاتعداد ایسے ہوں گے جن پر شاید رنج و غم کی یہ کیفیت بھی طاری نہ ہوئی ہو، ان گنت اصحاب اس کی مادّی توجیہات میں مصروف ہو گئے اور بہت کم ایسے ہوں گے جنھوں نے اسے قدرت کی طرف سے تازیانۂ عبرت سمجھا ہو گا۔ واقعہ یہ ہے کہ آج جبکہ مادّہ پرستی قلوب و اذہان پر غلبہ پا چکی ہے، اس نوعیت کا بڑے سے بڑا حادثہ محض ایک حادثہ بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ لوگ بہت تھوڑے ہوتے ہیں جو ایسے واقعات سے عبرت کا سبق لیتے ہیں، حالانکہ قدرت کی جانب سے یہ رونما ہی اس لیے ہوتے ہیں کہ غفلت میں سرشار انسان متنبہ ہو، اپنی زندگی کا رنگ ڈھنگ بدلے، اللہ کے مقابلے میں سرکشی

اور تمرّد سے باز آئے اور اس کی زمین پر اس کا عاجز و مسکین بندہ بن کر رہے۔

*

اجادر کی اس قیامتِ صغریٰ اور اسی نوع کے دوسرے حادثات میں انسان، خصوصاً آج کے انسان کے لیے عبرت کا سبق یہ ہے کہ وہ اپنی ساری تہذیبی و تمدّنی ترقیوں، اپنی ساری مادّی و سائنسی قوتوں اور اپنے سارے علم و فضیلت کے باوجود اللہ تعالیٰ کی اس عظیم کائنات میں ایک عاجز و ناتواں مخلوق ہے۔ اگرچہ وہ اپنی فطری صلاحیتوں اور قوتوں کے بل پر پانی اور ہوا کو مسخر کر چکا ہے، ایک طرف دھرتی کی پاتال میں اس کے قدم پہنچ چکے ہیں، دوسری طرف وہ چاند اور خلائے بسیط میں پھیلے ہوئے دوسرے سیاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے، اللہ تعالیٰ کی وسیع و عریض کائنات میں پوشیدہ بڑی بڑی طاقتوں کو اس نے اپنا غلام بنا لیا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ آج بھی اتنا ہی بے بس، عاجز اور کمزور ہے جتنا ہزاروں برس پہلے تھا۔ اللہ تعالیٰ کی قوتوں کے مقابلے میں وہ آج بھی پرِکاہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ زمین کی ایک ہلکی سی جنبش اور کروٹ اس کی عالی شان بستیوں کو تہ و بالا کر کے کھنڈروں میں تبدیل کر سکتی ہے۔ اس کی علمی و تہذیبی ترقیاں اس کے کام آتی ہیں نہ مادّی سربلندیاں اور قوتیں۔ جس ہوا کے دوش پر سوار وہ مشرق و مغرب کی وسعتیں ناپتا پھرتا ہے، اس کی ذرا سی غیر معمولی تندی و تیزی اس کی بستیوں کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتی ہے۔ سمندر جس کی سطح پر اور گہرائیوں میں وہ اس طرح چلتا پھرتا نظر آتا ہے گویا اپنے گھر کے صحن میں سرگشت کر رہا ہے اس سے اٹھنے والی ایک ہی تند و فلک بوس موج اس کے ناقابلِ تسخیر سفینوں کو غرقاب کر سکتی ہے اور ساحلِ بحر پر پھیلی ہوئی عظیم آبادیوں کا آن کی آن میں صفایا کر سکتی ہے۔ وہی دریا اور ندیاں جن کے آگے بڑے بڑے بند باندھ کر ان سے نہریں نکالتا اور بجلی پیدا کرتا ہے جب بپھر

ہیں تو اپنی رُو میں علاقے کے علاقے بہا لے جاتے ہیں اور انسان اپنے سارے مادی سروسامان اور علمی و تہذیبی کمالات کے ساتھ اس کے آگے ایک بے بس تنکا ثابت ہوتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں جس کے زمین، پانی اور ہوا ادنیٰ سے خادم ہیں، انسان کی اس سرکشی اور تمرد کی کیا حقیقت ہے جس کا مظاہرہ وہ اپنی زندگی میں شب و روز کرتا رہتا ہے۔ یہ اللہ کی کرم نوازی اور رحمت گستری ہے کہ وہ اس سرکشی اور تمرد کے باوجود اسے زندگی کی نعمتوں سے نوازتا رہتا ہے اور ڈھیل پر ڈھیل دیے چلا جاتا ہے۔ ورنہ اس کی پکڑ اتنی شدید ہے کہ اگر وہ چاہے تو آن کی آن میں صفحۂ ہستی سے اس کے وجود کو نیست و نابود کر سکتا ہے۔

ایسے واقعات میں عبرت کا دوسرا سبق یہ پوشیدہ ہے کہ جس زندگی کے نشے میں انسان اس طرح سرشار ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کو بھی بھول جاتا ہے اور دھرتی کے سینے پر یوں محفلِ نشاط جماتا ہے گویا وہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں اور اسے یہاں ابدالآباد تک زندہ رہنا ہے، وہ محض ایک نقشِ ناپائیدار ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ زندگی کی جس دولت پر وہ اس وقت نازاں ہے اور اللہ سے بے نیاز ہو کر اس کی زمین پر اینڈتا پھرتا ہے، عیش و مسرت کے نغمے الاپتا ہے اور عشرت و انبساط کے جھولے جھولتا ہے، اگلے لمحے تک یہ دولت اس کے پاس رہے گی بھی یا نہیں۔ موت زندگی کی گھات میں لگی ہوئی ہے اور کچھ خبر نہیں وہ کس وقت اسے اپنا شکار بنا لے اور اس انداز میں شکار بنا لے کہ آنے والی نسلوں کے لیے وہ عبرت کا نشان بن کر رہ جائے۔

اجادر کے باشندوں پر جب یکم مارچ کا سورج غروب ہوا ہو گا تو ان کے لیے

شاید اس میں کوئی عجیب بات نہ ہوگی۔ وہ اس سورج کو روز ہی طلوع و غروب ہوتے دیکھتے تھے۔ ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ جو سورج آج غروب ہو رہا ہے وہ اس ہنستے مسکراتے، قہقہے لگاتے، رنگ رلیاں مچاتے شہر میں پھر کبھی طلوع نہ ہوگا اور طلوع ہوگا بھی تو ان میں سے بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جو اس کے سنہری طشت کو مشرقی افق سے بلند ہوتے ہوئے دیکھیں گے، وہ بھی اس عالم میں کہ شہر پر موت سایہ فگن ہوگی، اس کی عظیم و عالی شان عمارتیں زمین بوس ہو چکی ہوں گی اور شہر کی آبادی ان کھنڈرات تلے دب گئی ہوگی اور انہیں اس عالم میں دیکھنے والی آنکھیں آنسو بہا رہی ہوں گی۔

زلزلے آتے ہیں اور بستیوں کی بستیاں تہ و بالا ہو جاتی ہیں، آندھیاں اور طوفان امڈتے ہیں اور ہر طرف تباہی مچ جاتی ہے، دریاؤں میں سیلاب آتے ہیں تو علاقوں کے علاقے اس طرح صاف ہو جاتے ہیں کہ کَاَنْ لَّمْ یَغْنَوْا فِیْهَا یہاں کبھی کوئی آبادی نہ تھا۔ مادّہ پرست ان حادثات اور ان کی تباہ کاریوں کی تاویلات اور توجیہات کرنے لگتے ہیں، لیکن وہ جو اللہ تعالیٰ پر اور اس کے قانونِ جزا و سزا پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے نزدیک یہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کی مختلف صورتیں ہیں۔ یہ ایک طرف ان لوگوں کو سزا دینے کے لیے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے بغاوت و سرکشی کی انتہا پر پہنچ کر اور گناہوں میں ڈوب کر خدا کی زمین پر زندہ رہنے کا حق کھو بیٹھتے ہیں اور دوسری طرف غافل و سرکش بندوں کو جھنجھوڑتے اور جگاتے ہیں کہ غفلت و سرکشی اور ظلم اور گناہوں کی زندگی سے باز آجاؤ ورنہ کسی آن تمہارا بھی یہی حشر ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان ان حادثاتِ ارضی و سماوی کی چاہے جو تاویلات بھی کرے اور کیسے ہی فلسفے تراشے، یہ ظالموں کے حق میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ بن

کر نمودار ہوا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ بڑی ہی سخت ہوتی ہے۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيدٌ ۝ لیکن یہ پکڑ اندھی پکڑ نہیں ہوتی بلکہ ایک عادل و منصف آقا کی پکڑ ہوتی ہے۔ عین عدل و انصاف کا تقاضا۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا اپنا ایک قانون اور سنّت ہے اور اسی قانون اور سنّت ہی کے مطابق وہ عمل کرتا ہے۔ قرآن کریم نے اس سنتِ الٰہی کا ذکر جگہ جگہ کیا ہے۔ سورہ الانعام میں عذابِ الٰہی کے نزول کا قانون ان الفاظ میں بیان ہوا ہے :

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ۝ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ۝ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ (۴۲-۴۵)

تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور ان قوموں کو مصائب و آلام میں مبتلا کیا تاکہ وہ عاجزی کے ساتھ ہمارے سامنے جھک جائیں۔ پس ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انہوں نے عاجزی اختیار کی ؟ مگر ان کے دل تو اور سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کو اطمینان دلایا کہ جو کچھ تم کر رہے ہو خوب کر رہے ہو۔ پھر جب انہوں نے اس نصیحت کو جو انہیں کی گئی تھی بھلا دیا تو ہم نے ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے ان کے لیے کھول دیئے یہاں تک کہ جب وہ ان بخششوں میں جو انہیں عطا کی گئی تھیں خوب مگن ہو گئے تو اچانک ہم نے انہیں پکڑ لیا اور اب یہ حال تھا کہ وہ ہر خیر سے مایوس تھے۔ اس طرح ان لوگوں کی جڑ کاٹ کر رکھ دی گئی جنہوں نے ظلم کیا تھا۔

یعنی اللہ کے رسولوں اور ان کی تعلیمات کو نہ اپنانے یا اپنانے کا دعویٰ کر کے

ان پر عمل کرنے پر پہلے تو اللہ تعالیٰ قوموں کو گوناگوں مصائب و آلام میں مبتلا کرتا ہے، یہ مصائب گویا انتباہ ہوتے ہیں اس بات کا کہ اس غلط روش کو ترک کر دو، یہ تمہیں تباہی کے منہ میں لے جاتے گی۔ اللہ تعالیٰ کے آگے جھک جاؤ اور اس کے فرمانبردار بندے بن کر رہو، لیکن قومیں ان انتباہات کو نظر انداز کر کے طغیان و تمرد کی راہ پر رواں دواں رہتی ہیں، ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ کسی مصیبت سے ان کے دل نہیں لرزتے، کوئی ابتلا انہیں اپنے کرتوتوں کا جائزہ لینے پر نہیں اکساتا، وہ سرکشی کی راہ میں بڑھتے چلی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی انہیں ڈھیل دیتا اور مادی خوش حالی سے نوازتا چلا جاتا ہے جس میں ڈوب کر وہ قومیں اللہ کو بالکل فراموش کر دیتی ہیں، اور اخلاقی اور دینی زندگی کے ایک ایک بند کو توڑ ڈالتی ہیں اور جب ان کے دامن میں بھلائی کا ایک ذرہ بھی نہیں رہتا تو اللہ تعالیٰ ان پر اپنے عذاب کا کوڑا اچانک برسا دیتا ہے اور ان کے وجود کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا ہے۔

قرآنِ کریم لوگوں کو بار بار دعوت دیتا ہے کہ زمین میں چل پھر کر دیکھو تم سے پہلے جو قومیں اپنے رب اور اس کے نازل کردہ دین (نظامِ حیات) کو جھٹلاتی رہی ہیں ان کا کیا انجام ہوا ہے۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (آل عمران)

فَأَمْلَيْتُ لِلْكَافِرِينَ ثُمَّ أَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيرِ ۝ فَكَأَيِّنْ مِنْ قَرْيَةٍ أَهْلَكْنَاهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا وَبِئْرٍ مُعَطَّلَةٍ وَقَصْرٍ مَشِيدٍ ۝ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا (الحج ۴۴-۴۶)

منکرینِ حق کو میں نے پہلے مہلت دی پھر پکڑ لیا۔ اب دیکھ لو کہ میری عقوبت کیسی تھی

کتنی ہی خطاکار بستیاں ہیں جن کو ہم نے تباہ کیا ہے اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں۔ کتنے ہی کنوئیں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں ہیں کہ ان کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے

دعوتِ حق قبول کرنے سے صاف انکار اور صریح کفر ہی کسی قوم کو عذابِ الٰہی کا مستحق نہیں بناتا بلکہ وہ قوم بھی اپنے آپ کو عذابِ خداوندی کا ہدف بنا لیتی ہے جو اللہ اور اس کی کتاب کے کچھ حصے پر تو ایمان رکھتی ہے اور کچھ حصے سے انکار کرتی ہے۔ یہودی قوم اسی کردار کی حامل تھی۔ چنانچہ اس کے لیے دنیا اور آخرت میں عذاب مقدر کر دیا گیا۔ بدبختی سے ہم مسلمان بھی اسی مرض میں مبتلا ہیں اور دنیا میں ہر جگہ ذلت و رسوائی کے عذاب سے دوچار ہیں اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں جھنجھوڑنے کے لیے زلزلے اور سیلاب ہم پر امڈ آتے ہیں اور بستیوں کی بستیاں تباہ کر کے رکھ دیتے ہیں لیکن ہم خدا سے اس قدر دور ہو چکے ہیں کہ آفات و حادثات بھی ہمیں حقیقتِ حال سوچنے سمجھنے پر آمادہ نہیں کر پاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عذاب کی ان مختلف صورتوں سے بچنے کے لیے ہمیں اس دعا کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے: اَللّٰھُمَّ لَا تَقْتُلْنَا بِغَضَبِكَ وَ لَا تُهْلِكْنَا بِعَذَابِكَ وَ عَافِنَا قَبْلَ ذَالِكَ -

اے اللہ! ہمیں اپنی تیغِ غضب کا شکار نہ بنا اور اپنے عذاب سے ہلاکت کے گھاٹ نہ اُتار۔ اور اس عذاب سے پہلے ہمیں معاف کر دے۔

حضورؐ جب کبھی آسمان پر کالی گھٹا اُٹھتے دیکھتے، فکر مند اور لرزہ براندام ہو جاتے کہ ماضی میں خدا کے نبیوں کو جھٹلانے والی بعض قوموں پر عذاب ابتدا میں سیاہ گھٹا ہی کی صورت میں نمودار ہوا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر یہ دعا بھی فرمایا کرتے:

اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِيْ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِيْ وَعَنْ يَمِيْنِيْ وَعَنْ شِمَالِيْ وَمِنْ فَوْقِيْ وَاَعُوْذُ بِعَظَمَتِكَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِيْ ۔

اے اللہ! میرے آگے پیچھے، دائیں بائیں اور اوپر سے میری حفاظت فرما میں تیری عظمت و کبریائی کا واسطہ دے کر اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں اپنے نیچے سے ہلاک کر ڈالا جاؤں (ابوداؤد)

(۱۸ مارچ سنہ ۱۹۶۰ء)

فلسفۂ ارتقا

لوگ کہتے ہیں زمانہ ارتقا کے انتہائی منازل طے کرنے لگا ہے۔ انسانی تہذیب
تمدن کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے۔ آج کا انسانی معاشرہ فکری و عملی اور معاشرتی و سیاسی
اعتبار سے اس معاشرے سے بالکل مختلف ہے جو صدیوں یا ہزاروں سال پہلے تھا۔
آج سائنس اور ایجادات کا دور ہے اور گویہ دور ہمیشہ رہا ہے اور سائنس ان ادوار
سے گزر کر موجودہ مرحلے میں داخل ہوتی ہے، مگر آج یہ ترقی و معراج کے جن آسمانوں کو
چھو رہا ہے۔ ادوار ماضیہ میں ان کا تصور بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ بلاشبہ کہنے والے سچ
کہتے ہیں کہ تمدنی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو انسان کی زندگی میں کتنا عظیم انقلاب آگیا
ہے۔ معاشرتی اعتبار سے ملاحظہ فرمائیے تو آپ دیکھیں گے کہ انسانی معاشرہ
کتنے بڑے تغیر سے دوچار ہو چکا ہے۔ علم و فکر کی سینکڑوں راہیں کھل چکی ہیں انسانی
زندگی کو ایک ایک زاویے سے جانچیے، اس میں زمین و آسمان کی تبدیلی نظر آئے گی۔
زمان و مکان کے فاصلے سمٹ گئے ہیں۔ علاقائی حدود ختم ہو کر پورا کرۂ ارض ایک
ملک بن چکا ہے؛ اس کے مختلف ملک شہر اور شہر محلوں کی صورت اختیار کر گئے ہیں
رسل و رسائل کے وہ ذرائع ایجاد ہو گئے ہیں کہ انسان صبح کے وقت دنیا کے ایک
کنارے پر ہوتا ہے اور سورج ڈوبنے نہیں پاتا کہ وہ دوسرے کنارے پر نظر آتا ہے۔
ہزاروں میل کے فاصلے بیچ میں حائل ہیں، مگر ایک دوسرے سے بات چیت کر سکتا او

ایک دوسرے کو زندگی کی گہما گہمی میں حصہ لیتے ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ اب وہ دور نہیں رہا جب شاعر نے کہا تھا،

اے غائب از نظر شدی ہم نشین دل
می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

اب تو ہم نشین دل کو کالے کوسوں کی مسافت کے باوجود دو بدو دیکھا جا سکتا ہے

سائنسی ایجادات نے انسان کی روزمرہ زندگی کو "مشینی" زندگی بنا دیا ہے۔ آب و برق و باد کے دیوتا بس میں کر کے انسان وہ کارنامے انجام دے رہا ہے کہ عقل دنگ ہو جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ لوہے اور لکڑی کی مدد سے لکڑی کے ہل کے ذریعے زمین کاشت کرتا اور درانتی سے فصل کاٹتا تھا۔ آج بڑے بڑے ٹریکٹر یہ کام کر رہے ہیں اور زمین جوتنے سے لے کر غلہ اٹھا کر منڈیوں میں پہنچانے تک ہر کام مشینوں سے ہو رہا ہے۔ لق و دق صحرا سبزہ زاروں اور شاداب میدانوں میں تبدیل ہو رہے ہیں۔ ریگ زار سونا اگل رہے ہیں۔ زراعت کی دنیا سے ہٹ کر صنعت کی دنیا میں آیئے تو عظیم الشان کارخانے اپنی دیو ہیکل مشینوں کے ساتھ رواں دواں ہیں اور انسان کی ان گنت تمدنی ضروریات پل کی پل میں پورا کر رہے ہیں۔

اقتصاد و معیشت کی دنیا میں آیئے تو عالی شان بنک اور اقتصادی ادارے قائم ہیں جن کے بل پر حکومتوں اور قوموں کا کاروبار چل رہا ہے۔ جہان علم و دانش پر نگاہ ڈالیئے تو عظیم الشان یونیورسٹیاں، کالج اور درس گاہیں قائم ہیں جہاں ذرے سے لے کر خلا میں پھیلے ہوئے ستاروں تک ریسرچ ہو رہی ہے۔ کل کے انسان کی علمی و فکری حدود کی جو انتہا تھی آج کا انسان اسے جہالت قرار دیتا اور اس کا تمسخر اڑاتا ہے۔ یہاں سے آگے بڑھ کر حرب و ضرب کے میدان میں قدم رکھیئے تو ایک ہولناک منظر سامنے

آتا ہے۔ انسان نے انسان کی تباہی کے ایسے خوفناک ہتھیار ایجاد کر لیے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک آن کی آن میں ایک قیامت برپا کر کے لاکھوں کو موت کی نیند سلا سکتا ہے اور شکار زدہ رقبے کی آبادی پر نسلوں تک کے لیے المناک نقوش چھوڑ سکتا ہے۔

اور یہ تو ہم زمین کی باتیں کر رہے ہیں۔ اب تو سائنسی ارتقا کے سہارے انسان آسمان میں تھگلی لگانے چلا ہے اور گو کہنے والے کہتے ہیں:

تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی

مگر زمین پر اس نے کوئی تیر مارا ہے یا نہیں، وہ خلا کی پہنائیوں کو چیر کر مریخ اور قمر کو اپنی جولان گاہ بنانے پر ضرور تلا ہوا ہے اور غالباً وہ دن انسان کی مادّی ترقی کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا جب انسان ستاروں پر کمند ڈالنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

لیکن بایں ہمہ ترقی و معراج سوچیے کیا انسان کی فطرت تبدیل ہو گئی ہے یا اس نے بھی ارتقا کی کوئی منزل طے کر لی ہے؟ کیا آج کے ترقی یافتہ دور کا انسان جذبات و احساسات، اہوا، خواہشات اور فطری میلانات کے اعتبار سے "غیر ترقی یافتہ" دور کے انسان سے کچھ بھی مختلف ہے؟ صدیوں پہلے کا انسان جس طرح زندہ رہنے کے لیے ہوا، پانی اور غذا کا محتاج تھا، کیا وہ آج محتاج نہیں رہا؟ پہلے اس کے اندر جو جنسی تقاضے پائے جاتے تھے، کیا آج وہ تقاضے کوئی نئی صورت اختیار کر گئے ہیں؟ صدیوں پہلے جس طرح اس کی فطرت میں خودداری، شرم و حیا اور غیرت گندھی ہوئی تھی کیا آج وہ ان سے محروم ہو گیا ہے؟ سینکڑوں سال پہلے وہ جس طرح اپنے سے برتر و بالادست قوتوں سے خوف کھاتا تھا اور ان کی غلامی اور عبدیت کا قلادہ

اپنی گردن میں ڈالے رکھتا تھا کیا بایں ہمہ روشن خیالی و حریت پسندی وہ آج اس خوف سے آزاد ہو چکا ہے اور بالاتر قوتوں کی زنجیر غلامی میں گرفتار نہیں رہا؟ صدہا سال پہلے کا انسان جس طرح محفوظ و مامون زندگی بسر کرنے کا متمنّی تھا۔ کیا آج کا انسان اس تمنّا سے خالی ہے؟ صدیوں پہلے وہ جس طرح ایک دوسرے کے تعاون کا محتاج تھا کیا آج اسے اس کی احتیاج نہیں رہی؟ سینکڑوں برس پہلے وہ معاشرے میں جن حقوق کے تحفظ کا خواہش مند تھا کیا فی الواقع آج اس کے دل سے یہ خواہش نکل گئی ہے؟ صدیوں پہلے وہ اپنے قرابت داروں، دوستوں اور دشمنوں کے بارے میں جس نوعیت کے جذبات رکھتا تھا کیا فی الحقیقت ان جذبات سے اس کا قلب تہی دامن ہو چکا ہے؟ صدیوں پہلے وہ جو احساسات رکھتا تھا۔ کیا آج اس کے وہ احساسات دم توڑ چکے ہیں؟ زندگی کے متعلق اس کے سوچ بچار کے زاویوں میں وسعت ضرور ہوئی ہے مگر کیا وہ واقعۃً سوچ بچار کی قوت سے محروم ہو گیا ہے؟ انسان کو زندگی کے ایک ایک قدم پر صدیوں پہلے جن فطری حقائق و مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیا آج وہ حقائق و مسائل نہیں رہے؟

اس نہج پر صدیوں پہلے کے انسان اور آج کے انسان کا جائزہ لیجیے، آپ تسلیم کریں گے کہ فی الواقع انسان کی فطرت میں بنیادی طور پر کوئی انقلاب اور تغیر نہیں آیا۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے آج بھی صدیوں پہلے کا انسان ہے!

اس کے فطری میلانات و رجحانات، فطری احساسات و جذبات اور زندگی کے فطری مقتضیات اور اقدارِ حیات آج بھی وہی ہیں جو صدیوں پہلے تھے اور ان میں یک سرِ مُو فرق نہیں آیا۔ بے شک کچھ افراد اور گروہ مادی و تمدنی ارتقا کے ساتھ ساتھ خود بھی "ارتقا" کرنے کی دھن میں اپنی فطرت کو مسخ کر رہے ہیں، لیکن یہاں وہ زیر بحث نہیں ہیں، تذکرہ بہ حیثیتِ مجموعی پوری نوع انسان کا ہو رہا ہے۔ کچھ افراد یا ان کا کوئی گروہ اگر شرم و حیا کو خیرباد کہہ دے اور غیرت و شرافت کی آنکھیں بند کر کے

بندروں اور سوروں کی سطح پر اُتر آتے اور بے حیائی اور بے غیرتی کا مظاہرہ کرنے لگے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ اب انسان کی فطرت ہی بدل گئی ہے اور شرم حیا اور غیرت و شرافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ چند افراد اور ان کے گروہوں کے کردار و اعمال پر پوری انسانیت کا قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ نے انسان کی فطرت کو جس ڈھب پر پیدا کیا ہے اور اسے جو رنگ و آب بخشا ہے، اجتماعی حیثیت سے اس میں نہ کوئی تبدیلی آسکتی ہے اور نہ اسے مسخ ہی کیا جا سکتا ہے۔ زمانہ چاہے کتنی ہی کروٹیں لے، تاریخ کی تقویم ہزاروں ہزار ورق الٹے۔ انسان کی فطرت کا جو سانچا روزِ آفرینش سے بنا دیا گیا ہے وہ جوں کا توں برقرار رہے گا۔ اس لیے کہ اللہ نے انسان کو اپنی فطرت پر پیدا کیا۔ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا اور یہ فطرت اٹل اور ناقابلِ تغیر ہے۔ لَا تَبْدِیْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ط

پھر جو لوگ کہتے ہیں کہ آج زمانہ خلائی دور میں داخل ہو گیا ہے اس لیے دینِ اسلام کے جو اصول آج سے تقریباً چودہ سو برس پہلے انسان کو دیے گئے تھے وہ دورِ جدید کے انسان کے لیے از کار رفتہ اور فرسودہ ہو چکے ہیں اور ان اصولوں میں زمانے کے مطابق "جدیدیت" پیدا کرنے اور اسے رفتارِ زمانہ کے دوش بدوش "متحرک" کرنے کی ضرورت ہے وہ کس قدر غلط بات کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے جو نظامِ حیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا وہ فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس نظامِ حیات کے اصول قیامت تک کے لیے کارآمد ہیں۔ ان میں کوئی کمی اور خامی نہیں ہے۔ ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ۔ اس میں انسان کے فطری میلانات، مقتضیات و جذبات کے مطابق انسان کی مکمل رہنمائی کی گئی ہے اور اب اس میں کسی ترمیم و اضافے کی حاجت نہیں۔ اللہ نے اسی کو انسان

کے لیے پیدا کیا ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط (المائدہ: ۳)

اور جو اس دین کو چھوڑ کر کوئی اور طریقِ زندگی اختیار کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرمائے گا۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْہُ ۰

(۱۴ر جنوری ۱۹۶۰ء)

اَلَیْسَ مِنْکُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ

عصرِ حاضر کی مادی تہذیب جس شکل و انداز میں ارتقا کر رہی ہے، اس کا ایک پہلو تو وہ ہے جس پر اقبال مرحوم کے الفاظ میں اس طرح تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔

"عشق ناپید و خرد مے گزدش صورتِ مار"
عقل کو تابعِ فرمان نظر کر نہ سکا!
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

لیکن ایک پہلو اور بھی ہے جس کی طرف لوگوں کی بہت کم نظر جاتی ہے۔ وہ یہ کہ احادیث میں قربِ قیامت کی جو علامات بیان کی گئی ہیں ان کے آثار مادی تہذیب کی ان ترقیوں کے آئینے میں نظر آنے لگے ہیں۔ کیا عجب ہماری دنیا اس مرحلے میں گامزن ہو چکی ہو جس کی خبر نبی صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم نے دی تھی۔ یہ بات خدا ہی جانتا ہے کہ یہ مرحلہ کتنی طویل مدت پر حاوی ہوگا کہ خدا تعالیٰ کے ہاں ماہ و سال ناپنے کا پیمانہ

ہمارے پیمانے سے بالکل مختلف ہے۔ وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (تیرے رب کے نزدیک ایک دن اتنا ہوتا ہے جتنا کہ تمہاری نظر میں ایک ہزار سال ہوتے ہیں) مستورد بن شداد راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں قیامت کی ابتدا میں بھیجا گیا ہوں میں قیامت سے اتنا بڑھ گیا جتنی کہ یہ (درمیانی) انگلی اس انگشتِ شہادت سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ فرما کر آپؐ نے درمیانی اور شہادت کی انگلیوں کی طرف اشارہ کیا (ترمذی) یعنی درمیانی انگلی اور انگشتِ شہادت کی لمبائی میں جو فرق اور فاصلہ ہے اتنا ہی فاصلہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قیامت کے درمیان ہے اور بعثتِ نبویؐ کو اب تک تقریباً تیرہ سو نوّے سال کی مدت گزر چکی ہے۔

آثارِ قیامت سے متعلق جس قدر احادیث کتبِ احادیث میں ملتی ہیں، ان کے مضامین میں اختلافات کے باوجود دو باتیں مشترک ہیں۔ اول یہ کہ قیامت سے پہلے مادّی ترقی انتہائے اوج و کمال کو پہنچ چکی ہوگی۔ دوم انسانی معاشرے میں اخلاقی فساد اور بے دینی و الحاد اپنے عروج پر ہوگا۔ احادیث میں آخری زمانے کی مادّی تہذیب کے زعیم کو دجّال کے نام سے پکارا گیا ہے۔ دجّال کے ظہور کے وقت مادّی و صنعتی ترقی اس انتہائے کمال پر ہوگی اور انسان طبیعی قوانین اور فضاء و خلا پر اس طرح حاوی ہو چکا ہوگا کہ دجّال جب چلے گا تو سرعتِ رفتار میں ہوا سے باتیں کرے گا۔ کالغیث استدبرتہ الریح (مسلم) گویا وہ ایک بادل ہے جسے ہوا اڑائے لیے جا رہی ہو۔ وہ چالیس راتوں کے اندر اندر روئے زمین پر گھوم پھر جائے گا۔ فلا ادع قریۃ الا ھبطتھا فی اربعین لیلۃ۔ کوئی قریہ ایسا نہ ہوگا جہاں وہ چالیس رات کے اندر اندر نہ اترا ہو (مسلم)۔ اسے ایسی قدرت حاصل ہوگی کہ اس کی آواز ہر ملک میں پہنچے گی۔ ینادی بصوت لہ یسمع ما بین الخافقین وہ ایسی آواز سے پکارے گا

جیسے زمین و آسمان کے دونوں کناروں اور مشرق و مغرب کے درمیان رہنے والی مخلوق سنے گی (کنز العمال) فضاء ابر اور زمین کو وہ اس طرح مسخر کرے گا کہ جب چاہے گا پانی برسا لے گا اور بنجر زمینوں کو آباد کرے گا۔ یامر السماء فتمطر و یامر الارض فتنبت آسمان کو حکم دے گا تو بارش ہونے لگے گی اور زمین کو حکم دے گا تو اس میں سبزہ اگ آئے گا (کنز العمال) وہ فضا اور خلا ہی کو نہیں زمین کی گہرائیوں تک کو مسخر کرے گا اور وہ اس کے آگے اپنے پوشیدہ ذخائر اگلنے لگے گی۔ حتی یمر بالخربۃ فیقول لہا اخرجی کنوزک فتتبعہ کنوزھا۔ اس کا گزر غیر آباد ویرانے میں ہوگا، اس سے کہے گا اپنے خزانے باہر نکال دے، چنانچہ وہ اپنے خزانے اگل دے گا اور وہ اس کے پیچھے ہولیں گے (کنز العمال) طبیعی قوانین پر اسے اتنی قدرت حاصل ہوگی کہ وہ لوگوں کو مار کر زندہ کر دے گا۔ (مشکوٰۃ)

دنیا کے اس آخری دور میں مادی و صنعتی ترقی کے اس کمال اور طبیعی قوانین کی اس تسخیر کے ساتھ ساتھ انسانی معاشرہ میں جو شر و فساد، اخلاقی انارکی اور کفر و طغیان پھیلے گا اس کا ذکر بھی احادیث میں آیا ہے۔ انس رض راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قیامت اس وقت آئے گی جب زمین پر کوئی اللہ کا نام لیوا نہ رہے گا۔ ابو داؤد میں ہے کہ دجال کے پاس ایک شخص آئے گا، وہ اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہوگا لیکن دجال کو دیکھتے ہی اس کے دل میں (اسلام کے متعلق) شبہات پیدا ہو جائیں گے اور وہ اس کے متبعین میں شامل ہو جائے گا۔ مسلم کی روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فتنوں کے پیش آنے سے پہلے نیک اعمال کرنے میں جلدی کرو، تاریک رات کی طرح جب فتنے رونما ہوں گے اس وقت آدمی صبح کے وقت ایمان کی حالت میں اٹھے گا اور شام کو کافر ہو جائے گا اور شام کو مومن ہوگا اور صبح کافر ہو جائے گا۔

اور اپنے دین کو تھوڑی سی متاع پر بیچ دے گا۔

اخلاقی فساد عورتوں اور لڑکیوں میں اس طرح پھیل جائے گا کہ لوگ انہیں گھروں میں بند رکھنے پر مجبور ہوں گے۔ معروفات اور منکرات کی تمیز اس طرح اٹھ جائے گی کہ ہر طرف شریر اور بدکار لوگ نظر آئیں گے۔ وہ معروف کو معروف سمجھیں گے نہ منکر کو منکر۔ عیش و نشاط، فسق و فجور ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بن جائے گا۔ انسان کی جان اتنی ارزاں ہو جائے گی اور کسی سبب کے بغیر اس سے یوں کھیلا جائے گا کہ قاتل کو خبر ہو گی کہ اس نے مقتول کو کیوں قتل کیا اور نہ مقتول کو پتہ ہو گا کہ وہ کس جرم میں مارا گیا ہے"

ان احادیث کے آئینے میں کیا آج ان علامات کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں جو قرب قیامت کی بتائی گئی ہیں؟ مادیت کے علمبردار جس طرح فضا اور خلاء کو مسخر کرنے کی تگ و دو میں ہیں، طبیعی قوانین پر انہیں جیسے روز بروز زیادہ اختیار و تسلط حاصل ہو رہا ہے، وہ مادی ترقیوں کے آسمان کو چھونے کے لیے جس مسابقت میں مصروف ہیں اور پھر اس مادی ترقی کے جلو میں اخلاقی مفاسد اور بے دینی و الحاد کا جو طوفان امڈا آ رہا ہے، کیا یہ سب اس امر کی صریح شہادت نہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے چودہ سو برس پیشتر جو کچھ فرمایا تھا وہ برحق ہے؟ پھر ذرا غور فرما لیجئے، منکرین حدیث کا یہ دعویٰ کس حد تک درست ہے کہ احادیث کا پورا ذخیرہ راویوں کی من گھڑت روایات کا مجموعہ اور "عجمی سازش" کا تصنیف کردہ ہے جسے رسول صادق و امین کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس لیے انہیں زندگی کی تاریکیوں میں مشعل راہ بنانے کے بجائے دریا برد کر دینا چاہیئے اور ان لوگوں کی اہوائے نفسانی پر ایمان لے آنا چاہیئے جسے یہ قرآنی معارف کا نام دیتے ہیں۔ کیا صدیوں کے پردے چاک کر کے حالات کو منہ بین دیکھ لینے کی قوت کسی ایسی آنکھ میں پائی جا سکتی ہے جو اللہ کے نور سے

براہِ راست مستنیر نہ ہو؟ دنیا میں بڑے بڑے کاہن، امورِ غیب کے مدعی، قوتِ متخیلہ کے حامل لوگ گزرے ہیں۔ انہوں نے اپنی ذہنی و فکری بلند پروازیوں کا جو سرمایہ چھوڑا ہے اسے دیکھ جائیے کیا ان روایات کی نوعیت اس سرمائے کی سی ہے؟ کیا یہ محض ان لوگوں کی قوتِ فکر کی منت کش ہیں جن کو ہم اپنی دینی و علمی تاریخ کے رجالِ عظیم شمار کرتے ہیں مگر یہ منہ پھٹ منکر وضاعین کے نام سے پکارتے ہیں؟ کیا یہ احادیث پکار پکار کر منکرینِ حدیث کی افترا پردازیوں کو نہیں جھٹلا رہیں اور ان کے ایک ایک لفظ کی صداقت یہ گواہی نہیں دے رہی کہ وہ ایک ایسی زبانِ صدق سے نکلا ہے جو وحیِ الٰہی کی رہنمائی میں متحرک ہوتی تھی۔ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی (النجم) پھر کیا اس گروہِ حق فراموش میں کوئی بھی ایسا بھلا آدمی نہیں جو ارشاداتِ رسول ﷺ کی ان صداقتوں اور حقیقتوں سے حق پذیری کا سرمایہ حاصل کر سکے؟ اَلَیْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِیْدٌ"۔

(۲۱ر جنوری ۱۹۵۹ء)

ظُلمت سے نُور تک

ماہنامہ "چراغ راہ" نے ایک انگریز نومسلم کا تعارف اور ان کے مسلمان ہونے کی داستان خود ان کی اپنی زبان سے انٹرویو کی شکل میں شائع کی ہے۔ یہ داستان دلچسپ اور کشش انگیز بھی ہے اور ہم نسلی مسلمانوں کے لیے سبق آموز بھی۔ ان کا نام نامی محمد جان ویبسٹر ہے۔ مسٹر محمد جان لندن کے ایک متوسط عیسائی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ انہیں حق کی راہ میں وقف ہونے کا جذبہ اپنی والدہ کی زندگی سے ملا۔ وہ بڑی نیک اور شریف خاتون ہیں۔ مذہب اور اس کی تعلیمات سے گہرا لگاؤ ہے بچے کی اولیں تربیت گاہ ماں کی آغوش ہوا کرتی ہے۔ ننھے ویبسٹر کے دل و دماغ پر اپنی ماں کے اخلاق و سیرت کا اثر پڑا۔ اور وہ بھی باقاعدہ گرجا جانے اور اپنی ماں کا تتبع کرنے لگا۔ وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ یہ اثرات گہرے ہوتے چلے گئے اور وہ ایک مخلص عیسائی بن کر اٹھنے لگے۔ دس برس کی عمر کے تھے کہ ان کے دل میں اپنی زندگی حق کی راہ میں وقف کرنے کا جذبہ انگڑائی لینے لگا۔ ایک دن اپنے رب سے دعا کی:

"اے مالکِ حقیقی! میں اپنی زندگی تیری راہ میں وقف کرتا ہوں تو میری رہنمائی فرما اور مجھے سیدھا راستہ دکھا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے "ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی بنا دیتے ہیں۔" یہ ننھے ویبسٹر کی فطرت ہی

تھی جو دعا بن کر اس کی زبان پر آتی تھی۔ اس نے عیسائیت کی گود میں آنکھیں کھولی تھیں اور اسی کی فضا میں پروان چڑھ رہا تھا۔ اس کے لیے بظاہر حق کا راستہ وہی بگڑی ہوئی عیسائیت کا تھا جس پر وہ بچپن سے گامزن تھا۔ مگر اس کی دعا کے الفاظ کہہ رہے تھے کہ اس کی فطرت اس پر مطمئن نہیں رہ سکے گی۔ ابھی لڑکپن کی سرحد بھی عبور نہیں کی تھی کہ عیسائیت کی تبلیغ کو انہوں نے اپنا مقصدِ زندگی بنا لیا اور سالویشن آرمی (مکتی کی فوج) میں شریک ہو گئے۔ اپنے جوش و جذبہ اور اخلاص کی بدولت چند سال کے اندر اندر انہیں سالویشن آرمی میں ایک ایسا مقام مل گیا جہاں سے وہ اس تنظیم کے اندرونی حالات کھلے طور پر دیکھ سکتے تھے۔ جو کچھ انہوں نے دیکھا اس نے انہیں سالویشن آرمی سے بیزار کر دیا۔ مذہب کے نام پر ایک کاروبار کیا جا رہا تھا اور نفاق کے روگ سے اس ادارے کے سربراہوں کی زندگی داغ داغ تھی۔ ویبسٹر نے اس ادارے کو خیرباد کہہ دیا۔ اس وقت اس کا رہوارِ عمر زندگی کی اٹھارویں منزل میں تھا۔

تاہم عیسائیت پر نوجوان ویبسٹر کا اعتقاد اب بھی باقی تھا۔ لیکن عیسائیت کے تفصیلی اور گہرے مطالعے نے اس اعتماد کو بھی زائل کر دیا۔ نوجوان ویبسٹر کی فطرتِ سلیم میں مسیحی عقائد کانٹا بن کر کھٹکنے لگے۔ اس پر طرّہ یہ کہ عیسائیت کا دامن انہیں انسان کے معاشرتی، تمدنی اور تہذیبی معاملات کی رہنمائی سے تہی نظر آیا۔ وہ اپنے گرد و پیش میں پیدا ہونے والے مسائل و مشکلات کا حل عیسائیت سے طلب کرتے اور خواہش تھی۔ وہ انسانیت کے زخموں کا اندمال چاہتے مگر اس کے پاس کوئی مرہم نہ تھا۔ اس صورتِ حال سے ان کا ایمان متزلزل ہو کر رہ گیا۔ ان کے ذہن نے سوال کیا جو مذہب انسان کے مسائل حل کرنے سے قاصر ہے اس کو سینے سے لگائے رکھنا کہاں کی دانشمندی ہے؟

عیسائیت سے مایوسی نے انہیں مذہب ہی سے بیزار کر دیا۔ مذہب سے

یہ بیزاری اور حالات کا بہاؤ انہیں کمیونسٹ پارٹی کی طرف لے گیا۔ جہاں آہستہ آہستہ وہ پارٹی کی مجلسِ انتظامیہ کے رکن اور نوجوانوں کی تنظیم کے سیکرٹری بن گئے۔ ان مناصب پر پہنچنے کے بعد انہیں کمیونسٹ پارٹی کو بھی اندر سے دیکھنے کا موقع ملا اور یہاں بھی وہی نفاق، مفاد پرستی اور فریب کاری نظر آئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ پارٹی روسی کمیونسٹوں کے ہاتھ میں رقص کناں تھی۔ اس کے نزدیک وہی چیز حق تھی جسے روسی کمیونسٹ حق کہتے اور وہ چیز باطل تھی جسے وہ باطل کہتے۔

اس انکشافِ حقیقت نے انہیں کمیونسٹ پارٹی بھی چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے ویبسٹر کو فطرتِ سلیم سے نوازا تھا۔ اشتراکیت کی حقیقت عیاں ہونے کے بعد ان کی فطرت نے پکارا۔ مذہب کے بغیر انسان ایک قدم بھی راہِ راست پر نہیں چل سکتا مگر وہ مذہب محض مابعد الطبیعاتی نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کے دامن میں ایسا نظامِ حیات بھی ہونا چاہیئے جو دکھی انسانیت کا مداوا کر سکے۔ اس کے زخموں پر مرہم کا پھاہا رکھ سکے اور اس کے مسائل و مشکلات کو حل کر سکے۔

ویبسٹر کی متجسس اور بے قرار فطرت کو پہلی مرتبہ رہنمائی ایک عجیب واقعہ سے میسّر آئی۔ پرتھ یونیورسٹی میں انڈونیشیا کا سفیر شمالی آریان کے مسئلے پر تقریر کرنے آیا۔ آسٹریلیا میں انڈونیشیا کے اس مطالبے کو سامراجی مطالبہ قرار دیا جاتا ہے۔ مسٹر ویبسٹر سامراج کے زبردست دشمن تھے۔ اسی لیے انہیں انگلستان چھوڑ کر آسٹریلیا آنا پڑا تھا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ سفیر کو تقریر کرنے نہیں دیں گے، چنانچہ اپنے ساتھیوں سمیت وہاں پہنچ گئے اور ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ تقریر نہ ہو سکی، لیکن اس واقعے نے ان کے ہوشمند ضمیر کو گویا جھنجوڑ دیا۔ وہ سوچنے لگے کہ ہم جو جمہوریت کے علمبردار بنے پھرتے ہیں، ہم نے اس شریف آدمی کو آخر اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت کیوں نہ دی؟

معاً یہ سوال ذہن میں پیدا ہوا کہ انڈونیشیا ایک مسلمان ملک ہے اور شمالی آریان کے لوگ بھی مسلمان ہیں۔ یہ مسلمان کون ہیں، ان کا دین کیا ہے، ان کے عقائد کیا ہیں؟

ان سوالات نے انہیں اسلام کے متعلق جستجو کی راہ پر ڈال دیا۔ قرآن کریم کا انگریزی ترجمہ پڑھا اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کیا اور اس تعلیم اور مطالعہ نے ان پر حق و ہدایت کی راہ کھول دی اور بے اختیار دل سے نکلا لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ اور زبان نے اس کی تائید کی۔ اسلام لانے کے بعد وہ کسی طرح قادیانیوں کے ہتھے چڑھ گئے مگر چونکہ فطرتِ سلیم پائی تھی اور قادیانیت کا فطرتِ سلیم سے کوئی واسطہ نہیں، اس لیے وہ بہت جلد اس چکر سے نکل آئے۔ اب وہ ختم المرسلین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں اور جس دین کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اس کی تبلیغ و اشاعت میں سرگرم ہیں۔

یہ تو تھی اس مردِ مومن کے قبولِ اسلام کی داستان۔ جو چیز ہم نسلی مسلمانوں کے لیے اس سے بڑھ کر حیرت انگیز ہے وہ اس مردِ حق کا ایمان ہے جو وہ اسلام کی تعلیمات پر رکھتا ہے۔ انٹرویو میں مختلف مسائل پر ان کے خیالات درج کیے گئے ہیں پہلی بات جو مسٹر محمد جان بتاتے ہیں یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی عملی زندگی سے متاثر ہو کر مسلمان نہیں ہوئے بلکہ اگر وہ ان کی عملی زندگی کو اسلام کی حقانیت پرکھنے کی کسوٹی قرار دیتے تو شاید اس کی آغوش میں آنے کی بجائے اس سے متنفر ہو جاتے۔ انہیں اسلام کی تعلیمات نے متاثر کیا ہے کہ وہ اپنے دامن میں کس طرح انسانی مشکلات و مسائل کا حل رکھتی ہیں۔ ان کے علاوہ جو بات انہیں اسلام کے دامن میں کھینچ لانے کا باعث ہوئی وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اور رہنمائی ہے جو آنحضور نے معاشرت، تمدن اور سیاست و تہذیب کے میدانوں میں نوعِ انسانی کی فرمائی ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ

اسلام کی تعلیمات اپنے دامن میں محض نظریاتی طور پہ کتنی کشش رکھتی ہیں۔ اگر مسلمان اپنی عملی زندگی بھی ان تعلیمات کے سانچے میں ڈھال لیں اور دنیا اس معاشرے کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے جو ان تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے وجود میں آتا ہے تو کیا کفر و الحاد اور جاہلیتِ جدیدہ کے ہاتھوں زخم کھائی ہوئی دنیا اس چشمۂ شفا کی طرف دیوانہ وار نہ دوڑ پڑے گی اور ایک بار پھر یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کا سماں نہ بندھ جائے گا؟

دوسری بات اس انٹرویو سے یہ واضح ہوتی ہے کہ انسان جب شعوری طور پہ ایمان لاتا ہے اور کسی قسم کا کوئی ذہنی تحفظ اس کی راہ میں حائل نہیں ہوتا تو اسلام کی تعلیمات اپنی سادہ اور پُراثر صورت میں اس کے سامنے آجاتی ہیں، کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی باقی رہنے نہیں پاتی۔ آزادئ نسواں کے اس نعرے کا ان سے ذکر کیا گیا جو مغرب زدہ مسلمان لگاتے ہیں اور مسلمان عورتوں کو مغربی عورتوں کی راہ پر ڈالنا چاہتے ہیں تو ایک ایسا شخص جو مغربی ہے اور مغربی تہذیب کی گود میں پلا اور پروان چڑھا ہے جواب میں کہتا ہے:

"میں عورتوں کی آزادی اور ان کی مساوات کا سختی سے حامی ہوں، لیکن میں مسلمان عورتوں کو مسلمان دیکھنا چاہتا ہوں، مغربی عورت کا چربہ نہیں۔ عورتوں کی آزادی کے معنی مغرب کی تقلید نہیں۔ یہ آزادی نہیں، ایک نئی قسم کی غلامی ہوگی۔۔۔ میں اپنی بہنوں سے کہوں گا کہ تم مغرب کی نقالی نہ کرو۔ تم گھروں سے باہر نکلنے کی نہ سوچو۔ تم قومی زندگی میں برابر شریک ہو، مگر یہ شرکت اسلامی طریقے سے کرو۔ تم اپنا نصب العین نوکری اور سماج کی زینت بننا نہ بناؤ، بلکہ تمہارا نصب العین ایک اچھی بیوی اور ماں بننا ہے۔ تم اس نصب العین کو ترک نہ کرو۔ تم اپنے سامنے مغرب کی فلم ایکٹرسوں کا نمونہ نہ رکھو بلکہ قرونِ اولیٰ کی مسلمان خواتین کا اسوہ رکھو۔ تم کو عائشہ صدیقہؓ اور فاطمۃ الزہراؓ کے نقشِ قدم پر چلنا ہے اور یہی تمہاری

ترقی اور نجات کی اصل راہ ہے۔

ملاحظہ فرمایا جس حقیقت کو ہم نسلی مسلمان دیکھ نہیں پاتے یا دیکھتے بھالتے ہوئے اسے مُلّائیت قرار دے کر نظر انداز کر دیتے ہیں اسے ایک مغربی مسلمان کس طرح ٹھیک ٹھیک دیکھ اور محسوس کر رہا ہے۔

مسٹر ویبسٹر اسلام کے مستقبل کے بارے میں نہ کسی شک وشبہ میں مبتلا ہیں نہ مایوس ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اسلام اللہ کا دین ہے۔ اگر آج کے مسلمان اس دین پر ایمان لانے کا حق ادا نہ کریں گے تو اللہ جو اپنے دین کی حفاظت کا خود ذمہ دار ہے کسی اور قوم کو اس کا علمبردار بنا دے گا۔ مسٹر ویبسٹر مغرب کی نقالی اور اندھا دھند تقلید کو ہلاکت انگیز کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک "ہماری ترقی مغرب کی نقالی میں نہیں اپنے طریقے کے اتباع میں ہے۔" ان کا کہنا ہے کہ "مغرب خود اخلاقی طور پر دیوالیہ ہو چکا ہے۔ جو خود دیوالیہ ہو وہ دوسروں کو کیا دے گا؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سچ کہا کہ اگر ایک اندھا دوسرے کی رہبری کرے گا تو دونوں ہی گڑھے میں گریں گے۔"

مسٹر ویبسٹر کے یہ الفاظ ہم نسلی مسلمانوں کے لیے عبرت انگیز ہیں جو اپنے گھر میں ہیرو[illegible] کی کان چھوڑ کر مغرب کے پامال کنکروں کو ہیرا سمجھتے ہیں اور ان کی جانب لپک رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انسان کو راہ حق و ہدایت کس طرح دکھاتا ہے اور پھر اسے کس طرح حق آشنا کر دیتا ہے مسٹر ویبسٹر کی زندگی اس حقیقت کو آشکارا کرتی ہے۔ مسٹر ویبسٹر معاملات زندگی کو جس طرح اسلام کی روشنی میں دیکھتے ہیں، اور کسی مرعوبیت، احساس کہتری اور جھجک کے بغیر اسے پیش کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اسلام کو ایسے ہی پیروکاروں کی ضرورت ہے جو اس کے اصولوں پر پختہ ایمان رکھتے ہوں، دنیا میں رائج و غالب نظریات سے خیرہ اور مرعوب نہ ہوں اور نہ اسلامی نظریات کو کسی مرعوبیت، احساس کہتری یا جھجک کے

بغیر پیش کرنے کی جرأت رکھتے ہوں، جب زمانہ "چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی" کی دعوت دے رہا ہو تو وہ زمانے کے بہتے ہوئے دھارے سے نبرد آزما ہونے کا دل گردہ رکھتے ہوں، اس کے رنگ کو اپنانے سے انکار کرنے والے ہوں اور اپنے طریقے روایات اور تہذیب کو دانتوں کے ساتھ مضبوطی سے پکڑنے والے ہوں۔

(۳۰ رجون ۱۹۶۰ء)

مکارمِ اخلاق

آج کل اقبال کی مثنوی اسرار و رموز زیر مطالعہ ہے۔ یوں تو اس مثنوی کا ایک ایک شعر عشقِ حق کے سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے اور دل پر عجیب اثر کرتا ہے۔ جی چاہتا ہے آدمی بار بار پڑھے۔ خود میں جانے کتنی بار پڑھ چکا ہوں، مگر ذوقِ مطالعہ ہے کہ سیر ہونے میں نہیں آتا۔ اس مرتبہ اس کتاب کے اس باب نے دل پر بے حد اثر کیا جس میں شاعر نے بتایا ہے کہ ملّتِ اسلامیہ کا جلال و جمال اخلاقِ محمدیؐ اپنانے میں ہے۔

شاعر نے اس مضمون کا آغاز اپنے زمانۂ شباب کے ایک واقعہ سے کیا ہے۔ ایک سائل قضائے مبرم کی صورت میں اس کے دروازے پر آتا ہے، بار بار صدا کرتا ہے اور جانے کا نام نہیں لیتا۔ عالمِ جوانی میں آپے جاتے ہیں، عقل نیک و بد، صواب و ناصواب سے بے بہرہ ہوتی ہے۔ شاعر جوشِ غضب میں اس کے سر پر چھڑی دے مارتا ہے۔ چھڑی ٹوٹ جاتی ہے اور دریوزہ گر کے پلّے میں جو کچھ حاصلِ دریوزہ تھا گر پڑتا ہے۔ شاعر کا باپ اس منظر کو دیکھتا ہے اپنے بیٹے کی اس حرکت کا اس پر جو اثر ہوتا ہے وہ خود شاعر کی زبان سے سنیئے:

از مزاجِ من پدر آزردہ گشت

لالہ زارِ چہرہ اش افسردہ گشت

میرے مزاج کی اس کیفیت کو دیکھ کر میرے والد سخت آزردہ ہوئے ان کے

سرخ چہرے پر افسردگی چھا گئی۔

بو لبش آہے جگر تابے رسید | درمیانِ سینۂ او دل تپید
کوکبے از چشم او گردید ریخت | بر سرِ مژگاں دمے تابید و ریخت

ان کے لب سے ایک جگر دوز آہ بلند ہوئی، ان کا دل تڑپ اٹھا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر بیٹے سے مخاطب ہو کر کہا۔

گفت فردا اُمّتِ خیر الرسل | جمع گردد پیشِ آں مولائے کل
غازیانِ ملّتِ بیضائے او | حافظانِ حکمتِ رعنائے او
هم شهیدانے کہ دیں را حجت اند | مثلِ انجم در فضائے ملّت اند
زاہدان و عاشقانِ دل فگار | عالمان و عاصیانِ شرمسار

کل قیامت کے روز جب اُمّتِ مسلمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گی۔ ان میں ملّت کے غازی، شریعت کے حفاظ، زاہد، صوفی اور عالم و عاصی سب ہوں گے۔

درمیانِ انجمن گردد بلند | نالہ ہائے ایں گدائے دردمند

اس محفل میں اگر اس مظلوم نے اُٹھ کر فریاد کی اور اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے پوچھا۔

حق جوانے مسلمے با تو سپرد | کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کارِ آساں ہم نشد | یعنی آں انبارِ گل آدم نشد

خدا نے ایک مسلم نوجوان تیرے سپرد کیا کہ اسے میرے مدرسے میں تعلیم و تربیت دو، مگر تجھ سے اتنا آسان کام بھی نہ ہو سکا کہ مٹی کے اس پیکر کو انسان بنانا — تو اے مرکب سے محروم اور راہِ دشوار کے مسافر مجھے بتا کہ میں کیا جواب دوں گا؟

اے صراطت مشکل از بے مرکبی | من چہ گویم چوں مرا پرسد نبیؐ

اس وقت بجز اس کے اور کیا ہوگا کہ امت کے اس اجتماع میں میں شرمسار ہو کر رہ جاؤں۔ بیٹے! میری سفید ڈاڑھی کا خیال کر۔ اپنے باپ پر یہ ظلم نا روا نہ ڈھا اور ایک غلام کو اپنے آقا کے حضور رسوا نہ کر۔

بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن پیشِ مولا بندہ را رسوا مکن

پھر شاعر اپنے بزرگ باپ کی اس نصیحت کو بیان کرتا ہے جو اس نے اس موقع پر اسے کی:

غنچۂ از شاخسارِ مصطفےٰ گل شو از بادِ بہارِ مصطفےٰ

تو محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے باغ کی کلی ہے۔ ان کی بادِ بہار (اخلاق) سے پھول بن جا۔

از بہارش رنگ و بو باید گرفت بہرۂ از خلقِ او باید گرفت

تجھے ان کی بہار سے رنگ و بو حاصل کرنا اور ان کے اخلاق سے بہرہ یاب ہونا چاہیئے۔

مرشدِ رومی چہ خوش فرمودہ است آنکہ یم در قطرہ اش آسودہ است

مولانا رومیؒ نے جن کے ایک ایک شعر میں حکمت کے دریا پوشیدہ ہیں کیا خوب فرمایا ہے:

"مگسل از ختم الرسل ایامِ خویش تکیہ کم کن بر فن و بر گامِ خویش"

اپنی زندگی کو خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے مت کاٹ اور اپنے ہنر اور اپنے اندازِ عمل پر بھروسا نہ کر۔

فطرتِ مسلم سراپا شفقت است در جہاں دست و زبانش رحمت است

مسلمان کی فطرت سراسر شفقت ہے، دنیا میں اس کا ہاتھ اور اس کی زبان رحمت کا پیغام ہے۔

آنکہ مہتاب از سرِ انگشتش دو نیم — رحمت او عام و اخلاقش عظیم
از مقامِ او اگر دُور ایستی — از میانِ معشرِ ما نیستی

وہ ہستی جس نے اپنی انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے کر دیئے جس کی رحمت عام ہے اور جس کا اخلاق بڑا ہی بلند ہے اگر تو اس کے مقام سے دور رہا تو تیرا ہم مسلمانوں کی جماعت سے کوئی تعلق نہیں۔

نصیحت آگے بھی چلتی ہے، مگر یہاں تک جو کچھ کہا گیا ہے بعد کے اشعار اس کی توضیح و تشریح پر مشتمل ہیں۔ ان اشعار کو پڑھ کر پہلا خیال تو دل میں یہ پیدا ہوا کہ منکرینِ سُنّت جو اقبال کو اپنا ہم نوا گردانتے ہیں۔ اقبال پر کس قدر افترا باندھتے ہیں! جو شخص اس بات پر ایمان رکھتا ہو کہ خاتم الرسل محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مقام سے دور ہو جانے اور اپنے شب و روز کو آنحضورؐ کے شب و روز سے کاٹ لینے سے آدمی مسلمانوں کی جماعت سے خارج ہو جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ منکرینِ سنت کی صف سے تعلق رکھتا تھا، کتنا بڑا جھوٹ ہے جو کھلے بندوں بولا جا رہا ہے۔ اگرچہ جو لوگ خدا پر جھوٹ باندھنے سے نہیں شرماتے اور اپنی اہوا کو قرآن کے معارف کا نام دینے سے نہیں چوکتے اُن کے لیے خدا کے کسی بندے پر جھوٹ باندھنا اور افترا پردازی کرنا کوئی بڑی بات نہیں، لیکن اس سے اس گروہ حق فراموش کی اخلاقی پستی واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اور اتنا بڑا جھوٹ وہ محض اس لیے بول لیتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے دامِ فریب میں گرفتار کرنے میں آسانی ہو۔ اقبال کو ہمارے پڑھے لکھے طبقے ہی میں نہیں، عام لوگوں میں بھی عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح یہ لوگ مسلمانوں کو یہ تأثر دینا چاہتے ہیں۔ کہ انکارِ سنّت کے سلسلے میں ہمارا جو موقف ہے وہ کوئی نیا اور اجنبی نہیں بلکہ اقبال ایسے جلیل القدر لوگوں کا موقف بھی یہی ہے۔ اقبال کا بیشتر کلام فارسی میں ہے جس سے عام پڑھے لکھے

افراد بھی اکثر شناسا نہیں، بیچارے عام لوگ تو کس شمار قطار میں ہیں۔ انہیں کیا خبر کہ یہ لوگ سفید جھوٹ بول رہے ہیں۔ وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ سچ ہی کہتے ہوں گے، چہرے مہرے سے اچھے بھلے شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں اور قرآن کریم کی آیت کا حوالہ دیے بغیر نوالہ نہیں توڑتے۔

اس خیال کے ساتھ ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق کا تصور ذہن میں ابھرا۔ دینِ حق جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے سراپا اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے۔ ایسے دین کا لانے والا بھی سراسر اخلاق کا پیکر ہونا چاہیے تھا، چنانچہ خود اللہ تعالیٰ نے آپ کی اخلاقی عظمت کی شہادت دی ہے۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ایک مرتبہ ایک شخص نے امّ المؤمنین حضرت عائشہؓ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا: کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا؟ کان خلقہ القرآن آپ کا اخلاق قرآن کی آیات کا عملی پرتو تھا۔ قرآن میں جو کچھ الفاظ میں ہے وہی کچھ آپ کی سیرت میں عمل کی صورت میں جلوہ گر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں زندگی گزارنے کے جو احکام نازل کیے انہیں آپؐ نے اپنی زندگی میں نافذ و جاری فرمایا۔ حق پرستی نیکی کی طرف اقدام، برائی سے حذر، عدل گستری و انصاف پروری، بے انصافی اور ظلم سے اجتناب، [illegible] شعاری، دیانت و امانت، راست بازی، اخلاص، بے غرضی و بے ریائی، غیرت و خودداری، فیاضی، عفت و پاک بازی، شرم و حیا، وفائے عہد، احسان، عفو و درگزر، دردمندی، شکر گزاری، انکسار و تواضع، ایثار، سلامت روی، صبر و توکل، استقامت، حق گوئی، بے نیازی، شجاعت اور صدق و صفا اور پاکیزگی قلب و کردار ـــــ یہ وہ اخلاقی فضائل تھے جن سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ عبارت تھی۔ دنیا کے ہنگامہ میں ایسے لوگ تو بے شمار مل جاتے ہیں جو ایک دو یا چند اخلاقی فضائل کے حامل

ہوں اور ایسا تو کوئی نہیں ملتا جن میں کچھ اخلاقی فضیلتوں کے ساتھ کچھ نہ کچھ اخلاقی کمزوریاں نہ پائی جاتی ہوں۔ ایسی شخصیت صرف حضورؐ ہی کی عظیم ترین شخصیت ہے جن کے آگے ہر بلندی پست اور ہر عظمت ہیچ ہے۔ جن میں ہر اخلاقی فضیلت بدرجۂ کمال واتم پائی جاتی ہے اور جو ہر قسم کے اخلاقی و بشری عیوب سے پاک و منزہ ہے۔ اخلاقی فضیلت کا یہی بلند درجہ تھا جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا:

اِنِّیْ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ ــــ یعنی میں مکارمِ اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں ــــ گویا آپؐ کی بعثت کا مقصد ہی مکارمِ اخلاق کو انسانی زندگی کا دستورِ عمل بنانا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ ایمان و عقائد کے بنیادی اساسات کے ساتھ مکارمِ اخلاق کو اپنانا لازم قرار دیا گیا ہے اور اخلاقِ ذمائم کی موجودگی ایمانی و اعتقادی بنیادوں کی نفی یا ان کے ضعف کی علامت بتائی گئی ہے۔ مثلاً صدق شعاری ہر مسلمان پر فرض ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ زبان سے جو بولا جائے سچ بولا جائے اور سچ کے علاوہ کچھ نہ نکلے۔ صدق شعاری اور ایمان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ (التوبہ: ۱۱۹)

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور صدق شعار لوگوں کا ساتھ دو۔

اور اس کی نفی ایمان کی ضد اور منافقت کی علامت ہے۔ مشہور حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

منافق کی تین علامتیں ہیں، جب بولے تو جھوٹ بولے، وعدہ کرے تو پورا نہ کرے اور جب اسے کوئی امانت سونپی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

اس حدیث سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ صدق شعاری کی ضد کذب بیانی کی طرح وفائے عہد کی ضد وعدہ خلافی اور امانت داری کی ضد خیانت بھی ایمان و اسلام

کے منافی ہے۔ اسی طرح آپ کے بیان کردہ اخلاقی فضائل میں سے ہر ایک کو بھی قرآن وحدیث میں ایمان واسلام کی نشانی بتایا گیا ہے۔ وہاں رذائل اخلاق مثلاً جھوٹ وعدہ خلافی، غداری، دغابازی، بہتان تراشی، چغل خوری، غیبت اور بدگوئی، خوشامد، بخل، حرص، طمع، چوری، ناپ تول میں کمی بیشی، رشوت، سود خوری، شراب نوشی، غیظ و غضب، بغض و کینہ، ظلم وستم، بے صبری، بے حیائی، بزدلی، تکبر، بے رحمی، ناانصافی وغیرہ کو یا تو صریحاً ایمان کی ضد بتایا گیا ہے یا انہیں ضعفِ ایمان کی علامت اور ایک مسلمان کی شان کے غیر شایاں قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً:

★ مال و دولت پر سانپ بن کر بیٹھنے اور کارِ خیر میں خرچ نہ کرنے والوں کو قرآن جہنم کی خوش خبری دیتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (التوبۃ ۳۴)

★ غیبت کو قرآن نے مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف قرار دیا ہے۔

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ (الحجرات ۱۲) تم میں سے کوئی شخص دوسرے کی غیبت نہ کرے کیا وہ چاہتا ہے کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے؟ یقیناً تم اسے ناپسند کروگے!

★ ناپ تول میں کمی بیشی کو قرآن نے بربادی کا پیش خیمہ کہا ہے: وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ (المطففین ۱-۳) بربادی اور تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔

★ چوری کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب چور چوری کرتا ہے تو اس میں ایمان نہیں رہتا۔ (بخاری)

★ حرص کے بارے میں ارشاد ہوا: ایمان اور حرص ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ (نسائی)

★ رشوت کے دینے اور لینے والے دونوں پر اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) نے لعنت فرمائی (ابوداؤد)

★ شراب نوشی کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا شراب نوشی کے وقت مومن کا ایمان اس سے رخصت ہو جاتا ہے۔ (بخاری و مسلم)

(۱۴ فروری ۱۹۶۱ء)

اعلیٰ کردار کی دو بنیادیں

کوئی پندرہ بیس روز کا ذکر ہے میں اپنے ایک رفیق انور خاں صاحب کی دکان پر بیٹھا تھا کہ ایک لڑکا آیا۔ اس کے چہرے سے معصومیت ٹپک رہی تھی۔ عمر یہی کوئی دس گیارہ برس ہوگی۔ ایک ہاتھ میں برش اور دوسرے میں تھیلا تھا۔ کہنے لگا "صاحب بوٹ پالش کروائیں گے؟" خاں صاحب نے جواب دیا "نہیں" میں نے دیکھا لڑکے کے چہرے پر ایک ثانیے کے لیے اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ بولا "جناب کروا لیجیے مجھے کل صبح اسکول میں فیس دینی ہے۔ میں آج دن بھر یہی کام کرتا رہا ہوں، اب صرف بارہ آنے کم ہیں۔" لڑکا بول رہا تھا اور میں اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اس کی زبان شستہ و شائستہ تھی، آنکھوں کی چمک اس کی ذہانت کا پتہ دے رہی تھی۔

خاں صاحب نے کہا "اچھا بیٹے کر دو۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے بولے۔

"مگر پہلے بتاؤ۔ تمہاری پالش دیسی ہے یا ولایتی؟"

"جناب میں جھوٹ نہیں بولوں گا، دیسی ہے۔" اس نے جواب دیا اور پھر پالش کی ڈبیا تھیلے میں سے نکالی اور کھول کر دکھائی۔

"پھر تو ہم نہیں کروائیں گے، دیسی پالش جوتے کا ستیاناس کر دیتی ہے۔" خان صاحب نے کہا اور دو روپے جیب سے نکالے اور اسے دینا چاہے۔

میری نگاہیں بدستور لڑکے کے چہرے پر جمی تھیں۔ میں نے دیکھا اس کے چہرے

کا رنگ کچھ بدل سا گیا ہے جیسے یہ بات اسے ناگوار گزری ہے، مگر پھر وہ اسی لہجے میں بولا: "نہیں جناب، میں ایسے نہیں لوں گا، آپ بوٹ پالش کروا لیجئے۔"

خان صاحب غالباً اس کے چہرے پر امڈنے والے تأثرات نہیں پڑھ پائے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے "بیٹا لے لو" اور وہ انکار کر رہا تھا کہ نہیں میں ایسے نہیں لوں گا۔ شاید وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ میں بھک منگا نہیں ہوں، لیکن ادب اور شائستگی اس کی زبان روک رہی تھی۔ خان صاحب نے پھر اصرار کیا کہ بیٹے لے لو، مگر اس کا جواب یہی تھا کہ بُرش پھروا لیجئے۔ اصرار و انکار کا یہ سلسلہ کوئی دو تین منٹ جاری رہا۔ آخر وہ "بچہ" چلا گیا۔

میں اس سارے عرصے میں محض ایک تماشائی بنے بیٹھا رہا۔ میں نے لڑکے کو جاتے ہوئے دیکھا، وہ تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے سڑک عبور کر رہا تھا۔ شام سر پر آئی تھی اور اسے بارہ آنے اور کمانا تھے۔ اس کا معصوم چہرہ، اس کی ذہانت، اس کی شگفتہ زبان اور شائستہ طور اطوار میری آنکھوں میں پھر رہے تھے اور ذہن میں ہلچل برپا تھی۔ وہ کسی شریف گھرانے کا نونہال معلوم ہوتا تھا جس پر ادبار و افلاس کی گھٹائیں چھا گئی تھیں۔ یا پھر باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور وہ اپنے علم کا شوق محنت مزدوری کر کے پورا کر رہا تھا۔ یوں تو اس کی ہر بات پسندیدہ تھی، لیکن مجھے جس چیز نے بہت زیادہ متأثر کیا، وہ اس بچے کی غیرت اور صدق شعاری تھی اور یہ وہ گوہر ہائے گرانمایہ ہیں جن سے ہمارے "بچے" ہی نہیں بڑے اور بوڑھے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی غیرت کا یہ عالم تھا کہ اس نے وہ رقم ٹھکرا دی جو بے مزد مل رہی تھی حالانکہ اسے اس کی سخت ضرورت تھی۔ ہو سکتا ہے اس کی ماں نے اسے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلانے کی تعلیم و تربیت دی ہو مگر آج ہمارے بچوں میں کتنے ہیں جو اس تعلیم و تربیت کے سانچے میں فی الواقع ڈھل جاتے ہیں جو انہیں گھر میں دی جاتی ہے اور گھر سے باہر چاروں طرف امڈنے والی برائیوں سے کسی قسم کا تأثر

نہیں لیتے ہ؟

محنت و مزدوری سے جی چرانا ہمارے معاشرے میں عام ہو چکا ہے اور بھیک مانگ کر یا فریب دے کر اور جھوٹ بول کر پیسہ کمانا تو گویا بڑا ہی معزز پیشہ ہے ہٹے کٹے لوگ بازاروں اور گلی کوچوں میں بھیک مانگتے ہوئے عام دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایسے گداگر بھی بے شمار ہیں جو چنگے بھلے اور تندرست و توانا ہوتے ہیں مگر لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے وہ اندھے اور اپاہج بن جاتے ہیں۔ یہ تو عام گداگروں کے طور طریق ہیں۔ اچھے خاصے بظاہر شریف اور سفید پوش حضرات لوگوں سے پیسہ بٹورنے کے لیے جھوٹ بولتے اور گوناگوں سوانگ رچاتے نظر آتے ہیں اور انہیں ذرا شرم و غیرت نہیں آتی۔ رشوت خوری جو ہمارے معاشرے کے اس طبقے میں عام ہوتی جا رہی ہے جس کے ہاتھوں میں عام لوگوں کے امور و معاملات ہیں، گہری نظر سے دیکھا جائے تو ایک اعتبار سے درحقیقت یہ بھی گداگری کی اعلیٰ اور نفیس ترین شکل ہے۔ گداگر مانگتا ہی تو ہے! وہ ایسی چیز لینا چاہتا ہے جس کے لیے اس نے کسی قسم کی محنت مشقت نہیں کی اور جس پر اس کا کوئی استحقاق نہیں۔ رشوت خور بھی ایسی چیز کا مطالبہ کرتا ہے جس پر اس کا کوئی استحقاق نہیں اور جس کام کے لیے وہ مانگتا ہے اس کام کا معاوضہ وہ ہر مہینے تنخواہ کی صورت میں حکومت سے وصول کرتا ہے۔ گداگر لوگوں کی نیکی اور رحم کے جذبے سے فائدہ اٹھاتا ہے اور رشوت خور لوگوں کی مجبوریوں اور مشکلات سے۔

ع مانگنے والا گداگر ہے صدقہ مانگے یا خراج۔

ایسے معاشرے میں گیارہ بارہ سال کے بچے کی یہ صدق شعاری اور مظاہرۂ غیرت کوئی معمولی بات نہیں۔ جب اس سے پوچھا گیا تھا کہ پالش ولایتی تو نہیں؟ وہ بڑی آسانی سے کہہ سکتا تھا نہیں اور اس طرح دو آنے کما سکتا تھا، یا پھر جب اسے دونی دی جا رہی تھی تو وہ یہ خیال کر کے لے سکتا تھا کہ "مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے" لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور اپنی غیرت اور صدق شعاری پر آنچ نہ آنے دی ـــ اور یہ دونوں انسانیت کی وہ

متاعِ بے بہا ہیں کہ ان پر دنیا بھر کی دولت اور اس سے حاصل ہونے والے فوائد قربان کیے جا سکتے ہیں۔

اور اسلام نے تو انسانیت کی اس متاعِ بے بہا کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کی بطورِ خاص تعلیم دی ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ متاع ہاتھ سے جاتی رہے تو ایک مسلمان کی عظمت، اس کا وقار، اس کی خوبی، اس کا اخلاق اور اس کا کردار غرض ہر شے ہلاکت کے گھاٹ اتر جاتی ہے۔ انسان کی غیرت کشی میں بہت سے عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ آدمی محنت مزدوری سے جی چرائے اور دستِ سوال دراز کر کے گزر اوقات کرے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس معاشرے میں مبعوث ہوئے تھے اس میں دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اگر بے مزد مل جاتا تو اسے لوگ بڑے مزے سے قبول کر لیتے تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جس قسم کا معاشرہ وجود میں لانا چاہتے تھے اس کے لیے یہ بات سمِ قاتل تھی، چنانچہ حضورؐ نے مسلمانوں کو دامنِ سوال پھیلانے سے نہایت حکیمانہ انداز سے روکا اور جدّ و جہد اور محنت مشقت کر کے اپنا پیٹ پالنے اور اپنی ضروریات پوری کرنے کی ترغیب دی۔

حکیمؓ بن حزام کہتے ہیں میں نے ایک مرتبہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مال مانگا۔ آپؐ نے مجھے عطا کر دیا۔ میں نے دوبارہ سوال کیا۔ آپؐ نے پھر عطا فرما دیا۔ میں نے پھر دامنِ سوال پھیلایا۔ آپؐ نے میرا دامن پھر بھر دیا۔ بعد ازاں فرمایا، "اے حکیم! یہ مال بڑی ہی میٹھی شے ہے۔ جس نے اسے بغیر نفس کی طمع کے لیا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس میں برکت ڈال دے گا اور جس نے نفس کی حرص و طمع کے ساتھ اسے قبول کیا، اس کے لیے اس میں ذرا بھی برکت نہ ہوگی۔ اس کی مثال اس شخص کی سی ہوگی جو کھائے چلا جاتا ہے لیکن اس کا پیٹ بھرنے میں نہیں آتا اور اوپر والا ہاتھ نچلے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔

اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِنَ الْیَدِ السُّفْلٰی" یعنی دینے والا ہاتھ مانگنے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔ حکیمؓ کہتے ہیں، میں نے حضورؐ کی اس تلقین پر عرض کیا "اے اللہ کے رسولؐ! اس ذات پاک کی قسم جس نے آپؐ کو حق دے کر بھیجا ہے، میں آپؐ کے بعد کسی شخص سے مرتے دم تک کوئی شے نہیں مانگوں گا۔ چنانچہ وہ اپنے اس عہد پر دم آخر تک کاربند رہے اور کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلایا۔ یہاں تک کہ ابوبکر صدیق رضؓ نے جب مسلمانوں کے وظائف مقرر کیے تو آپ کو بلایا اور مقررہ وظیفہ دیا لیکن حکیمؓ نے لینے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمر فاروق رضؓ نے بھی اپنے عہد حکومت میں انہیں مال غنیمت میں سے ان کا حصہ دینا چاہا مگر آپ نے قبول نہ کیا۔ (بخاری و مسلم)

عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص مانگ کر زندگی گزارتا ہے۔ وہ جب بارگاہ الٰہی میں جائے گا تو اس کے چہرے پر گوشت نہ ہوگا۔ (بخاری و مسلم)

زبیرؓ بن عوام کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر تم میں سے کوئی شخص رسی لے کر پہاڑ پر جائے اور لکڑیوں کا گٹھا اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے اور فروخت کرے تو بہتر ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ اسے لوگوں کے آگے دامن پھیلانے سے بچالے گا جو ہو سکتا ہے کہ اسے دیں یا انکار کر دیں۔ (بخاری)

ایک اور حدیث میں مقداد بن معدیکربؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہاتھوں کی محنت مشقت سے کما کر کھانے والے سے بہتر کوئی شخص کھانا نہیں کھاتا اور اللہ کے نبی داؤدؑ اپنے ہاتھ کا کمایا ہوا کھاتے تھے۔ (بخاری)

لوگوں کے آگے دست سوال دراز کرنا بظاہر ایک معمولی بات دکھائی دیتی ہے لیکن اس کے اثرات و نتائج بڑے دور رس اور گہرے ہوتے ہیں۔ اس سے انسان

کی وہ تمام صلاحیتیں اور قوتیں ختم ہو جاتی ہیں جو اسے جدّو جہد پر اکساتی ہیں اور اس راہ میں پیش آمدہ مشکلات و مصائب اور رکاوٹوں سے جنگ آزما ہونے کے قابل بناتی ہیں۔ اس کی خودی اور غیرت کی تلوار کند ہو کر رہ جاتی ہے اور وہ ہر ذلت و رسوائی کو گوارا کرنے لگتا ہے۔ جن لوگوں کے آگے وہ ہاتھ پھیلاتا ہے ان کے سامنے اس کا سر ہمیشہ جھکا رہتا ہے اور نگاہیں اونچی نہیں کر سکتا۔ دوسرے لوگ بھی اسے نگاہِ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ معاشرے میں اس کا وقار گر جاتا ہے اور وہ معاشرے کا ایک غیور و باوقار فرد بننے کے بجائے راہ میں گرا پڑا روڑا اکنکر بن جاتا ہے جسے ہر شخص اپنے قدموں تلے پامال کرتا رہتا ہے۔

یہی بیماری جب اجتماعی رُوپ دھار لیتی ہے تو معاشرے سے اجتماعی طور پر کاہلی، بے فکری اور بے غیرتی کے وہی افعال سرزد ہوتے ہیں جو فرد میں محدود پیمانے پر پائے جاتے ہیں۔ ایسا معاشرہ اپنی زندگی اور بقا کے لیے خود جدّو جہد کرنے کے بجائے غیروں کا سہارا لیتا ہے۔ انہی کے آسرے پر اپنی زندگی کا لائحہ عمل تیار کرتا ہے وہ صرف روپے پیسے کا بھکاری بن کر نہیں رہتا۔ افکار و نظریات اور تہذیبی و تمدنی اصولوں کی بھی انہی سے دریوزہ گری کرتا ہے اور دنیا میں عزّت، وقار اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے کے لیے بھی انہی کی امداد کا محتاج ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اپنی خودی اور غیرت کا خود اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیتا ہے۔ دوسروں کے سہارے زندگی بسر کرنے والے افراد کا دنیا میں جو مقام و احترام ہوتا ہے وہی مقام و احترام دریوزہ گر قوم کا ہوتا ہے۔ اغیار اسے اپنے مقاصد کا آلۂ کار بناتے ہیں، اس کا استحصال کرتے ہیں، اس کے بیٹوں کو قتل اور اس کی بیٹیوں کو رسوا کرتے ہیں اور ذلّت و نکبت کا جُوا اس کی گردن میں ڈال دیتے ہیں۔ غیرت کھو جائے تو وہی حشر ہوتا ہے جو تیمور کے گھرانے کا غلام قادر روہیلہ کے ہاتھوں ہوا اور یہ تیغ خودی ہاتھ میں ہے تو قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں تہی دست بدوؤں کے

آگے سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ اقبالؒ نے خوب کہا ہے : ؎

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صدق شعاری کو اپنانے اور دروغ گوئی سے اجتناب کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ کیونکہ صدق شعاری انسان کے کردار کو عیوب اور برائیوں سے پاک کرتی، اس کے اخلاق کو جلا دیتی اور قوی و جمیل بناتی ہے، اس کے دل میں حق کی راہ پر گامزن ہونے، اس پر جم جانے اور اس کی خاطر مر مٹنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے، اس کے ظاہر و باطن کو یک رنگ بناتی اور زندگی میں وہ کشش پیدا کرتی ہے کہ دل بے اختیار اس کی طرف کھنچتے ہیں۔ اس کے برعکس کذب و دروغ انسان کے کردار کو بگاڑتا اور کمزور کرتا ہے۔ اس سے اخلاقی محاسن چھین لیتا ہے، اسے بدی کی راہ پر کشاں کشاں لے جاتا ہے، اس کے دل میں نفاق کا روگ پیدا کرتا ہے اور اسے اپنوں اور پرایوں کے اعتماد سے محروم کر دیتا ہے۔

صدق شعاری اور دروغ گوئی انسان کی نفسیات پر گہرا اثر ڈالتے ہیں اور اس اثر کو اس کی زندگی میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ زندگی اور اس کے تقاضوں کے بارے میں انسان کے رویوں کو اپنے اپنے خاص انداز میں ڈھال دیتے ہیں۔ کردار کی پختگی اور خامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ انسان سچائی کو کس قدر عزیز رکھتا اور جھوٹ سے کتنا گریزاں ہے۔ صداقت پر استوار زندگی چٹان کی طرح مستحکم، ناقابلِ تسخیر، قلبی و ذہنی یکسوئی اور نیکیوں کا مرقع ہوتی ہے۔ جھوٹ بولنے والا شخص اندر سے کھوکھلا ہوتا ہے اور کبھی کسی معاملے میں مضبوط موقف اختیار نہیں کر سکتا۔ یہ ایسی برائی ہے جو بیسیوں سنگین برائیوں کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی انہی حقائق کی طرف

رہنمائی فرماتا ہے:

إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حتى يكتب عند الله صديقا وان الكذب يهدى الى الفجور وان الفجور يهدى الى النار وان الرجل ليكذب حتى يكتب عند الله كذابا (متفق عليه) صدق شعاری بلاشبہ انسان کو نیکی کی راہ پر لے جاتی ہے اور نیکی کی راہ جنّت تک پہنچاتی ہے اور انسان سچ کو زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنا لیتا ہے تو اس کا یقینی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا نام صدّیق لکھ دیا جاتا ہے اور بلاشبہ جھوٹ انسان کو برائیوں کی طرف لے جاتا ہے اور برائیاں اسے جہنّم میں جاگراتی ہیں اور بے شک انسان جھوٹ پر جھوٹ بولتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا جھوٹا قرار پا جاتا ہے۔ ایک اور حدیث میں ہے:

دع ما يريبك الى ما لا يريبك فان الصدق طمانية والكذب ريبة ۔ اس بات کو چھوڑ دے جو طمانیت بخش نہیں اور اس بات کو اپنا لے جو شک و ریب سے پاک ہو۔ اس لیے کہ صدق شعاری دل و دماغ کو طمانینت سے بھر دیتی ہے اور جھوٹ شک و ریب کے کانٹوں سے۔

شک و ریب اور قلب و ذہن کا عدمِ اطمینان انسان کو نفسیاتی طور پر جس طرح ناکارہ اور توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے اس کا اندازہ ان معاشروں کا جائزہ لینے سے کیا جا سکتا ہے جو اس کائنات اور اس کے خالق و مالک ہی کے بارے میں شک و ریب کا شکار نہیں ہیں بلکہ خود اپنے وجود اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کی ودیعت کردہ صلاحیتوں پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے۔ قلبی و روحانی بے اطمینانی اور یکسوئی سے محرومی اسے اخلاقی انتشار اور ذہنی خلفشار کی طرف دھکیل دیتی ہے جو آخر کار ذہنی شکستگی پر منتج ہوتی ہے۔ مغربی ممالک میں نفسیاتی امراض جس طرح وبائی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں ان کا بنیادی سبب یہی قلبی بے اطمینانی اور ذہنی انتشار ہے۔ (۲۱ فروری ۱۹۶۰ء)

جب ضمیر بیدار ہوتا ہے

کراچی کی ایک عدالت جمی ہوئی تھی۔ فاضل مجسٹریٹ مقدمات کی سماعت کر رہے تھے کہ جانی نامی ایک نوجوان کمرہ عدالت میں داخل ہوا۔ اس نے ایک چاقو مجسٹریٹ کی میز پر رکھا اور عدالت سے درخواست کی کہ وہ اس کے گناہوں کی داستان سنے۔ فاضل مجسٹریٹ نے نوجوان پر نظر ڈالی۔ وہ تقریباً پچیس برس کا لحیم شحیم نوجوان تھا۔ آنکھیں ستی ہوئی اور پریشان تھیں جیسے انہیں کئی روز سے سونا نصیب نہ ہوا ہو۔ وضع وہیئت سے وہ ایک عادی مجرم نظر آتا تھا، لیکن چہرے سے ندامت اور اضطراب کے آثار ہویدا تھے۔ فاضل مجسٹریٹ نے پُر وقار آواز میں کہا۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ اس نے اپنی داستان سناتے ہوئے کہا میں ایک گنہ گار مجرم ہوں۔ میں نے بے شمار مظلوموں کو شکار بنایا اور ان کا خون چوسا ہے، لیکن اب میرا ضمیر جاگ اٹھا ہے۔ میں اپنے گناہوں پر سخت نادم و شرمسار ہوں اور عدالت سے میری مؤدبانہ التجا ہے کہ میرے ان ہاتھوں کو کٹوا دے جن سے میں مکروہ کاموں میں حصّہ لیتا رہا ہوں یا مجھے گولی مار دی جائے۔ جانی نے عدالت کو مزید بتایا کہ میں نے بہت سے جرائم کا ارتکاب کیا ہے اور ان کی پاداش میں کئی بار جیل جا چکا ہوں۔ گزشتہ جون میں آخری بار جیل سے رہا ہوا تھا۔ رہا ہونے کے بعد میں نے اپنا دھندا پھر شروع کر دیا۔ کوئی پانچ روز پہلے کی بات ہے، میں نے ایک آدمی کی جیب کاٹی اور جو رقم ہاتھ آئی اسے نیپیئر روڈ پر جا کر شراب

وکباب میں اڑا دیا۔ وہاں سے میں کسی اور شکار کی تلاش میں دوبارہ لی مارکیٹ گیا تو میں نے دیکھا ایک جگہ بہت سے لوگ جمع ہیں۔ میں نے اُن لوگوں کے درمیان دیکھا کہ وہی شخص زار و قطار رو رہا ہے جس کی میں نے کچھ دیر پہلے جیب کاٹی تھی۔ وہ رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میرا بچّہ مر گیا ہے اس کی لاش گھر پر پڑی ہے۔ میں اپنے بچّے کا کفن خریدنے آیا تھا لیکن کسی نے میری جیب سے پچیس روپے نکال لیے۔ اب مُردہ بچے کی تجہیز و تکفین کیسے ہوگی؟ اس مظلوم شخص کی یہ کیفیت دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ میرے ضمیر نے مجھے ملامت کی۔ چنانچہ میں اس شخص کے پاؤں پر گر پڑا۔ میں نے اس کو بتایا کہ وہ بدبخت میں ہی ہوں، جس نے تمہاری جیب کاٹی تھی، اس سے معافی مانگی اور درخواست کی کہ مجھے جو چاہے سزا دے لے۔ لیکن اس بندۂ خدا نے صبر سے کام لیا۔ مجھے معاف کر دیا اور لوگوں سے کہا کہ اس سے کوئی تعرّض نہ کریں۔ اس کی یہی سزا کافی ہے۔ اس مردِ خدا نے مجھے دعا بھی دی کہ جا خدا تیرا بھلا کرے۔ جانے کو تو میں اپنے گھر چلا گیا۔ لیکن میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ مجھے کسی طرح چین نہیں آ رہا میرا ضمیر مجھے ہر وقت ملامت کرتا رہتا ہے۔ چار راتوں سے تو میں بالکل نہیں سو سکا۔ نہ کچھ کھانے ہی کو جی چاہتا ہے اور اب میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے میرے گناہوں کی سزا ملنی چاہیئے۔ اسی صورت مجھے چین آئے گا میں اپنے لیے یہی سزا تجویز کرتا ہوں کہ میرے دونوں ہاتھ کاٹ دیے جائیں یا مجھے گولی مار دی جائے۔

جانی اپنی داستان سنا رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ داستان ختم ہو جانے کے بعد فاضل مجسٹریٹ نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔

پولیس تو جانی کے خلاف مقدمہ دائر کرے گی اور مروجہ قوانین کے تحت اسے کسی عدالت سے چند سال کی سزا ہو جائے گی جو جانی کی اپنی تجویز کردہ سزا کے مقابلے میں کچھ

بھی نہ ہوگی لیکن یہاں قابلِ ذکر بات یہ نہیں کہ اسے کتنی سزا ملتی ہے بلکہ یہ ہے کہ ضمیر جب بیدار ہوتا ہے تو وہ انسان کے اندر کتنا زبردست انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ وہی شخص جو جرائم میں ڈوب کر اور سزاؤں پر سزائیں کاٹ کر بھی احساس نہیں کر پاتا کہ وہ کیسی ملامت آمیز اور شرمناک زندگی گزار رہا ہے، خلقِ خدا کے لیے اس کا وجود کتنا باعثِ اذیت بن چکا ہے، لوگ اس کے ہاتھوں کس طرح دکھ جھیل رہے ہیں، لیکن جونہی ایک واقعہ اس کے سوئے ہوئے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اس کی وہی زندگی، جسے وہ گناہوں کی گندگی میں ڈوب کر بھی عیش و مسرت کے نغموں میں مست گزار رہا تھا اس پر اجیرن ہو جاتی ہے، راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے، دنوں کا چین جاتا رہتا ہے اور کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے۔ اس کا ضمیر اسے بار بار کہتا ہے تجھے اپنے گناہوں کی سزا ملنی چاہیئے۔ پوری کی پوری سزا۔ اور وہ اسے بالآخر عدالت کے کٹہرے میں کشاں کشاں لا کھڑا کرتا ہے۔ وہ شخص جو ارتکابِ جرم کے بعد فرار ہو جانے کا عادی تھا اور پکڑے جانے پر جھوٹ بول کر جرم سے انکار کر کے اور اپنی بے گناہی کا ثبوت دے کر قانون کے شکنجے سے چھوٹ جانے کی کوشش کرتا تھا اب خود بخود عدالت میں حاضر ہو جاتا ہے۔ اپنے گناہوں کا آپ اقرار کرتا ہے اور اپنی سزا خود تجویز کرتا ہے۔ اسے جن جرائم سے قانون باز نہ رکھ سکا تھا، عدالتوں کے فیصلے اور قید و بند کی سزائیں نہ روک سکی تھیں، بلکہ ہر سزا کے بعد ذوقِ جرم اور جوان ہو جاتا تھا ضمیر کی ملامت اسے ان جرائم سے روک دیتی ہے اور اس کی زندگی کی کایا پلٹ ہو جاتی ہے۔ ضمیر کو قرآن پاک اور احادیث میں قلب کے نام سے پکارا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا ہی حقیقت و ایمان افروز ارشاد ہے کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ سنورا رہے تو سارا جسم سنورا رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے اور وہ قلب ہے۔ ان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب (متفق علیہ)

ضمیر جب اصلاح یافتہ ہوتا ہے تو انسان کے اعمال و افعال اور سیرت و کردار بھی اصلاح یافتہ ہوتے ہیں، لیکن جب ضمیر بگڑا ہوا ہو تو کوئی بھی سزا اور خوف انسان کی سیرت و کردار کو بگاڑنے سے روک نہیں سکتا۔

قلب و ضمیر کی یہی زبردست اہمیت ہے جس کی بنا پر اسلام نے جو دینِ فطرت ہے، اسے سنوارنے اور بگاڑ سے بچانے کی پوری تدابیر اختیار کی ہیں، چنانچہ اس نے خدا خوفی، آخرت کا احساس، اخلاقی و معاشرتی ذمّہ داریوں کا شعور پیدا کرنے پر اسلامی قانون کے نفاذ سے کچھ کم زور نہیں دیا۔ بلکہ زیادہ صحیح معنوں میں اسلامی قانون و نظام کے ٹھیک طور پر نافذ ہونے کا انحصار ہی اس پر ہے کہ معاشرہ کی سیرت و کردار اخلاقی اقدار پر قائم ہو۔ اسلام انسان کے قلب و ضمیر کو مصفّٰی، روشن و بیدار اور خوفِ خدا اور آخرت کی جوابدہی کے احساس سے بھر دینا چاہتا ہے تاکہ مسلمان معاشرہ جرائم، بدعنوانیوں اور مفاسدُ رذائم سے پاک رہے اور اگر کسی سے کوئی جرم و خطا سرزد بھی ہو جائے تو مجرم اس پر پردہ ڈالنے کے بجائے خود آکر اس کا اعتراف کرے اور التجا کرے کہ اس پر حد جاری کر کے مرتکبِ جرم کی آلائشوں سے پاک کر دیا جائے۔

ماعز بن مالک اسلمیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ اے اللہ کے رسولؐ! مجھ سے زنا کا ارتکاب ہو گیا ہے، مجھے پاک کر دیجیے۔ حضورؐ اپنا رخِ انور دوسری طرف موڑ لیتے ہیں۔ یہ پھر آگے بڑھ کر اپنے جرم کا اعتراف اور حد جاری کرنے کی استدعا کرتے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پھر بے اعتنائی سے کام لیتے ہیں، مگر یہ اپنے اقرارِ جرم اور تعزیر کے نفاذ پر مُصر ہیں۔ یہاں تک کہ جب چار مرتبہ اقرار کر لیتے ہیں تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں سنگسار کرنے کا حکم دے دیتے ہیں۔

اسی طرح غامد قبیلے کی ایک عورت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر

ہوتی ہے اور حرام کاری کے ارتکاب کا اقرار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ اس پر حد جاری کی جائے ساتھ ہی بتاتی ہے کہ وہ اس حرام کاری سے حاملہ ہو چکی ہے۔ آنحضورؐ اسے واپس بھیج دیتے ہیں کہ بچّہ پیدا ہو لے تو آنا۔ بچّہ پیدا ہو جاتا ہے تو اسے گود میں اٹھائے پھر خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتی ہے اور حد کے نفاذ کا مطالبہ کرتی ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں ابھی جاؤ اس بچّے کو دودھ پلاؤ، جب دودھ چھڑا لو اور یہ روٹی کھانے لگے تو آنا۔ غامدیہ چلی جاتی ہے اور ڈیڑھ دو سال گزرنے کے بعد پھر حاضر ہوتی ہے۔ بچّہ اس کی گود میں ہے اور روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں جسے وہ کھا رہا ہے۔ کہتی ہے —— اے اللہ کے رسولؐ! اب تو یہ روٹی کھانے لگا ہے میں حاضر ہوں، مجھے اس گناہ سے پاک کر دیجئے۔

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اسے سنگسار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ حضرت خالدؓ کی زبان سے اس عورت کے متعلق کچھ اہانت آمیز بات نکل جاتی ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم فرماتے ہیں اس عورت نے اس طرح توبہ کی ہے کہ اگر اسے بانٹ دیا جائے تو روئے زمین کا ہر آدمی اس سے فیض یاب ہو سکتا ہے (او کما قال)

یہ ہے ضمیر کی بیداری، خدا خوفی اور آخرت کی جواب دہی کے احساس کا ثمرہ!

(۱۷ دسمبر ۱۹۵۹ء)

اصلاح کا سرچشمہ

فرانس میں جو عیش و عشرت کا گہوارہ ہے اور جہاں شراب بلا مبالغہ پانی (مشروبات) سے ارزاں ہے اور شراب نوشی وہاں کے لوگوں کی گھٹی میں پڑ چکی ہے، جنرل ڈیگال کی حکومت نے امتناع شراب کی طرف ابتدائی قدم اٹھائے ہیں۔ چودہ سال تک کے بچوں کے لیے شراب نوشی کو حرام اور ممنوع قرار دے دیا ہے، فی ہزار باشندوں پر میکدوں کی تعداد کم کر دی ہے، شراب خانوں کے لائسنس بھی گھٹا دیے ہیں پہلے مزدوری اور تنخواہوں کا ایک حصّہ شراب کی صورت میں ملا کرتا تھا اب اس پر بھی پابندی لگا دی ہے، اعلان کیا ہے کہ اگلے برسوں میں مزید اقدامات کیے جائیں گے۔ شراب کی پیداوار اور شراب نوشی کا دائرہ اور محدود کر دیا جائے گا اور اس طرح بتدریج شراب پر مکمّل پابندی عائد کر دی جائے گی۔

فرانس میں امتناع شراب کی یہ کوئی پہلی کوشش نہیں۔ شراب خوری سے فرانسیسی معاشرے پر جو تباہ کن اثرات مرتّب ہو رہے ہیں، ان کے پیش نظر پہلے بھی حکومتیں ایسی سعی کر چکی ہیں، مگر انہیں ناکامی سے دوچار ہونا پڑا۔ اب بعض حلقوں میں توقع کی جا رہی ہے کہ جس مقصد میں ان کے پیشرو ناکام رہے تھے، جنرل ڈیگال کامیاب و کامران رہیں گے۔ اس کا سبب وہ یہ بتاتے ہیں کہ پہلی حکومتیں اپنے قیام اور زندگی کے لیے پارلیمنٹ اور عوامی ووٹوں کی مرہون منّت ہوا کرتی تھیں۔ جو نہی وہ اس مقصد کے

لیے اقدام کریں، شراب کے رسیا ارکانِ پارلیمنٹ اور عوامی ووٹوں پر اثر انداز ہونے والے عناصر ان کا تختہ الٹ دیتے۔ اب جنرل ڈیگال آمرِ مطلق ہیں، ان کی حکومت کی زندگی پارلیمنٹ کی محتاج نہیں، رہے عوام کے ووٹ! تو وہ بالواسطہ انتخابات کے ذریعے بے اثر ہو چکے ہیں۔ ممکن ہے کہ وہ درست کہتے ہوں۔ جنرل ڈیگال اپنی "جمہوری آمریت" کے بل پر امتناعِ شراب کی یہ مہم بظاہر سَر کر لیں، لیکن اس سے یہ سمجھنا کہ دخترِ رز کے عشاق فرانسیسی اپنے عشق کو بالکل ہی خیرباد کہہ دیں گے اور اپنی محبتوں کی مرکز لال پری سے متنفر ہو جائیں گے، تو یہ محض ایک خوش گمانی اور حسین غلط فہمی کے سوا کچھ نہیں۔

انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ قانونی جبر کو کبھی خوش دلی سے گوارا نہیں کرتی۔ وہ اس کے آگے بےبس ہو کر سر تو جھکا دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ اپنے آپ کو کبھی ہم آہنگ نہیں کرتی اور بغاوت کرنے کے اوّلین موقع کی منتظر رہتی ہے۔ جس لمحے یہ موقع ملتا ہے وہ اس قانونی جبر کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکتی ہے اور اس جبر کے ردِّعمل میں پہلے سے زیادہ خودسر ہو جاتی ہے۔ یہی نہیں وہ اس دور میں بھی جبکہ قانونی جبر اس پر مسلّط ہوتا ہے، عقلِ عیّار کے ساتھ مل کر اپنے جذبات کی تسکین اور عادات کی سرخوشی کے لیے نئی نئی راہیں نکالتی ہے اور اس کے اندر قانون سے گریز اور سرکشی کا جذبہ پرورش پانے لگتا ہے۔ جنرل ڈیگال چاہے کتنی ہی تدریج کے ساتھ امتناعِ شراب کی طرف قدم بڑھائیں، فرانسیسیوں کے منہ سے لگی ہوئی اس کافر کا چھٹنا محال ہے۔ وہ قانون کے جبر سے ایک راستہ بند کریں گے، شراب کے رسیا اپنے ذوقِ بادہ نوشی کی تسکین کے لیے بیسیوں نئے راستے تراش لیں گے۔ وہ ایک میکدے کو تالا لگائیں گے اور زیرِ زمیں درجنوں نئے میکدے کھل جائیں گے۔ وہ شراب کی علانیہ کشید پر پابندی عائد کریں گے اور فرانس کا ہر گھر خانہ ساز شراب کی بھٹی بن جائے گا۔ امتناعِ شراب کا قانون مذاق بن جائے گا اور فرانس کے بزرگی کو جے کی وہ کیفیت ہو گی جو ریاض خیرآبادی نے

کبھی اپنی بیان کی تھی: ؎

جامِ مے توبہ شکن توبہ مری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

اور یہ کچھ قانونی جبر ہی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ انسان کے قلب و نظر اور انداز فکر و عمل کو اگر نہ بدلا جائے، زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر میں تبدیلی نہ آئے اور بدی اور برائی کے پیمانے جوں کے توں رہیں تو چاہے آپ آمریت کا سہارا لینے کے بجائے جمہوری طور طریقوں ہی سے کسی بُرائی کو روکنے اور اس کا انسداد کرنے کی جدو جہد کریں اور اس راہ میں اپنی ساری صلاحیتیں اور حکومتی وسائل جھونک دیں، کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ تقریباً چالیس برس پہلے امریکہ نے بھی امتناعِ شراب کا قانون نافذ کیا تھا اور ریاست ہائے متحدہ کے حدود میں شراب کی ساخت پرداخت، خرید و فروخت اور درآمد برآمد ممنوع قرار دے دی تھی۔ قانون کو کامیابی سے ہم کنار کرنے کے لیے ایک طرف قید و بند اور جرمانوں کی سزا رکھی گئی، دوسری طرف امریکی حکومت نے جمہوری بنیادوں پر ان تمام وسائل سے کام لیا جو اس کے قبضے میں تھے۔ نفاذِ قانون سے کئی برس پہلے رسالوں اور اخبارات، تقریروں، تصویروں، "طلسمی لالٹینوں" اور موبائل غرض اس وقت تک انسان پروپیگنڈے کے جن وسائل سے بہرہ یاب ہو چکا تھا، ان سب کے ذریعے شراب نوشی کے خلاف مہم چلائی گئی، اس کی تباہ کاریاں اور مضرتیں عوام کے ذہنوں میں بٹھائی گئیں۔ نشر و اشاعت کی اس مہم پر نفاذِ قانون تک ساڑھے چھ کروڑ ڈالر اٹھ گئے اور شراب کے خلاف جو لٹریچر شائع ہوا اس کے صفحات ۹۔۱ ارب تک پہنچ گئے۔ اتنی تبلیغی جدوجہد اور اصلاحی کوششوں کے بعد قانونِ امتناع، کانگریس اور سینیٹ دونوں نے بڑے جوش و خروش اور مسرت سے

منظور کر کے نافذ کیا، مگر اس کا نتیجہ جبری قانون کے نفاذ سے کچھ مختلف نہ نکلا۔ لائسنس یافتہ میکدے بند ہوتے ہی ملک بھر میں لاکھوں خفیہ شراب خانے کھل گئے اور ان کی تعداد نفاذِ قانون سے پہلے کے لائسنس یافتہ شراب خانوں سے کئی گنا بڑھ گئی۔ خفیہ بھٹیوں میں مضرِ صحت شرابیں کشید ہونے لگیں۔ شراب کی خرید و فروخت کی نئی نئی راہیں نکالی گئیں اور نئے نئے طریقے اپنائے گئے اور یہ مہلک کاروبار شہروں سے لے کر دیہات تک پھیل گیا اور اس کاروبار میں ہاتھ رنگنے والوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔ قانون کا خوف و احترام دلوں سے جاتا رہا۔ شراب نوشوں کی تعداد میں پریشان کن حد تک اضافہ ہو گیا۔ شراب خوری کے اثرات لوگوں کی صحت، اخلاق اور معاشرے کے عمل و کردار پر پہلے سے کہیں زیادہ تباہ کن صورت اختیار کر گئے۔ شرحِ اموات اور جرائم میں اضافہ ہو گیا۔ حکومت نے ان برائیوں کو روکنے کی جو تدابیر بھی کیں، ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ چنانچہ چودہ برس کے بعد محتسبین یہ رنگ دیکھ کر توبہ شکنی کی اجازت دینے پر مجبور ہو گئے۔ قانونِ امتناعِ شراب منسوخ کر دیا گیا اور پورا ملک رندوں کے نعرہ ہائے مسرت سے گونج اٹھا۔ ؎

فتویٰ دیا ہے مفتیٔ ابرِ بہار نے

توبہ کا خون بادہ کشوں کو حلال ہے

وقت خود بتا دے گا کہ فرانس کے قانونِ امتناعِ شراب کا حشر اس سے کچھ مختلف نہیں ہوا۔

اصل میں محض قانون کے ذریعے کسی انسانی گروہ یا معاشرے کو برائیوں سے پاک نہیں کیا جا سکتا خواہ وہ قانون انسان پر جبراً مسلط کیا جائے یا اس کے ثمرات اور منفعتوں کی تبلیغ و اشاعت کے بعد، لوگوں کو اطاعت پر آمادہ کر کے ان کی رائے سے نافذ ہو۔

قانون نہ تنہا کسی معاشرے کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ برائیوں سے پاک کسی معاشرے کے ارد گرد ایک ایسا حصار قائم کر دے جس کے اندر باہر سے کوئی برائی داخل نہ ہونے پائے، اس معاشرے کے افراد پر کڑی نظر رکھے، ان کے اندر برائیوں کو ابھرنے اور جڑ پکڑنے نہ دے اور انہیں نیکی کی راہ پر چلنے اور پاکیزہ پُرامن زندگی بسر کرنے میں مدد دے۔ انسانی معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کا انسداد اور اس کے افراد کی اصلاح قانون کے ذریعے نہیں زندگی کے بارے میں فکر و نظر کی تبدیلی ہی سے ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی معاشرہ زندگی کے متعلق یہ نظریہ رکھتا ہے کہ جو کچھ ہے یہی دنیا کی زندگی ہے اور مر کر انسان کو مٹی میں مل جانا ہے، پھر وہ نہ تو زندہ ہوگا اور نہ اسے کسی بالاتر ذات کے آگے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہوگی تو چاہے آپ اس معاشرے میں کتنی ہی اصلاحی جدوجہد کرتے رہیں، تبلیغ و اشاعت سے کام لیں، کسی برائی کے مضرات واضح کریں اور قانونی جبر کو حرکت میں لے آئیں، اس معاشرے کی نہ تو اصلاح ہوگی اور نہ اس میں پائی جانے والی برائیوں کا انسداد ہوگا۔

اس کے برعکس جب ایک معاشرے کا نقطۂ نظر یہ ہو کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے، جس میں انسان کو اپنے خالق و آقا کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے ایک ایک عمل کا جواب دینا اور اعمال نامے کے مطابق ثواب و عذاب سے بہرہ ور ہونا ہے تو وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں پائی جانے والی برائیوں کا احتساب اسی نقطۂ نظر سے کرے گا۔ وہ برائیوں سے بچنے بچانے اور نیکیوں کو اپنانے اور پھیلانے کی سعی کریگا۔ اور زندگی کا یہ نقطۂ نظر اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے بغیر نہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے مطلوبہ نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام انسانی معاشرے کی اصلاح کی بنیاد اللہ تعالیٰ، اس کے رسولؐ اور اس کی کتاب ہدایت پر ایمان لانے پر رکھتا ہے۔ یہ ایمان پورے شعور کے

ساتھ ایمان لانے پر انسان کا زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر اور رویّہ آپ سے آپ بدل جاتا ہے اور زندگی پر مثبت اور صحت مند اثرات مرتب ہونے لگتے ہیں وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (محمد - ۲) (اور جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اور اس کتاب ہدایت پر ایمان لائے جو محمدؐ پہ نازل ہوئی ہے اور جو سراسر حق اور ان کے رب کی طرف سے ہے، اللہ نے ان کی زندگی پر غیر صحتمند اثرات ڈالنے والی برائیاں دُور کر دیں اور ان کی حالت سنوار دی) - پھر جب اللہ اور رسولؐ اسے کوئی حکم دیتے ہیں تو وہ بے چون وچرا اس حکم کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا ہے کہ ایمان کا تقاضا بھی ہے - وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (الانفال - ۱) اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو - کسی حکم کو تسلیم کرنے میں ذرا سا بھی تذبذب اور دل تنگی اسے ایمان سے محروم کر دیتی ہے - فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النسآء ۶۵) آپ کے رب کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے - جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں آپؐ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر آپؐ جو کچھ فیصلہ کریں اس پہ اپنے دل میں ذرا بھی تنگی محسوس نہ کریں اور اس فیصلے کے آگے بے چون وچرا سر تسلیم خم کر دیں -

قلب و ذہن کی دنیا میں یہ انقلاب ایک مرتبہ آجاتا ہے تو پھر انسان کے آگے نہ کسی برائی کے مضرات اور نیکی کے فوائد بیان کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اسے قانون کا خوف دلانے کی حاجت - برائی خود بخود دل میں کھٹکنے لگتی ہے اور آدمی محض ایک حکم پر اسے ترک دیتا ہے - اس کی سورج کی طرح روشن و درخشاں مثال اللہ و رسولؐ پر ایمان کی بنیادوں پہ قائم ہونے والے مدینے کے معاشرے سے ملتی ہے جس میں امتناع شراب کی نہ کوئی لمبی چوڑی مہم چلائی گئی تھی نہ شراب میں پوشیدہ مضرتوں سے خوف دلایا گیا تھا نہ اس پر لمبی چوڑی کتابیں

لکھی گئیں اور نہ فصیح و بلیغ خطبے دیے گئے۔ ایمان دلوں میں گھر کر گیا تو اس برائی کا احساس آپ سے آپ ہونے لگا۔ یہ سوال رہ رہ کر پریشان کرنے لگا، کہ ایمان کے ساتھ ساتھ یہ برائی چل سکتی ہے یا نہیں۔ اس میں ہمارے لیے نفع ہے یا مضرت۔ یہ احساس جب پیدا ہو گیا تو پھر بس چند آیات مختصر سے وقفے سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئیں جو اہلِ ایمان کو پڑھ کر سنا دی گئیں اور یہ معاشرہ، شراب جس کی گھٹی میں پڑی تھی، بغیر کسی تگ و دو اور فلسفہ طرازی اور پروپیگنڈے کے امتناعِ شراب کی طرف بتدریج قدم بڑھاتا چلا گیا۔

پہلی مرتبہ اس کے سامنے محض شراب کے اچھے اور برے پہلو لائے جاتے ہیں، ارشادِ ربانی پڑھ کر سنا دیا جاتا ہے۔

یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ط (البقرہ - ۲۱۹) لوگ پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے۔ کہہ دیجئے ان دونوں چیزوں میں بڑی ہی خرابی ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔

دوسری مرتبہ نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ...... (النساء ۴۳) اے ایمان والو جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہیئے جب تم یہ جان سکو کہ اپنی زبان سے کیا نکال رہے ہو۔"

اور پھر آخری حکم نازل کر دیا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ ۝ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ (المائدہ ۹۰-۹۲) اے ایمان والو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور یہ پانسے، سب شیطان کے گندے کام ہیں ان سے پرہیز کرو تاکہ تم فلاح سے بہرہ ور ہو سکو۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان بغض اور عداوت ڈال دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی فرماں برداری کرو اور باز آجاؤ، لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسول پر تو صرف یہ ذمہ داری ہے کہ تمہیں صاف صاف (خدا کا) حکم پہنچا دے۔

یہ تھے وہ تین تدریجی مرحلے، جن سے شراب کو حرام قرار دینے تک اس معاشرے کو گزرنا پڑا۔ پہلے مرحلے میں یہ بات ذہن نشین کی گئی کہ شراب اپنے دامن میں فوائد تھوڑے اور تباہی کا سامان بہت زیادہ رکھتی ہے جس فصل کا حاصل کانٹے ہی کانٹے ہوں اس کی کاشت اور پرورش میں ایک مسلمان اپنی زندگی کیوں ضائع کر سکتا ہے؟ چنانچہ پہلے ہی مرحلے پر کتنے ہی لوگوں نے اس مہلک شغل سے توبہ کر لی۔ دوسرے مرحلے میں شراب نوشی کے اوقات محدود کر دیے گئے۔ دن رات میں پانچ نمازیں پڑھنا ہوتی تھیں اور ہر نماز کے لیے ضروری تھا کہ آدمی اپنے ہوش و حواس میں ہو، نشے میں بہکا ہوا نہ ہو۔ اس طرح شراب نوشی میں احتیاط برتی جانے لگی ـــــ اور جب تیسرے مرحلے میں آخری حکم نازل ہوا، تو لوگ شراب سے اس طرح مجتنب ہو گئے گویا وہ کبھی اس کے عادی ہی نہ تھے

اس حکم کو جس شخص نے جس حالت میں سنا، اس نے شراب نوشی سے ہاتھ اٹھا لیا۔ ایک محفل میں ساغر و مینا کا دور چل رہا تھا۔ ناگاہ پکارنے والے نے کہا اللہ نے شراب حرام کردی اور اس سلسلے میں جو آیت نازل ہوئی، وہ پڑھ کر سنائی۔ بس ہاتھ وہیں رک گئے۔ حلق میں پہنچی ہوئی شراب تھوک دی، شراب کے برتن توڑ ڈالے۔ اس روز مدینہ کی گلیوں میں شراب بارش کے پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔

پھر یہ اجتناب کوئی وقتی نہ تھا، بلکہ اتنا مستقل کہ صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی گئیں لیکن مسلمانوں کی سوسائٹی میں (علانیہ کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا) کبھی خفیہ میکدے بھی قائم نہ ہوئے۔ مسلمان ملکوں میں غیر مسلم خصوصاً یہودی پوشیدہ شراب بناتے تھے۔ (چنانچہ اسی مناسبت سے شراب کے لیے شرب الیہود کی اصطلاح رائج ہو گئی تھی) بعض بگڑے ہوئے مسلمان چوری چھپے انہی شراب خانوں سے لے کر پیتے بھی تھے۔ دینی اور اخلاقی گرفت کمزور پڑ گئی تو حکمرانوں اور اُمرا و اعیانِ سلطنت اور اونچے طبقے میں بھی کچھ لوگ اس اُم الخبائث کے رسیا پیدا ہو گئے، تاہم یہ لعنت ہر دور میں محدود ہی رہی۔ امت نے بحیثیت مجموعی اسے کبھی قبول نہیں کیا اور وہ صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی جو یورپ اور امریکہ کے مہذب معاشروں میں پائی جاتی ہے کہ اوپر سے لے کر نیچے تک یہ لعنت سرایت کر چکی ہے اور مرد ہی نہیں عورتیں اور بچے تک اس کا شغل رکھتے ہیں ___ اور یہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان ہی کا اثر ہے کہ آج بھی جبکہ مشرق و مغرب ہر غیر مسلم معاشرے میں شراب خوری عام ہو چکی ہے یہی وہ واحد معاشرہ ہے جس میں کسی قانونی جبر کے بغیر شراب کو آج بھی حرام سمجھا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کم ہے جو اس اُم الخبائث سے شوق رکھتے ہیں اور یہ بھی زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کا اللہ اس کے رسولؐ اور آخرت پر ایمان کھوکھلا ہو چکا ہے جو مغربی تہذیب کے شیدائی اور اس کی ہر برائی کو ترقی کے نام پر لپک کر قبول کر ڈالتے ہیں جو اپنے اسلام و ایمان کو قصۂ ماضی سمجھتے ہیں۔

(۲۰ نومبر ۱۹۹۰ء)

غیرت بڑی چیز ہے.....

ہمارے پڑوس میں کئی روز سے شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ادھر رات کی سیاہی دنیا پر سایہ فگن ہوتی ہے۔ اُدھر ڈھولک کی تھاپ پر گیت گونجنے لگتے ہیں۔ گانے والیاں نوخیز لڑکیاں ہیں اور گیت عموماً فلمی ہوتے ہیں۔ ایسے گیت کہ ہم میاں بیوی اپنی بچیوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں تو آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں اور یہ سوچ کر پریشان ہو جاتے ہیں کہ ان کے معصوم ذہنوں پر فحش گیت کہیں بُرے اثرات ثبت نہ کر دیں۔ ایک رات ڈھولک کی تھاپ اور گیتوں کے زیر و بم کے ساتھ گھنگھرو بجنے کی آواز آئی۔ میری بیوی نے دیکھا تو پتہ چلا کہ دولہا کی ایک ہشت سالہ عم زاد بہن رقص کر رہی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب رقص اور نغمہ پاتریوں اور کنچنیوں کا پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ شریف گھرانوں کی کنواری لڑکیاں ہی نہیں شادی شدہ عورتیں تک ان کا تصور نہیں کر پاتی تھیں۔ فسق و فجور کی یہ وہ علامت تھی جس کے خیال ہی سے ایک شریف خاتون کے قلب و ذہن کی عصمت و پاکیزگی کے نگینے میں بال آ جاتا تھا۔ گھروں میں فحش گیتوں کی گونج تو دور کی بات ہے۔ کسی ناشائستہ اور فحش لفظ کا زبان پر آ جانا ہی معیوب گردانا جاتا تھا۔ گھر کے بوڑھے مرد ہوں یا عورتیں، نوجوان لڑکے ہوں یا لڑکیاں کسی ایسی محفل میں جھانکنے کا تصور نہ کر سکتے تھے جہاں پاتریاں اور رقاصائیں ناچ رہی

ہوں ۔ کجا یہ کہ محفل ان کے گھروں میں منعقد ہو اور رقص کرنے والیاں ان کی اپنی نوجوان کنواری یا کم سن لڑکیاں ہوں، لیکن اب آنکھوں کا پانی کس طرح ڈھلتا جا رہا ہے اور غیرت و حمیّت کیسے دم توڑ رہی ہے، اخلاقی قدریں کس طرح موت کے گھاٹ اتری جاتی ہیں، شرافت، قلب و نظر کی پاکیزگی اور فکر و ذہن کی طہارت کس طرح رخصت ہوتی جاتی ہے کہ وہ سب کچھ ہماری آبادیوں کے عام محلوں میں ہو رہا ہے اور شریف و دیندار گھرانوں میں ہو رہا ہے جو کبھی پاترلیوں اور رقاصاؤں کے بالاخانوں میں ہوا کرتا تھا: ع

حمیّت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

جس خاندان کا ذکر میں نے کیا ہے، اس کا سربراہ ایک ضعیف آدمی ہے۔ پانچ وقت کا نمازی۔ صبح سویرے نور کے تڑکے بلا ناغہ تلاوت قرآن کی آواز اس کے گھر سے بلند ہوتی ہے۔ اڑوس پڑوس کی لڑکیاں اس مردِ دیندار کی نوجوان لڑکی سے پڑھنے آتی ہیں۔ میں پہلے پہل جب اس محلے میں آیا تو اس گھر سے علی الصباح تلاوت قرآن کی آواز سن کر بہت خوش ہوا۔ مسلمانوں نے قرآن کریم کے احکام پر عمل تو ایک مدت سے چھوڑ رکھا ہے اب ان کے گھروں میں قرآن کی رسمی تلاوت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہر آبادی میں ایسے گھر خال خال ملیں گے جہاں اس کا اہتمام ہوتا ہو، لیکن اس تدیّن کے ساتھ آج اس کے گھر میں فحش فلمی گیت الاپے جاتے ہیں۔ اس کی نوجوان لڑکیاں بڑی سریلی اور جذباتی آواز میں "بالما" کو پکارتی ہیں، اسے کسی بہانے اپنی گلی میں آنے کو کہتی ہیں، کبھی اپنی جوانی کی توصیف کرتی ہیں اور کبھی ماہیے کے رنگ روپ، قد و قامت اور اٹھتی جوانی کا ذکر کرتی ہیں، کبھی ان حسرتوں کا تذکرہ کرتی ہیں جو ان کے دلوں میں انتظار ہی انتظار میں دم توڑ رہی ہیں، کبھی کہتی ہیں زندگی کا کیا بھروسا!

اور اس سے پہلے کہ یہ حسرتیں دم توڑ دیں، انہیں جی بھر کر پورا کر لیں۔ یہ ہے ان گیتوں کا مفہوم جو ان کی زبان پر ہیں۔ ماں باپ اور بھائی ان گیتوں کو ٹھنڈے پیٹوں ہی نہیں جذبات مسرت کے ساتھ سنتے ہوں گے۔ دوسرا ردعمل ہوتا تو یہ گیت ایک بار بلند ہونے کے بعد دوبارہ نہ ابھرنے پاتے ۔۔۔ اور میں سوچ رہا ہوں ہماری غیرتوں کو کیا ہوا جاتا ہے؟ ہماری کنواری بیٹیاں اور بہنیں ہماری آنکھوں کے سامنے فحش اور عشقیہ گیت گاتی ہیں اور ہم سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔

شاید کہنے والے کہیں، بچیاں اگر شادی بیاہ کی تقریب پر تھوڑا بہت گا بجا کر جی خوش کر لیں اور اس تقریب مسرت میں ذرا رونق پیدا ہو جاتے تو کیا حرج ہے؟ اور اب تو اچھے خاصے معقول قسم کے اہل علم موسیقی اور گانے بجانے کے جواز میں فقہی موشگافیاں کرنے لگے ہیں۔ ان موشگافیوں کی بنیاد جن روایات پر رکھی جاتی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ اس بات کی اجازت دیتی ہیں کہ آٹھ دس برس کی بچیاں دف بجا کر سادہ آواز میں فحاشی اور عشق و محبت سے پاک گیت گا لیں۔ ان روایات کی بنا پہ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ نوجوان لڑکیوں کا فلمی گیت گانا اور ڈھولک کی تھاپ پہ رقص کرنا بھی جائز ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتہام باندھتا ہے، اسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ آج کے دور میں تو یہ بات بجائے خود قابل غور ہے کہ عورتوں اور بچیوں کا عشق و محبت کے جذبات سے تہی گیت گانا بھی جائز ہے یا نہیں۔ آواز کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے اور جرائم کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ناجائز آشنائی اور اغوا کی اکثر وارداتیں اسی فتنے کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ پھر جب سینما اور ریڈیو کے طفیل معاشرے میں ہر طرف فلمی گیت بکھرے ہوتے ہوں اور قلب و ذہن ان سے بری طرح متاثر ہوں، حمدوں، نعتوں اور پاکیزہ نظموں کے یاد کرنے کا رواج ہی اٹھ گیا ہو، جب پانچ سال کی بچی بھی گیت الاپتی نظر آتی ہے، ایسے

ماحول میں اگر کوئی "مفتی" اور "مولانا" شادی بیاہ کے موقع پر کچھ گانا بجا لینے کا فتویٰ دیتے ہیں تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ فحش اور ناپاک گیت ہی فضاؤں میں بلند ہوں۔ فتوے کے نہ ہونے کی صورت میں ممکن ہے لوگوں کا ضمیر خلش محسوس کرے کہ یہ گناہ کا کام ہے اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی خلاف ورزی ہو رہی ہے لیکن فتوے کے بعد تو گویا یہ خلش بھی مٹ جائے گی اور لوگ باگ گیت سن کر مطمئن رہیں گے کہ گانے بجانے کی اجازت شریعت نے دی ہے +

یہ صورت حال کہ رقص و سرود کا جو مشغلہ کل تک پاتریوں اور کنچنیوں کا تھا آج مسلمان معاشرے کے ایک ایک گھر میں اختیار کیا جانے لگا ہے، سینما کی پیدا کردہ ہے۔ سینما بینی کی وبا اب اتنی عام ہو چکی ہے کہ کوئی خوش قسمت گھر ایسا ہو گا جس کی مستورات اس وبا سے محفوظ رہی ہوں۔ جن لوگوں نے اپنے گھروں کو کسی نہ کسی طرح اس وبا سے بچائے رکھا ہے،[۱] انہیں فلمی گیتوں سے روشناس کرانے کا کارِ خیر ریڈیو انجام دے رہا ہے۔ اس کے اٹھتے ہوئے نغمے، اس کے فرمائشی گیت آپ سننا چاہیں یا نہیں زبردستی آپ کے کانوں میں انڈیلے جاتے ہیں۔ ریڈیو اب ہر گھر میں پہنچ چکا ہے۔ اور اگر کوئی اس سے محروم ہے تو اس کی حرماں نصیبی کا مداوا پڑوس کا ریڈیو کرنے کو تیار ہے وہ اتنی بلند آواز سے بولتا ہے کہ سات پردوں میں چھپ جائیں تو بھی سنائی دیتی ہے سینما اور ریڈیو دونوں بلاؤں نے ہمارے معاشرے کے ایک ایک گھر کو بری طرح متاثر کر رکھا ہے۔ ان سے اخلاق بگڑ رہے ہیں، شرم و حیا کا جنازہ اٹھ چلا ہے، حمیّت و غیرت مر رہی ہے،

---

[۱] اب تو ٹی وی گھر گھر پہنچ گیا ہے اور وہ گھرانے بھی جو سینما سے محفوظ رہے تھے، اس کی لہروں کی زد میں آ گئے ہیں اور شرم و حیا، غیرت و حمیت اور دین و اخلاق کے سارے بند ٹوٹ کر رہ گئے ہیں +

ذہن مسموم ہو رہے ہیں، جرائم بڑھ رہے ہیں، کردار مفاسد کا شکار ہو رہے ہیں، فکر کی پاکیزگی اور دل و نظر کی طہارت برباد ہو رہی ہے، اخلاقی زندگی تہ و بالا ہو چلی ہے، نیکیوں کی اہمیت ختم ہوتی جاتی ہے اور برائیاں برائیاں نہیں رہی ہیں۔ وہ باتیں جنہیں آج سے پندرہ بیس برس پہلے کوئی اپنے محلّوں اور گھروں میں برداشت نہ کرتا تھا، آج انہیں فراخدلی سے انگیز اجا رہا ہے۔ اخلاق و کردار اور غیرت و حمیّت کسی قوم اور ملت کی اصل قوت ہوا کرتے ہیں۔ بقول اقبالؒ:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

اخلاق و کردار سے تہی قوم بودی اور بے جان ہوتی ہے اور غیرت و حمیّت نہ رہے تو اس کی رہی سہی قوت بھی جاتی رہتی ہے۔ زمانے کے شدائد کا مقابلہ کرنے کا اس میں یارا نہیں رہتا، اس کی موت دیر سویر آ کر رہتی ہے۔

(۸ر اکتوبر ۱۹۵۹ء)

اِنفاق فی سبیل اللہ

پچھلے دنوں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بنک اور انشورنس کے موضوع پر لاہور کے دانشور طبقے سے خطاب کیا، اسلامی نقطۂ نظر سے ان کا جائزہ لیا اور بتایا کہ عہد حاضر کے یہ ناگزیر اقتصادی ادارے اسلامی بنیادوں پر کس طرح استوار کیے جا سکتے ہیں۔ خطاب کے بعد حاضرین نے بہت سے سوالات کیے جن کا مولانا نے جواب دیا۔ ایک صاحب نے پوچھا بنک کاری کا غیر سودی نظام آپ نے تجویز کیا ہے، اسے اگر اپنا لیا جائے تو جنگ کی صورت میں حکومت لوگوں سے قرضہ کس طرح حاصل کرے گی؟ مولانا نے جواب میں جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم یہ تھا کہ ایسی قوم کو مر جانا چاہیئے جو دشمن سے موت و حیات کا معرکہ لڑ رہی ہو، اس کے عام مرد و زن اپنی جانیں نچھاور کر رہے ہوں، اس جنگ میں فتحیاب ہونے کے لیے سرمایے کی ضرورت ہو مگر اس کے سرمایہ دار سرمایہ دینے سے پہلے یہ پوچھیں کہ انہیں اس پر کتنے فی صد سود ملے گا۔ مولانا کے اس جواب پر حاضرین نے تالیاں پیٹ کر اظہارِ تحسین کیا۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس سوال کا یہی جواب ہو سکتا تھا، لیکن جب سے میری نظر سے یہ سوال گزرا ہے میرے ذہن میں ایک ہلچل برپا ہے۔ یہ سوال جس ذہنیت کی پیداوار ہے وہ بار بار میرے تصور کے پردے پر ابھر آتی ہے اور میرا دل یہ پوچھنے لگتا ہے کہ کیا اب اس اُمت میں بھی مہاجنوں اور شائیلاکوں کی ذہنیت پیدا ہو گئی ہے جس کے

نزدیک زندگی کے اعلیٰ تر مقاصد کے لیے جان پر کھیل جانا اور دنیوی منفعت کا تصور کیے بغیر دھن دولت لٹا دینا ایمان کا تقاضا تھا۔

یہ ذہنیت در حقیقت اس مادیت پرستی کی پیدا کردہ ہے جو آج زندگی کے افکار و کردار پر چھا چکی ہے، جس نے دل و دماغ کو اس طرح متاثر کر ڈالا ہے کہ انسان کوئی کام کرنے سے پہلے اس کے مادی نفع و ضرر کو تولنے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ نیکی بھی کرتا ہے تو پہلے یہ دیکھتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کو کتنا اور کس شکل و صورت میں فائدہ ہوگا اور بدی سے باز رہتا ہے تو یہ دیکھ کر کہ اس باز رہنے سے اس کو کوئی نقصان تو نہ ہوگا۔ ہر کام میں مادی نفع و نقصان کی میزان لے کر بیٹھ جانا ان قوموں کو تو زیب دے سکتا ہے جو زندگی کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر رکھتی ہیں، لیکن وہ اُمت جو خدا اور رسولؐ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے، جس کا ایقان ہے کہ مادی منفعتیں اور نقصان اسی دنیا میں رہ جائیں گے، آخرت میں وہی حسنات کام آئیں گی جو ہر قسم کی مادی آلائش اور حرص و ریا سے پاک ہو کر خالصتاً اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے کی جائیں گی، اس اُمت کے لیے یہ بات صرف نازیبا نہیں ہے بلکہ اس کے اس ایمان و ایقان کے منافی ہے جس کا وہ دعویٰ کرتی ہے۔ جن قوموں کے سامنے صرف دُنیا کی یہی زندگی اور اس کا مادی نفع و ضرر رہتا ہے، ان کے افراد کا مہاجنوں اور شائیلاکوں کا سا طرز فکر و عمل تو یقیناً کچھ بھی تعجب خیز نہیں، لیکن وہ اُمت جسے آخرت کی ابدی زندگی کا تصور دیا گیا ہے اور دنیوی زندگی کی مادی منفعتوں کو "متاعِ قلیل" اور "متاعِ غرور" سمجھنے کی تلقین کی گئی ہے اس کے اندر اس ذہنیت کا پیدا ہو جانا حیرت ناک ہی نہیں انتہائی رنجدہ اور المناک بھی ہے۔

اور یہ رنجدہ اور المناک حقیقت، فی الواقع اس اُمت میں راہ پا چکی ہے۔ اب یہاں

بھی ہر معاملہ مادّی نفع و نقصان کی ترازو میں تولا جانے لگا ہے۔ اُمّت کی فکری و تہذیبی رہنمائی جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے، بدقسمتی سے وہ اللہ اور رسول اور آخرت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود عملی زندگی میں مادہ پرستانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے طفیل اب یہ بیماری اُمّت کے دوسرے طبقات میں بھی پھیل چکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ اس کے سرمایہ دار اس وقت تک اپنی تجوریوں کے منہ کھولنے پر آمادہ نہیں ہوتے جب تک انہیں یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ یہ سرمایہ، سود، نام و نمود یا کسی اور مادّی منفعت کی صورت میں انہیں واپس مل جائے گا۔ اس کے عوام اس وقت کسی نیک کام کے لیے اپنی گرہ نہیں کھولتے جب تک ان کی تسکینِ نفس کا سامان مہیّا نہیں کیا جاتا۔ سیلاب زدوں کی امداد کا مسئلہ ہو یا بیماروں کے علاج کا معاملہ، کسی ارضی یا سماوی آفت کا شکار ہونے والے بھائیوں کی مدد کا سوال ہو یا کسی سامراجی قوم کے چنگل سے نجات پانے کی جدّوجہد کرنے والے مسلمانوں کی امداد کا کام، اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا جب تک رقص و سرود کی محفلیں منعقد نہیں ہوتیں، سینماؤں کے خصوصی شو، لہو و لعب اور کلچرل آرٹ کی نمائش کے مظاہرے نہیں ہو پاتے۔ آپ کسی ملّی کام کے سلسلے میں روپے پیسے کی اپنے عوام سے لاکھ اپیل کریں، تھوڑی سی تعداد کو چھوڑ کر اکثریت ایک حبّہ بھی دینے کو آمادہ نہ ہوگی۔ قوم کے یتیم اور بے کس بچے دربدر ٹھوکریں کھاتے پھریں گے، کسی کو کبھی خیال نہ گزرے گا کہ ان کی کفالت اور دیکھ بھال کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ قوم کی بیوہ، نادار اور بے یار و مددگار عورتیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے ناروا کام کرنے، حتّٰی کہ عصمت بیچنے پر مجبور ہو جائیں گی، لیکن کھاتے پیتے لوگوں کو کبھی احساس نہ ہوگا کہ ان پر بھی کوئی فرض عائد ہوتا ہے۔ ان کے محلوں اور بستیوں کے بیسیوں بلکہ سینکڑوں خاندان پیٹ بھر کر روٹی کھانے اور اپنی بیماریوں کے علاج معالجے کی مقدرت سے محروم، بھوکے اور بیمار زندگی بسر کرتے ہوں گے، مگر خوشحال لوگوں کو کبھی ان کی بیچارگی اور اپنے اوپر عائد ہونے والے فریضے کا خیال نہ آئے گا۔ لیکن ان لوگوں کی امداد کے نام

پر آپ اگر رقص و سرود کی محفلیں رچائیں، مینا بازار لگائیں اور "ثقافتی میلے" منعقد کریں اور سو پانچ سو روپے تک کے ٹکٹ لگا دیں، ہمارے عوام اور خواص ہر طرف ان محفلوں، مینا بازاروں اور ثقافتی میلوں کی جانب ہجوم در ہجوم نکل کھڑے ہوں گے اور ایک ہی محفل میں مجموعی طور پر ہزاروں لاکھوں روپے ان کی جیبوں سے نکل آئیں گے۔

یہ صورتِ حال کس حقیقت کا پتہ دیتی ہے؟ یہی کہ مادہ پرست قوموں کی ذہنیت اُمّتِ مسلمہ میں بھی پیدا ہو چکی ہے۔

مولانا مودودی سے سائل نے جو سوال دریافت کیا تھا وہ بھی اسی حقیقت کا آئینہ دار تھا۔ مادہ پرستانہ ذہنیت اس بات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی کہ کوئی شخص کسی مادّی منفعت کے بغیر کسی معاملے پر اپنا سرمایہ لگانے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اگرچہ وہ معاملہ اس کے اپنے قومی وجود اور آزادی کی بقا کا معاملہ ہو ـــ لیکن ایک مسلمان اور بہ نقطۂ نظر! فیا للعجب و یا اسفاہ! مسلمان کو تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا کہ کسی دنیوی منفعت کی امید دل میں پالے بغیر خالصتہً اللہ کی راہ میں مال صرف کرنا اس کے ایمان کا بنیادی تقاضا ہے اور سچے اہلِ ایمان کی نشانی اور خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ دوسرے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اللہ کی راہ میں اپنا مال بھی خرچ کرتے ہیں:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝

(حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اپنے دعوئ ایمان میں وہی لوگ سچے ہیں۔ (الحجرات ۱۵))

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا (جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو رزق ان کو دیا ہے اس میں

سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ (الانفال ۲-۴)

اور انفاق فی سبیل اللہ سے گریز یا بیزاری سے خرچ کرنے کو اللہ نے منافقت کی علامت قرار دیا ہے: وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا (ان بدویوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں۔ التوبہ ۹۸) اس سے پہلے کی آیت میں ان بدویوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں۔

قرآن کریم میں اہلِ ایمان کو انفاق فی سبیل اللہ کے لیے بار بار ابھارا گیا ہے سورہ المنافقون میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (۱۰) جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت آ جائے اور اس وقت وہ کہے کہ اے میرے رب کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا۔

سورۃ الصف میں انفاق فی سبیل اللہ کو عذاب سے نجات دلانے والی تجارت کہا ہے۔ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۰-۱۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے بچا لے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرو۔

اکثر مقامات پر اللہ کی راہ میں انفاق کو اللہ کو قرض دینے سے تعبیر کیا گیا ہے اور اہلِ ایمان کو اس کی ترغیب دی گئی ہے۔ سورہ التغابن میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنے

اور احکام الٰہی کو سن کر ان کی اطاعت کرنے کی تلقین کے ساتھ کہا گیا ہے۔ وَاَنْفِقُوْا خَيْرًا لِّاَنْفُسِكُمْ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعِفْهُ لَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ (۱۶-۱۷) اور اپنے مال خرچ کرو، یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔ جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرمائے گا۔

سورۃ المائدہ میں ارشاد فرمایا ہے: لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۱۲) اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کو قرآن کریم ہلاکت اور تباہی کا موجب قرار دیتا ہے: وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ (البقرہ ۱۹۵) اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بجائے مال و دولت سینت سینت کر رکھتے اور اس پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں انہیں نہایت ہولناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوْبُهُمْ وَظُهُوْرُهُمْ هٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ فَذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْنِزُوْنَ (التوبۃ ۳۴-۳۵)

لکھی گئیں اور نہ فصیح و بلیغ خطبے دیے گئے۔ ایمان دلوں میں گھر کر گیا تو اس برائی کا احساس آپ سے آپ ہونے لگا۔ یہ سوال رہ رہ کر پریشان کرنے لگا، کہ ایمان کے ساتھ یہ برائی چل سکتی ہے یا نہیں۔ اس میں ہمارے لیے نفع ہے یا مضرت۔ یہ احساس جب پیدا ہو گیا تو پھر بس چند آیات مختصر سے وقفے سے اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوئیں جو اہلِ ایمان کو پڑھ کر سنا دی گئیں اور یہ معاشرہ، شراب جس کی گھٹی میں پڑی تھی، بغیر کسی تگ و دو اور فلسفہ طرازی اور پروپیگنڈے کے امتناعِ شراب کی طرف بتدریج قدم بڑھاتا چلا گیا۔

پہلی مرتبہ اس کے سامنے محض شراب کے اچھے اور برے پہلو لائے جاتے ہیں، ارشادِ ربانی پڑھ کر سنا دیا جاتا ہے۔

یَسْـَٔلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ط (البقرہ - ۲۱۹) لوگ پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے۔ کہہ دیجئے ان دونوں چیزوں میں بڑی ہی خرابی ہے، اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ منافع بھی ہیں، مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بہت زیادہ ہے۔

دوسری مرتبہ نشے کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع کیا جاتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ . . . (النسآء ۴۳) اے ایمان والو! جب تم نشے کی حالت میں ہو تو نماز کے قریب نہ جاؤ۔ نماز اس وقت پڑھنی چاہیئے جب تم یہ جان سکو کہ اپنی زبان سے کیا نکال رہے ہو۔"

اور پھر آخری حکم نازل کر دیا گیا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَاحْذَرُوا فَإِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا عَلَىٰ رَسُولِنَا الْبَلَاغُ الْمُبِينُ ۝ (المائدہ ۹۰-۹۲) اے ایمان والو، یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور یہ پانسے، سب شیطان کے گندے کام ہیں ان سے پرہیز کرو تاکہ تم فلاح سے بہرہ ور ہو سکو۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے سے تمہارے درمیان بغض اور عداوت ڈال دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے؟ اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی فرماں برداری کرو اور باز آجاؤ، لیکن اگر تم نے حکم عدولی کی تو جان لو کہ ہمارے رسولؐ پر تو صرف یہ ذمہ داری ہے کہ تمہیں صاف صاف (خدا کا) حکم پہنچا دے۔

یہ تھے وہ تین تدریجی مرحلے، جن سے شراب کو حرام قرار دینے تک اس معاشرے کو گزرنا پڑا۔ پہلے مرحلے میں یہ بات ذہن نشین کی گئی کہ شراب اپنے دامن میں فوائد تھوڑے اور تباہی کا سامان بہت زیادہ رکھتی ہے۔ جس فصل کا حاصل کانٹے ہی کانٹے ہوں اس کی کاشت اور پرورش میں ایک مسلمان اپنی زندگی کیوں ضائع کر سکتا ہے؟ چنانچہ پہلے ہی مرحلے پر کتنے ہی لوگوں نے اس مہلک شغل سے توبہ کر لی۔ دوسرے مرحلے میں شراب نوشی کے اوقات محدود کر دیے گئے۔ دن رات میں پانچ نمازیں پڑھنا ہوتی تھیں اور ہر نماز کے لیے ضروری تھا کہ آدمی اپنے ہوش و حواس میں ہو، نشے میں بہکا ہوا نہ ہو۔ اس طرح شراب نوشی میں احتیاط برتی جانے لگی ـــــ اور جب تیسرے مرحلے میں آخری حکم نازل ہوا، تو لوگ شراب سے اس طرح مجتنب ہو گئے گویا وہ کبھی اس کے عادی ہی نہ تھے۔

اس حکم کو جس شخص نے جس حالت میں سنا، اس نے شراب نوشی سے ہاتھ اٹھالیا۔ ایک محفل میں ساغر و مینا کا دور چل رہا تھا۔ ناگاہ پکارنے والے نے کہا اللہ نے شراب حرام کردی اور اس سلسلے میں جو آیت نازل ہوئی، وہ پڑھ کر سنائی بس ہاتھ وہیں رک گئے حلق میں پہنچی ہوئی شراب تھوک دی، شراب کے برتن توڑ ڈالے۔ اس روز مدینہ کی گلیوں میں شراب بارش کے پانی کی طرح بہہ رہی تھی۔

پھر یہ اجتناب کوئی وقتی نہ تھا بلکہ اتنا مستقل کہ صدیوں پر صدیاں گزرتی چلی گئیں لیکن مسلمانوں کی سوسائٹی میں (علانیہ کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا) کبھی خفیہ میکدے بھی قائم نہ ہوئے۔ مسلمان ملکوں میں غیر مسلم خصوصاً یہودی پوشیدہ شراب بناتے تھے۔ (چنانچہ اسی مناسبت سے شراب کے لیے شرب الیہود کی اصطلاح رائج ہو گئی تھی) بعض بگڑے ہوئے مسلمان چوری چھپے انہی شراب خانوں سے لے کر پیتے بھی تھے دینی اور اخلاقی گرفت کمزور پڑ گئی تو حکمرانوں اور امراء و اعیان سلطنت اور اونچے طبقے میں بھی کچھ لوگ اس ام الخبائث کے رسیا پیدا ہو گئے تاہم یہ لعنت ہر دور میں محدود ہی رہی۔ امت نے بحیثیت مجموعی اسے کبھی قبول نہیں کیا اور وہ صورت کبھی پیدا نہیں ہوئی جو یورپ اور امریکہ کے مہذب معاشروں میں پائی جاتی ہے کہ اوپر سے لے کر نیچے تک یہ لعنت سرایت کر چکی ہے اور مرد ہی نہیں عورتیں اور بچے تک اس کا شغل رکھتے ہیں — اور یہ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان ہی کا اثر ہے کہ آج بھی جبکہ مشرق و مغرب کے ہر غیر مسلم معاشرے میں شراب خوری عام ہو چکی ہے یہی وہ واحد معاشرہ ہے جس میں کسی قانونی جبر کے بغیر شراب کو آج بھی حرام سمجھا جاتا ہے اور ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک سے بھی کم ہے جو اس ام الخبائث سے شوق رکھتے ہیں اور یہ بھی زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کا اللہ اس کے رسولؐ اور آخرت پر ایمان کھوکھلا ہو چکا ہے جو مغربی تہذیب کے شیدائی اور اس کی ہر برائی کو ترقی کے نام پر لبیک کر قبول کرنے والے ہیں جو اپنے اسلام و ایمان کو قصۂ ماضی سمجھتے ہیں۔

(۲۰ دسمبر ۱۹۹۰ء)

غیرت بڑی چیز ہے.....

ہمارے پڑوس میں کئی روز سے شادی کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ادھر رات کی سیاہی دنیا پر سایہ فگن ہوتی ہے۔ ادھر ڈھولک کی تھاپ پر گیت گونجنے لگتے ہیں۔ گانے والیاں نوخیز لڑکیاں ہیں اور گیت عموماً فلمی ہوتے ہیں۔ ایسے گیت کہ ہم میاں بیوی اپنی بچیوں کے ساتھ بیٹھے ہوتے ہیں تو ہماری آنکھیں شرم سے جھک جاتی ہیں اور یہ سوچ کر پریشان ہو جاتے ہیں کہ ان کے معصوم ذہنوں پر فحش گیت کہیں بُرے اثرات ثبت نہ کر دیں۔ ایک رات ڈھولک کی تھاپ اور گیتوں کے زیر و بم کے ساتھ گھنگھرو بجنے کی آواز آئی۔ میری بیوی نے دیکھا تو پتہ چلا کہ دولہا کی ایک ہشت سالہ عم زاد بہن رقص کر رہی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب رقص اور نغمہ پاتریوں اور کنچنیوں کا پیشہ سمجھا جاتا تھا۔ شریف گھرانوں کی کنواری لڑکیاں ہی نہیں شادی شدہ عورتیں تک ان کا تصور نہیں کر پاتی تھیں۔ فسق و فجور کی یہ وہ علامت تھی جس کے خیال ہی سے ایک شریف خاتون کے قلب و ذہن کی عصمت و پاکیزگی کے نگینے میں بال آ جاتا تھا۔ گھروں میں فحش گیتوں کی گونج تو دور کی بات ہے۔ کسی ناشائستہ اور فحش لفظ کا زبان پر آ جانا ہی معیوب گردانا جاتا تھا۔ گھر کے بوڑھے مرد ہوں یا عورتیں، نوجوان لڑکے ہوں یا لڑکیاں کسی ایسی محفل میں جھانکنے کا تصور نہ کر سکتے تھے جہاں پاتریاں اور رقاصائیں ناچ رہی

ہوں — کجا یہ کہ محفل ان کے گھروں میں منعقد ہو اور رقص کرنے والیاں ان کی اپنی نوجوان کنواری یا کم سن لڑکیاں ہوں، لیکن اب آنکھوں کا پانی کس طرح ڈھلتا جا رہا ہے اور غیرت و حمیّت کیسے دم توڑ رہی ہے، اخلاقی قدریں کس طرح موت کے گھاٹ اتری جاتی ہیں، شرافت، قلب و نظر کی پاکیزگی اور فکر و ذہن کی طہارت کس طرح رخصت ہوئی جاتی ہے کہ وہ سب کچھ ہماری آبادیوں کے عام محلّوں میں ہو رہا ہے اور شریف و دیندار گھرانوں میں ہو رہا ہے جو کبھی پاتریوں اور رقاصاؤں کے بالاخانوں میں ہوا کرتا تھا: ع

حمیّت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے

جس خاندان کا ذکر میں نے کیا ہے، اس کا سربراہ ایک ضعیف آدمی ہے۔ پانچ وقت کا نمازی۔ صبح سویرے نور کے تڑکے بلا ناغہ تلاوتِ قرآن کی آواز اس کے گھر سے بلند ہوتی ہے۔ اڑوس پڑوس کی لڑکیاں اس مردِ دیندار کی نوجوان لڑکی سے پڑھنے آتی ہیں۔ میں پہلے پہل جب اس محلے میں آیا تو اس گھر سے علی الصباح تلاوتِ قرآن کی آواز سن کر بہت خوش ہوا۔ مسلمانوں نے قرآن کریم کے احکام پر عمل تو ایک مدت سے چھوڑ رکھا ہے۔ اب ان کے گھروں میں قرآن کی رسمی تلاوت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ ہر آبادی میں ایسے گھر خال خال ملیں گے جہاں اس کا اہتمام ہوتا ہو۔ لیکن اس تدیّن کے ساتھ آج اس کے گھر میں فحش فلمی گیت الاپے جا رہے ہیں۔ اس کی نوجوان لڑکیاں بڑی سریلی اور جذباتی آواز میں "بالما" کو پکارتی ہیں، اسے کسی بہانے اپنی گلی میں آنے کو کہتی ہیں، کبھی اپنی جوانی کی توصیف کرتی ہیں اور کبھی ماہیے کے رنگ روپ، قد و قامت اور اٹھتی جوانی کا ذکر کرتی ہیں، کبھی ان حسرتوں کا تذکرہ کرتی ہیں جو ان کے دلوں میں انتظار ہی انتظار میں دم توڑ رہی ہیں، کبھی کہتی ہیں زندگی کا کیا بھروسا،

آئے اس سے پہلے کہ یہ حسرتیں دم توڑ دیں، انہیں جی بھر کر پورا کرلیں۔ یہ ہے ان گیتوں کا مفہوم جو ان کی زبان پر ہیں۔ ماں باپ اور بھائی ان گیتوں کو ٹھنڈے پیٹوں ہی نہیں جذبات مسرت کے ساتھ سنتے ہوں گے۔ دوسرا ردِعمل ہوتا تو یہ گیت ایک بار بلند ہونے کے بعد دوبارہ نہ اُبھرنے پاتے ــــ اور میں سوچ رہا ہوں ہماری غیرتوں کو کیا ہوا جاتا ہے؟ ہماری کنواری بیٹیاں اور بہنیں ہماری آنکھوں کے سامنے فحش اور عشقیہ گیت گاتی ہیں اور ہم سنتے ہیں اور سر دھنتے ہیں۔

شاید کہنے والے کہیں، بچیاں اگر شادی بیاہ کی تقریب پر تھوڑا بہت گا بجا کر جی خوش کرلیں اور اس تقریب مسرت میں ذرا رونق پیدا ہو جاتے تو کیا حرج ہے؟ اور اب تو اچھے خاصے معقول قسم کے اہل علم موسیقی اور گانے بجانے کے جواز میں فقہی موشگافیاں کرنے لگے ہیں۔ ان موشگافیوں کی بنیاد جن روایات پر رکھی جاتی ہے، وہ زیادہ سے زیادہ اس بات کی اجازت دیتی ہیں کہ آٹھ دس برس کی بچیاں دف بجا کر سادہ آواز میں فحاشی اور عشق و محبت سے پاک گیت گالیں۔ ان روایات کی بنا پر اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ نوجوان لڑکیوں کا فلمی گیت گانا اور ڈھولک کی تھاپ پر رقص کرنا بھی جائز ہے تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتہام باندھتا ہے، اسے اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ آج کے دور میں تو یہ بات بجائے خود قابل غور ہے کہ عورتوں اور بچیوں کا عشق و محبت کے جذبات سے تہی گیت گانا بھی جائز ہے یا نہیں۔ آواز کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے اور جرائم کی تاریخ شہادت دیتی ہے کہ ناجائز آشنائی اور اغوا کی اکثر وارداتیں اسی فتنے کا ثمرہ ہوتی ہیں۔ پھر جب سینما اور ریڈیو کے طفیل معاشرے میں ہر طرف فلمی گیت بکھرے ہوتے ہوں اور قلب و ذہن ان سے بری طرح متاثر ہوں، حمدوں، نعتوں اور پاکیزہ نظموں کے یاد کرنے کا رواج تک اٹھ گیا ہو، جب پانچ سال کی بچی بھی گیت الاپتی نظر آئے، ایسے

ماحول میں اگر کوئی "مفتی" اور "مولانا" شادی بیاہ کے موقع پر کچھ گا بجا لینے کا فتویٰ دیتے ہیں تو اس کا نتیجہ بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ فحش اور ناپاک گیت ہی فضاؤں میں بلند ہوں۔ فتوے کے نہ ہونے کی صورت میں ممکن ہے لوگوں کا ضمیر خلش محسوس کرے کہ یہ گناہ کا کام ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی خلاف ورزی ہو رہی ہے لیکن فتوے کے بعد تو گویا یہ خلش بھی مٹ جائے گی اور لوگ راگ گیت سن کر مطمئن رہیں گے کہ گانے بجانے کی اجازت شریعت نے دی ہے۔

یہ صورت حال کہ رقص و سرود کا جو مشغلہ کل تک پاتریوں اور کنچنیوں کا تھا آج مسلمان معاشرے کے ایک ایک گھر میں اختیار کیا جانے لگا ہے سینما کی پیدا کردہ ہے۔ سینما بینی کی وبا اب اتنی عام ہو چکی ہے کہ کوئی خوش قسمت گھر ایسا ہو گا جس کی مستورات اس وبا سے محفوظ رہی ہوں۔ جن لوگوں نے اپنے گھروں کو کسی نہ کسی طرح اس وبا سے بچائے رکھا ہے،[1] انہیں فلمی گیتوں سے روشناس کرانے کا کارِ خیر ریڈیو انجام دے رہا ہے۔ اس کے اٹھتے ہوئے نغمے، اس کے فرمائشی گیت آپ سننا چاہیں یا نہیں زبردستی آپ کے کانوں میں انڈیلے جاتے ہیں۔ ریڈیو اب ہر گھر میں پہنچ چکا ہے۔ اور اگر کوئی اس سے محروم ہے تو اس کی حرماں نصیبی کا مداوا پڑوس کا ریڈیو کرنے کو تیار ہے وہ اتنی بلند آواز سے بولتا ہے کہ سات پردوں میں چھپ جائیں تو بھی سنائی دیتی ہے سینما اور ریڈیو دونوں بلاؤں نے ہمارے معاشرے کے ایک ایک گھر کو بری طرح متاثر کر رکھا ہے۔ ان سے اخلاق بگڑ رہے ہیں، شرم و حیا کا جنازہ اٹھ چلا ہے، حمیت و غیرت مر رہی ہے۔

---

[1] اب تو ٹی وی گھر گھر پہنچ گیا ہے اور وہ گھرانے بھی جو سینما سے محفوظ رہے تھے، اس کی لہروں کی زد میں آ گئے ہیں اور شرم و حیا، غیرت و حمیت اور دین و اخلاق کے سارے بند ٹوٹ کر رہ گئے ہیں۔

ذہن مسموم ہو رہے ہیں، جرائم بڑھ رہے ہیں، کردار مفاسد کا شکار ہو رہے ہیں، فکر کی پاکیزگی اور دل و نظر کی طہارت برباد ہو رہی ہے، اخلاقی زندگی تہ و بالا ہو چلی ہے، نیکیوں کی اہمیت ختم ہوتی جاتی ہے اور برائیاں برائیاں نہیں رہی ہیں۔ وہ باتیں جنہیں آج سے پندرہ بیس برس پہلے کوئی اپنے محلوں اور گھروں میں برداشت نہ کرتا تھا، آج انہیں فراخدلی سے انگیز اجا رہا ہے۔ اخلاق و کردار اور غیرت و حمیت کسی قوم اور ملت کی اصل قوت ہوا کرتے ہیں۔ بقول اقبالؒ:

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

اخلاق و کردار سے تہی قوم بودی اور بے جان ہوتی ہے اور غیرت و حمیت نہ رہے تو اس کی رہی سہی قوت بھی جاتی رہتی ہے۔ زمانے کے شدائد کا مقابلہ کرنے کا اس میں یارا نہیں رہتا، اس کی موت دیر سویر آ کر رہتی ہے۔ (۸ر اکتوبر ۱۹۵۹ء)

اِنفاق فی سبیل اللہ

پچھلے دنوں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے بنک اور انشورنس کے موضوع پر لاہور کے دانشور طبقے سے خطاب کیا، اسلامی نقطۂ نظر سے ان کا جائزہ لیا اور بتایا کہ عہدِ حاضر کے یہ ناگزیر اقتصادی ادارے اسلامی بنیادوں پر کس طرح استوار کیے جا سکتے ہیں۔ خطاب کے بعد حاضرین نے بہت سے سوالات کیے جن کا مولانا نے جواب دیا۔ ایک صاحب نے پوچھا بنک کاری کا غیر سودی نظام آپ نے تجویز کیا ہے اسے اگر اپنا لیا جائے تو جنگ کی صورت میں حکومت لوگوں سے قرضہ کس طرح حاصل کرے گی؟ مولانا نے جواب میں جو کچھ فرمایا اس کا مفہوم یہ تھا کہ ایسی قوم کو مر جانا چاہیئے جو دشمن سے موت و حیات کا معرکہ لڑ رہی ہو، اس کے عام مرد و زن اپنی جانیں نچھاور کر رہے ہوں، اس جنگ میں فتحیاب ہونے کے لیے سرمایے کی ضرورت ہو مگر اس کے سرمایہ دار سرمایہ دینے سے پہلے یہ پوچھیں کہ انہیں اس پر کتنے فی صد سود ملے گا۔ مولانا کے اس جواب پر حاضرین نے تالیاں پیٹ کر اظہارِ تحسین کیا۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس سوال کا یہی جواب ہو سکتا تھا، لیکن جب سے میری نظر سے یہ سوال گزرا ہے میرے ذہن میں ایک ہلچل برپا ہے۔ یہ سوال جس ذہنیت کی پیداوار ہے وہ بار بار میرے تصور کے پردے پر ابھر آتی ہے اور میرا دل یہ پوچھنے لگتا ہے کہ کیا اب اس اُمّت میں بھی مہاجنوں اور شائیلاکوں کی ذہنیت پیدا ہو گئی ہے جس کے

نزدیک زندگی کے اعلیٰ تر مقاصد کے لیے جان پہ کھیل جانا اور دنیوی منفعت کا تصور کیے بغیر دھن دولت لٹا دینا ایمان کا تقاضا تھا۔

یہ ذہنیت در حقیقت اس مادیت پرستی کی پیدا کردہ ہے جو آج زندگی کے افکار و کردار پر چھا چکی ہے، جس نے دل و دماغ کو اس طرح متاثر کر ڈالا ہے کہ انسان کوئی کام کرنے سے پہلے اس کے مادی نفع و ضرر کو تولنے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ نیکی بھی کرتا ہے تو پہلے یہ دیکھتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کو کتنا اور کس شکل و صورت میں فائدہ ہوگا اور بدی سے باز رہتا ہے تو یہ دیکھ کر کہ اس باز رہنے سے اس کو کوئی نقصان تو نہ ہوگا۔ ہر کام میں مادی نفع و نقصان کی میزان لے کر بیٹھ جانا ان قوموں کو تو زیب دے سکتا ہے جو زندگی کا مادہ پرستانہ نقطۂ نظر رکھتی ہیں، لیکن وہ اُمت جو خدا اور رسولؐ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہے، جس کا ایقان ہے کہ مادی منفعتیں اور نقصان اسی دنیا میں رہ جائیں گے، آخرت میں وہی حسنات کام آئیں گی جو ہر قسم کی مادی آلائش اور حرص و ریا سے پاک ہو کر خالصتاً اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے کی جائیں گی، اس اُمت کے لیے یہ بات صرف نازیبا نہیں ہے بلکہ اس کے اس ایمان و ایقان کے منافی ہے جس کا وہ دعویٰ کرتی ہے۔ جن قوموں کے سامنے صرف دنیا کی یہی زندگی اور اس کا مادی نفع و ضرر رہتا ہے، ان کے افراد کا مہاجنوں اور شائیلاکوں کا سا طرزِ فکر و عمل تو یقیناً کچھ بھی تعجب خیز نہیں، لیکن وہ اُمت جسے آخرت کی ابدی زندگی کا تصور دیا گیا ہے اور دنیوی زندگی کی مادی منفعتوں کو "متاعِ قلیل" اور "متاعِ غرور" سمجھنے کی تلقین کی گئی ہے اس کے اندر اس ذہنیت کا پیدا ہو جانا حیرت ناک ہی نہیں انتہائی رنجدہ اور المناک بھی ہے۔

اور یہ رنجدہ اور المناک حقیقت، فی الواقع اس اُمت میں راہ پا چکی ہے۔ اب یہاں

بھی ہر معاملہ مادّی نفع و نقصان کی ترازو میں تولا جانے لگا ہے۔ اُمّت کی فکری و تہذیبی رہنمائی جن لوگوں کے ہاتھ میں ہے، بدقسمتی سے وہ اللہ اور رسولؐ اور آخرت پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرنے کے باوجود عملی زندگی میں مادّہ پرستانہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ ان کے طفیل اب یہ بیماری اُمّت کے دوسرے طبقات میں بھی پھیل چکی ہے۔ حالت یہ ہے کہ اس کے سرمایہ دار اس وقت تک اپنی تجوریوں کے منہ کھولنے پر آمادہ نہیں ہوتے جب تک انہیں یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ یہ سرمایہ، سود، نام و نمود یا کسی اور مادّی منفعت کی صورت میں انہیں واپس مل جائے گا۔ اس کے عوام اس وقت کسی نیک کام کے لیے اپنی گرہ نہیں کھولتے جب تک ان کی تسکینِ نفس کا سامان مہیا نہیں کیا جاتا۔ سیلاب زدوں کی امداد کا مسئلہ ہو یا بیماروں کے علاج کا معاملہ، کسی ارضی یا سماوی آفت کا شکار ہونے والے بھائیوں کی مدد کا سوال ہو یا کسی سامراجی قوم کے چنگل سے نجات پانے کی جدّوجہد کرنے والے مسلمانوں کی امداد کا کام، اس وقت تک انجام نہیں پا سکتا جب تک رقص و سرود کی محفلیں منعقد نہیں ہوتیں، سینماؤں کے خصوصی شو، لہو و لعب اور کلچرل آرٹ کی نمائش کے مظاہرے نہیں ہو پاتے۔ آپ کسی ملّی کام کے سلسلے میں روپے پیسے کی اپنے عوام سے لاکھ اپیل کریں، تھوڑی سی تعداد کو چھوڑ کر اکثریت ایک حبّہ بھی دینے کو آمادہ نہ ہوگی۔ قوم کے یتیم اور بے کس بچے دربدر ٹھوکریں کھاتے پھریں گے، کسی کو کبھی خیال نہ گزرے گا کہ ان کی کفالت اور دیکھ بھال کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے۔ قوم کی بیوہ، نادار اور بے یار و مددگار عورتیں اپنا پیٹ بھرنے کے لیے ناروا کام کرنے حتّٰی کہ عصمت بیچنے پر مجبور ہو جائیں گی، لیکن کھاتے پیتے لوگوں کو کبھی احساس نہ ہوگا کہ ان پر بھی کوئی فرض عائد ہوتا ہے۔ ان کے محلوں اور بستیوں کے بیسیوں بلکہ سینکڑوں خاندان پیٹ بھر کر روٹی کھانے اور اپنی بیماریوں کے علاج معالجے کی قدرت سے محروم، بھوکے اور بیمار زندگی بسر کر رہے ہوں گے، مگر خوشحال لوگوں کو کبھی ان کی بیچارگی اور اپنے اوپر عائد ہونے والے فریضے کا خیال نہ آئے گا، لیکن ان لوگوں کی امداد کے نام

پر آپ اگر رقص و سرود کی محفلیں رچائیں، مینا بازار لگائیں اور "ثقافتی میلے" منعقد کریں اور سو پانچ سو روپے تک کے ٹکٹ لگادیں، ہمارے عوام اور خواص ہر طرف ان محفلوں، مینا بازاروں اور ثقافتی میلوں کی جانب ہجوم در ہجوم نکل کھڑے ہوں گے اور ایک ہی مجلس میں مجموعی طور پر ہزاروں لاکھوں روپے ان کی جیبوں سے نکل آئیں گے۔

یہ صورتِ حال کس حقیقت کا پتہ دیتی ہے؟ یہی کہ مادہ پرست قوموں کی ذہنیت امتِ مسلمہ میں بھی پیدا ہو چکی ہے۔

مولانا مودودی سے سائل نے جو سوال دریافت کیا تھا وہ بھی اسی حقیقت کا آئینہ دار تھا۔ مادہ پرستانہ ذہنیت اس بات کا تصوّر بھی نہیں کر سکتی کہ کوئی شخص کسی مادّی منفعت کے بغیر کسی معاملے پر اپنا سرمایہ لگانے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اگرچہ وہ معاملہ اس کے اپنے قومی وجود اور آزادی کی بقا کا معاملہ ہو۔ لیکن ایک مسلمان اور بہ لفظ نظر! فیا للعجب و یا اسفاہ! مسلمان کو تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا تھا کہ کسی دنیوی منفعت کی امید دل میں پالے بغیر خالصۃً اللہ کی راہ میں مال صرف کرنا اس کے ایمان کا بنیادی تقاضا ہے اور سچے اہلِ ایمان کی نشانی اور خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ دوسرے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ اللہ کی راہ میں اپنا مال بھی خرچ کرتے ہیں:

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُونَ ۝

(حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے، پھر انہوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اپنے دعویٰ ایمان میں وہی لوگ سچے ہیں۔ (الحجرات ۱۵)

الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا (جو لوگ نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو رزق ان کو دیا ہے اس میں

سے ہماری راہ میں خرچ کرتے ہیں، ایسے ہی لوگ حقیقی مومن ہیں۔ (الانفال ۲-۴)

اور انفاق فی سبیل اللہ سے گریز یا بیزاری سے خرچ کرنے کو اللہ نے منافقت کی علامت قرار دیا ہے: وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ یَّتَّخِذُ مَا یُنْفِقُ مَغْرَمًا (ان بدویوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جو راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں تو اپنے اوپر زبردستی کی چٹی سمجھتے ہیں۔ التوبہ ۹۸) اس سے پہلے کی آیت میں ان بدویوں کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ اَشَدُّ کُفْرًا وَّنِفَاقًا کفر و نفاق میں بہت ہی سخت ہیں۔

قرآن کریم میں اہلِ ایمان کو انفاق فی سبیل اللہ کے لیے بار بار ابھارا گیا ہے سورۃ المنافقون میں ارشاد ہوتا ہے۔ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَاۤ اَخَّرْتَنِیْۤ اِلٰۤى اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (۱۰) جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت آجائے اور اس وقت وہ کہے کہ اے میرے رب کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دے دی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہو جاتا۔

سورۃ الصف میں انفاق فی سبیل اللہ کو عذاب سے نجات دلانے والی تجارت کہا ہے۔ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِیْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ ○ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۱۰-۱۱) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، میں تمہیں وہ تجارت بتاؤں جو تم کو دردناک عذاب سے بچا لے۔ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آؤ اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کرو۔

اکثر مقامات پر اللہ کی راہ میں انفاق کو اللہ کو قرض دینے سے تعبیر کیا گیا ہے اور اہل ایمان کو اس کی ترغیب دی گئی ہے۔ سورۃ التغابن میں اللہ تعالیٰ نے ڈرتے رہنے

اور احکام الہٰی کو سن کر ان کی اطاعت کرنے کی تلقین کے ساتھ کہا گیا ہے۔ وَاَنْفِقُوْا خَیْرًا لِّاَنْفُسِکُمْ ؕ وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا یُّضٰعِفْہُ لَکُمْ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ؕ (۱۶۔۱۷) اور اپنے مال خرچ کرو، یہ تمہارے ہی لیے بہتر ہے۔ جو اپنے دل کی تنگی سے محفوظ رہ گئے بس وہی فلاح پانے والے ہیں۔ اگر تم اللہ کو قرضِ حسن دو تو وہ تمہیں کئی گنا بڑھا کر دے گا اور تمہارے قصوروں سے درگزر فرماتے گا۔

سورۃ المائدہ میں ارشاد فرمایا ہے: لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوۃَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّکٰوۃَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْھُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُکَفِّرَنَّ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَلَاُدْخِلَنَّکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ (۱۲) اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو کہ میں تمہاری برائیاں تم سے زائل کر دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کو قرآن کریم ہلاکت اور تباہی کا موجب قرار دیتا ہے: وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ (البقرہ ۱۹۵) اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے بجائے مال و دولت سینت سینت کر رکھتے اور اس پر سانپ بن کر بیٹھ جاتے ہیں انہیں نہایت ہولناک عذاب کی وعید سنائی گئی ہے: وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ یَّوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ؕ ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ (التوبۃ ۳۴-۳۵)

اَلسَّلَامَةِ وَالْاِسْلَامِ رَبِّیْ وَرَبُّکَ اللّٰہُ ھِلَالُ خَیْرٍ وَّرُشْدٍ ھِلَالُ خَیْرٍ وَّرُشْدٍ ۔ اے اللہ! طلوع فرما ہم پہ یہ چاند امن، ایمان، سلامتی اور اسلام کے ساتھ۔ اے چاند! میرا پروردگار اور تیرا پروردگار اللہ ہے۔ بھلائی اور نیکی کا چاند بھلائی اور نیکی کا چاند . . . . .

دل کی صفائی اور زبان و نگاہ کی پاکیزگی و عفت کے لیے پڑھے۔ اَللّٰھُمَّ طَہِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِیْ مِنَ الرِّیَآءِ وَلِسَانِیْ مِنَ الْکَذِبِ وَعَیْنِیْ مِنَ الْخِیَانَۃِ فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَآئِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ ط اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے پاک صاف کر دے اور میرے کام کو دکھاوے اور زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو چوری اور خیانت سے، کیونکہ تو آنکھ کی خیانت اور دل کی پوشیدہ باتوں کو خوب جانتا ہے۔

ظاہر و باطن کی صالحیت اور نیک اہل و عیال اور حلال مال عطا کرنے کی درخواست ان الفاظ میں کرے: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ سَرِیْرَتِیْ خَیْرًا مِّنْ عَلَانِیَتِیْ وَاجْعَلْ عَلَانِیَتِیْ صَالِحَۃً اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ مِنْ صَالِحِ مَا تُؤْتِی النَّاسَ مِنَ الْاَھْلِ وَالْمَالِ وَالْوَلَدِ غَیْرِ الضَّآلِّ وَلَا الْمُضِلِّ ۔ اے اللہ! میرے باطن کو میرے ظاہر سے اچھا کر دے اور میرے ظاہر کو بھی اچھا کر دے۔ اے اللہ! میں تجھ سے وہ اچھی چیز مانگتا ہوں جو لوگوں کو تو عطا فرماتا ہے۔ یعنی اہل و عیال، مال و اولاد۔ جو نہ خود گمراہ ہوں اور نہ دوسروں کو گمراہ کرنے والے ہوں۔

دنیا اور آخرت کی بھلائی اور اصلاح احوال کی دعا اس طرح مانگے۔

اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ لِیْ دِیْنِیَ الَّذِیْ ھُوَ عِصْمَۃُ اَمْرِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ دُنْیَایَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَاشِیْ وَاَصْلِحْ لِیْ اٰخِرَتِیَ الَّتِیْ فِیْھَا مَعَادِیْ وَاجْعَلِ الْحَیٰوۃَ زِیَادَۃً لِّیْ فِیْ کُلِّ خَیْرٍ وَّاجْعَلِ الْمَوْتَ رَاحَۃً لِّیْ مِنْ کُلِّ شَرٍّ ۔ اے

نتیجے میں تو ہمارے اور تیری نافرمانی پر مبنی اعمال کے درمیان رکاوٹ بن جائے ہمیں وہ ذوقِ طاعت و فرماں برداری عنایت کر جو ہمیں تیری جنت تک پہنچا دے اور ہمیں وہ یقین بخش جس کی بدولت دنیا کی مصیبتیں ہم پر آسان ہو جائیں اور جب تک تو ہمیں زندہ رکھے ہمارے کان، آنکھیں اور دوسری جسمانی قوتیں ہمیں عطا کیے رکھ اور ان میں سے ہر قوت کا ہمیں وارث بنا دے، جو ہم پر ظلم کرے اس سے تو ہمارا انتقام لے، ہمارے ساتھ جو دشمنی سے پیش آئے اس پر ہمیں نصرت عطا فرما۔ ہمارے دین کو مصیبتوں سے محفوظ رکھ، دنیا کو ہماری زندگی کا سب سے بڑا مقصد نہ بنا اور نہ اسے ہمارے علم کا مقصود بنا اور ہم پر ایسے لوگوں کو مسلط نہ کر جو ہم پر رحم نہ کھائیں۔

سفر پر روانہ ہو تو ان الفاظ میں اپنے رب کو پکارے۔ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ الصَّاحِبُ فِی السَّفَرِ وَالْخَلِیْفَةُ فِی الْاَھْلِ وَالْمَالِ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ وَعْثَاءِ السَّفَرِ وَکَاٰبَةِ الْمَنْظَرِ وَسُوْءِ الْمُنْقَلَبِ فِی الْاَھْلِ وَالْمَالِ"

(مسلم شریف)

اے اللہ! تو سفر میں ہمارا ساتھی اور ہمارے اہل و عیال اور گھر بار کا نگران و نگہبان ہے۔ اے اللہ! ہم پر ہمارا سفر آسان کر دے، زمین کی طنابیں ہمارے لیے کھینچ دے اور اس کی دور دراز کی مسافت کو ہمارے لیے لپیٹ دے۔ اے اللہ! میں سفر کی صعوبتوں سے، بُری حالت میں واپسی سے، نفع کے بعد نقصان سے اور مظلوم کی بددعا سے اور اپنے اہل و عیال کو بُرے حالوں دیکھنے سے تیری پناہ کا طلب گار ہوں۔ سفر سے واپس آئے تو یہ کلمات زبان سے ادا کرے۔ آئِبُوْنَ تَائِبُوْنَ عَابِدُوْنَ سَاجِدُوْنَ لِرَبِّنَا حَامِدُوْنَ "ہم لوٹنے والے ہیں، سفر سے سلامتی کے ساتھ اپنے گھر۔ توبہ کرنے والے ہیں اپنے رب کی عبادت اور تعریف کرنے والے ہیں۔

چاند کو دیکھے تو کہے: اَللّٰھُمَّ اَھِلَّہٗ عَلَیْنَا بِالْاَمْنِ وَالْاِیْمَانِ وَ

اللہ، تو میرے دین کی اصلاح فرما جس سے میرے معاملات کی عصمت وابستہ ہے
اور میری دنیا کی اصلاح فرما جس سے میری روزی تعلق رکھتی ہے، میری آخرت کی
اصلاح فرما جس میں مجھے لوٹ کر جانا ہے۔ میرے لیے زندگی کو ہر بھلائی میں اضافے
کا سبب بنا دے اور موت کو ہر قسم کے شر و فساد سے بچنے کی راحت کا سبب
بنا دے۔

الغرض صبح سے شام تک اور پیدائش سے موت تک ہر معاملے میں رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائیں تعلیم فرمائی ہیں۔ زندگی کے شب و روز میں بدلتے ہوئے
ہر موقعے اور ہر عمل کے مطابق زبان و قلب پہ دعاؤں کے ترانے اللہ تعالیٰ پہ ایمان
و توکل کو ہر آن پختہ کرتے ہیں، اس کے اندر یہ یقین کامل پیدا کرتے ہیں کہ اس کائنات
کی مالک و خالق، نگران و حافظ، اس کو ایک نظام کے تحت چلانے والی ایک بزرگ و
برتر اور مدبر الامر ذات ہے جس کی مٹھی میں یہ عظیم کائنات ایک ذرۂ بے مقدار سے
بھی کم حیثیت رکھتی ہے۔ انسان کی پیشانی اس کے ہاتھ میں ہے، اس کی بے کسی
اور بے بسی میں وہی سہارا بنتی ہے، اس کے سوا کوئی دست گیر ہے نہ مشکل کشا۔
اس کی مرضی کے بغیر درخت کا ایک پتہ تک جنبش نہیں کر سکتا، وہی زندگی بخشتی ہے
اور وہی موت، اس کی مشیت کے آگے کسی کو یارائے دم زدن نہیں، رزق کے
خزانے اسی کے قبضے میں ہیں، اس کی خدائی کے کسی معاملے میں کوئی اور ہستی شریک
اور ساجھی نہیں۔ چاہے وہ پیغمبر ہوں یا ولی اور قطب ابدال، فرشتے ہوں یا کوئی
اور مخلوق، آدمی جس ہستی کو بھی اللہ کے کاموں میں شریک سمجھتا ہے، شرک کرتا ہے
اور شرک وہ ظلم عظیم ہے کہ اللہ اسے کبھی معاف نہیں کرے گا۔

دعائیں بندے کا تعلق اپنے خالق و آقا کے ساتھ ہر لحظہ قائم رکھتی ہیں، اٹھتے
بیٹھتے، چلتے پھرتے، سوتے جاگتے، زندگی کے کاروبار میں حصہ لیتے وقت اس

کے ذہن میں اپنے بندہ ہونے اور اللہ تعالیٰ کا مالک و آقا ہونے کا تصوّر ابھارتی ہیں اس کے اندر یہ احساس بھی ہر وقت تازہ و جوان رکھتی ہیں کہ وہ اللہ کا محض ایک عام بندہ نہیں ہے بلکہ مسلم و فرماں بردار بندہ ہے، اسے دنیا میں اپنی زندگی ایک فرماں بردار مسلمان کی حیثیت سے بسر کرنی ہے، اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اس دین کے مطابق گزارنا ہے جو اللہ نے اہلِ ایمان کے لیے پسند فرمایا ہے اور جس کے سوا ہر دوسرا دین باطل اور گمراہی و کج روی کا دین ہے۔

پھر انسان کو زندگی میں گوناگوں حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، کبھی وہ خوش حالی اور کامیابی و کامرانی کے جھولے جھولتا ہے اور کبھی فقر و افلاس اور ناکامی و نامرادی کے زخم سہتا ہے، ان دونوں حالتوں میں اسے نفسیاتی طور پر ایک ایسی قوّت کا سہارا درکار ہوتا ہے جسے تھام کر وہ اپنی شخصیّت کو بگڑنے اور شکستہ ہونے سے بچا سکے۔ دعائیں اس قوّت سے انسان کا رابطہ قائم کرتی ہیں اور اس قوّت پر یقین اور اعتماد و توکّل اسے تباہ کُن جذبات و احساسات، غلط اور گمراہ کُن رجحانات و عواطف سے محفوظ رکھنے کے لیے "دفاعی خط" فراہم کرتا ہے جس کے ذریعے اس کی نفسیات توڑ پھوڑ سے بچ سکتی ہے۔ جن معاشروں میں اللہ تعالیٰ کی ذات پر اب بھی ایمان و توکّل پایا جاتا ہے ان میں نفسیاتی عوارض بہت کم پائے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس یورپ اور امریکہ کے معاشروں میں نفسیاتی بیماریاں جس طرح عام ہو چکی ہیں ان کے اسباب و عوامل کا تجزیہ کیا جائے تو یہی نتیجہ سامنے آئے گا۔ کہ یہ معاشرے اس فطری اور حقیقی "خطِ دفاع" سے محروم ہو چکے ہیں۔ وہ مصنوعی طور پر دفاعی خطوط فراہم کرنے کی تگ و دو کرتے ہیں یہ "دفاعی خطوط" نہ صرف ناکارہ ثابت ہوتے ہیں بلکہ انسان کی نفسیاتی توڑ پھوڑ کی رفتار وسیع اور تیز کر دیتے ہیں۔ دعاؤں سے اللہ تعالیٰ پر یقینِ کامل اور اعتماد و توکل جب رفعت کمال پر پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ طے کردہ تقدیر تک بدل دیتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے دعا مومن کا ہتھیار ہے۔ اَلدُّعَاءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ۔ نیز فرمایا۔ اللہ کے آگے جو شخص دستِ سوال دراز نہیں کرتا اللہ اس سے ناخوش ہوتا ہے۔ ایک شاعر نے اس مضمون کو بڑے حسین پیرائے میں باندھا ہے۔

لَا تَسْئَلَنَّ بَنِیْ آدَمَ حَاجَۃً

وَاسْئَلِ الَّذِیْ اَبْوَابُہٗ لَا تُحْجَبُ

اَللّٰہُ یَغْضَبُ اِنْ تَرَکْتَ سُؤَالَہٗ

وَابْنُ اٰدَمَ حِیْنَ یُسْئَلُ یَغْضَبُ

کسی انسان سے اپنی حاجت نہ مانگو، اس سے مانگو جس کے جود و کرم کے دروازے کبھی بند نہیں ہوتے۔ اگر اللہ سے مانگنا چھوڑ دو گے تو اللہ تعالیٰ ناخوش ہو جائے گا۔ اور انسان سے مانگو گے تو وہ ناراض ہو جائے گا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہم مسلمانوں کا یہ تعلق یا تو بالکل کٹ چکا ہے یا کمزور ہو چکا ہے۔ اب اللہ کے بجائے ہماری وابستگی غیر اللہ کے ساتھ ہے۔ سفر ہو یا حضر، گھر ہو یا بازار، مسجد ہو یا اجتماع و تمدن کا ایوان، ہر جگہ غیر اللہ ہی سے ہم نے امیدیں باندھ لی ہیں۔ زندگی کے مختلف معاملات میں جو مسنون دعائیں پہلے ہر مسلمان بچے کو یاد کرائی جاتی تھیں، آج ان کا ذکر تو در کنار مسلمان کہلانے والوں کی ایک بڑی اکثریت کو کلمہ تک سیدھا نہیں آتا۔ بچے ہوں یا جوان، ان سے آپ گانے سن سکتے ہیں، انہیں نیلو، نورجہاں، صبیحہ، سنتوش کے سوانح ازبر یاد ہوں گے، مگر اللہ اور رسول کے ارشادات، قرآن اور احادیث میں بیان کردہ دعاؤں سے بالکل بے خبر پائیں گے۔

نگہ کی نامسلمانی سے فریاد

(۱۰ستمبر ۱۹۶۱ء)

تن آسان مومن

جدّہ کی خبر ہے کہ سعودی عرب کی حکومت نے جبلِ عرفات پر درخت لگانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ حجّاج بادِ سموم کی وحشت ناکیوں سے محفوظ رہیں۔ خبر یہ بھی کہتی ہے کہ ہر سال بہت سے حاجی اس سائے سے محروم چٹیل پہاڑی پر سخت دھوپ اور گرمی سے مر جاتے ہیں۔ خدا جانے دوسروں کا تاثر کیا ہے، میں نے جب سے یہ خبر پڑھی ہے دل و دماغ میں ہلچل برپا ہے، خیالات موج در موج امڈتے آ رہے ہیں۔ سعودی حکومت کا فیصلہ بظاہر بہت خوب ہے۔ عرفات کا وسیع و عریض میدان بالکل سپاٹ ہے اور عرفات کی پہاڑی بھی جسے "جبل الرحمۃ" کہتے ہیں، چٹیل ہے اور دن کے وقت جبکہ آفتاب پوری آب و تاب سے چمک رہا ہو دھوپ اور حدّت کی شدّت سے بچنے کے لیے نہ کوئی سایہ دار درخت ہے نہ کوئی اور شے۔ یہاں ۹ ذی الحجہ کو منیٰ سے فجر کی نماز پڑھ کر پہنچتے ہیں اور غروب آفتاب کے بعد سے واپسی شروع ہو جاتی ہے اور عشاء تک سارا میدان خالی ہو جاتا ہے۔ عرب کی گرمی اور اس پہ جب لُو بھی چل پڑے تو اس میدان میں جو قیامت بھی برپا ہو کم ہے لیکن اس کے باوجود لاکھوں انسانوں میں سے چند سو یا ہزار کا لُو اور گرمی کے ہاتھوں مرنا فی الواقع اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شانِ ربوبیت کا کرشمہ ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ چند سو یا ہزار کی موت بھی ہمیں گوارا نہیں ہے، حالانکہ جن لوگوں کی موت لکھ دی گئی ہے وہ تو اگر اسے گی جاہے سایہ فراہم ہو جائے اور درختوں کے لگ

جانے سے درجۂ حرارت نہ گھٹ جائے، اس موت سے انسان کو نہ انفرادی کوشش بچا سکتی ہے اور نہ حکومت کی اجتماعی جدّوجہد۔

لوگوں کو موت سے محفوظ رکھنے کی سعی بلاشبہ بڑی نیک ہے۔ خود آدمی کی بھی یہی تمنّا ہوتی ہے کہ وہ خیریت اور سلامتی کے ساتھ مناسکِ حج ادا کر کے اپنے بال بچّوں اور عزیز و اقارب میں واپس پہنچے اور حکومت کی خواہش بھی یہی ہونی چاہیئے کہ حجاج کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم ہوں اور وہ کم سے کم مشکلات سے دوچار ہوں اور ہر شخص حجاز سے بسلامت واپس اپنے گھر جائے ــ مگر اس معاملے میں ایک اور پہلو بھی ہے اس منصوبے سے واضح ہوتا ہے کہ ہم مسلمان کتنے سہل پسند، تن آسان اور راحت کوش ہوتے جاتے ہیں۔ حج کے مناسک پر غور فرمائیے۔ آپ محسوس کریں گے کہ حج اپنے دامن میں جہاں اور بے شمار فوائد اور بھلائیاں اور فلاح و خیر کا سرمایۂ عظیم رکھتا ہے وہاں ایک فائدہ یہ بھی رکھتا ہے کہ وہ ایک بندۂ مومن کو تعب و مشقّت کیسے بہرہ ور کرتا اور جفاکوش بناتا ہے۔ ایّامِ حج تگ و دو، سعی و جہد، طاعت کیشی، جانفشانی، اور جفاکوشی کے ایام ہوتے ہیں۔ احرام زیبِ تن کیے مکّہ معظمہ پہنچتے ہی کعبۃ اللّٰہ کے گرد طواف، صفا و مروہ کے درمیان سعی، منیٰ میں قیام، عرفات کی طرف کوچ اور دن بھر قیام، مزدلفہ میں شب بسری نہیں شب بیداری، منیٰ میں واپسی اور رمی جمار اور قربانی پھر مکّہ کو واپسی اور طوافِ کعبہ، دعائیں اور نمازیں ـــ ان سارے مراحل میں کیا ایک لمحہ بھی سکون و آرام کا میسّر آسکتا ہے؟ راحت و سکون مطلوب ہو تو اپنے آرام دہ گھروں اور پرتکلّف عشرت کدوں کو چھوڑ کر وادئ غیر ذی زرع کا رُخ ہی کیوں کیا جائے؟ یہاں ایک مومن عیش و عشرت کی تلاش میں نہیں اپنے دلِ افسردہ کو زندگی کی حرارت سے ہم کنار کرنے اور فریب خوردہ عیش نفس کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں سعی و جہد اور محنت و مشقت کا خوگر بنانے ہی کے لیے آتا ہے۔

طلوعِ آفتابِ اسلام سے اب تک ہر سال ہزاروں لاکھوں مسلمان حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے مکہ مکرمہ جاتے رہتے ہیں۔ گرمی اور شدید گرمی پہلے بھی پڑتی ہو گی اور لُو لگنے سے بہت سے زائرین بیت اللہ پہلے بھی جاں بحق ہو جاتے ہوں گے ___ بلکہ آج تو بڑی سہولتیں میسر ہیں۔ پانی کی، آمد و رفت کے وسائل کی، بروقت جدید ترین علاج کی۔ پہلے تو یہ سہولتیں بھی عنقا تھیں یا اگر میسّر تھیں تو اتنی نہیں جتنی آج ہیں۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں میں چند سو یا ہزار پہلے بھی مر جاتے ہوں گے۔ لیکن ان اموات پر جس طرح پریشانی اور اضطراب کا اظہار آج کیا جا رہا ہے یقیناً پہلے نہیں کیا جاتا تھا۔ پہلے مسلمان اپنے گھروں سے سفرِ حج پر نکلتے تھے تو اس تمنّا اور آرزو کو دل میں لیے کہ اے کاش کعبۃ اللہ اور نبی کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جوار میں موت آجائے۔

___ اور آج ہم ہیں کہ موت سے تو بھاگتے ہی ہیں، تعب و مشقّت کے عملِ صالح کو بھی عیش و راحت کا رنگ دینے کی تمنّا کرتے ہیں۔

عرفات کے میدان میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں حاضری قیامت کے روز کی حاضری سے مماثلت رکھتی ہے۔ مشرق و مغرب اور شمال و جنوب سے آئے ہوئے خدا کے بندے دنیا و مافیہا کی ہر شئے سے منہ موڑ کر حتّٰی کہ روزمرّہ کا لباس بھی ترک کر کے دو سفید چادروں میں لپٹے، ننگے سر وسیع و عریض لق و دق چٹیل میدان میں کھڑے اپنے اللہ کے آگے دامن پھیلائے دعا و مناجات اور گریہ و زاری میں محو ہو جاتے ہیں۔ دور دور تک کہیں سایہ نظر نہیں آتا۔ آفتاب کی تمازت سے چٹیل زمین گویا تانبے کی طرح تپ رہی ہوتی ہے، گرم ہوا کے جھونکے بدن کو جھلسائے دیتے ہیں، پیاس ہے کہ بار بار پانی پینے سے بھی بجھنے میں نہیں آتی، مگر اس کے باوجود اہلِ ایمان انابت الی اللہ میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ یہ ماحول گویا اس روز کی یاد دلاتا ہے جب اولادِ آدم قیامت کے میدان میں جمع ہو گی۔ دنیا میں عیش و

تمدن کے جو وسائل اس نے اپنی عقل رسا سے فراہم کیے ہیں ان سب سے محروم، مادرزاد برہنہ، ننگے سر، ننگے پاؤں، لرزاں و ترساں اپنے رب کے حضور کھڑی ہو گی۔ محو دعا و مناجات نہیں، اپنے رب کے فیصلے کی منتظر۔ دعا و مناجات کا جو وقت تھا وہ تو ختم ہو چکا اب حساب کتاب کا وقت ہو گا اور آج یہاں کی گریہ وزاری نہیں، دنیا کی گریہ وزاری کام آئے گی۔ عرفات میں حاضری فی الواقع انسان کے ذہن میں قیامت کی حاضری کا تصوّر اجاگر کر دیتی ہے۔ اس تصوّر کے ابھارنے میں عرفات کے منظر اور ماحول کا بڑا حصّہ ہوتا ہے، اگر اس ماحول کو تبدیل کر دیا گیا تو اس میدان میں حاضری کا ایک عظیم مقصد فوت ہو جائے گا۔

آج بے سایہ و شجر عرفات یہ یاد دلاتا ہے کہ قیامت کے میدان میں بھی کوئی درخت اور سایہ نہ ہو گا، اس کی گرمی قیامت کی گرمی کا تصوّر دلاتی ہے، لیکن اگر عرفات کے میدان اور جبل الرحمت پر درخت لگا دیے گئے تو اس کا موجودہ منظر اور ماحول کے بدلتے ہی وہ تصوّر بھی ختم ہو جائے گا جو اس سے وابستہ رکھا گیا ہے۔

پھر آج تو درجہ حرارت کو کم کرنے اور سایہ فراہم کرنے کے نیک مقصد سے درخت لگانے کا فیصلہ ہوا ہے، کیا خبر کل کلاں یہ بھی سوجھے کہ عرفات کے میدان میں پارک بنائے جائیں جہاں ہری ہری دوب اور رنگ برنگ بیل بوٹے دل و نظر کو سرور بخش رہے ہوں پگھلی ہوئی چاندی کے فوارے اچھل رہے ہوں اور ننھی ننھی سیمیں ندیاں بہہ رہی ہوں۔ ایک طرف بڑی سی مصنوعی جھیل ہو جس میں روپہلی سنہری چھوٹی بڑی مچھلیاں تیر رہی ہیں جھیل کے کناروں پر پتھر کی خوشنما بنچیں قطار در قطار نصب ہوں تاکہ جب زائرین دعا و مناجات سے تھک جائیں تو گھڑی دو گھڑی کے لیے سیر سپاٹے کو ادھر آ نکلیں۔ وسط میں ایک عالی شان ہوٹل ہو جہاں مشروبات و ماکولات کے علاوہ معصوم سی تفریحات کا سامان بھی ہو۔ انسان اگر چاہتا ہے کہ وہ گرم لُو کے جھونکوں اور آفتاب کی تپش سے محفوظ رہے تو وہ یہ خواہش بھی کر سکتا ہے کہ عرفات کا اُجاڑ اور وحشت و پرہیبت منظر دلکش و سرور انگیز

نظارے میں بدل جاتے۔ ہم مسلمانوں میں ایسے بزرجمہر تو پیدا ہو ہی چکے ہیں جو اپنے قبرستانوں کو عیسائیوں کے قبرستانوں کا سا رنگ روپ دینے کے خواہش مند ہیں، کیا عجب وہ لوگ بھی پیدا ہو جائیں جو مکہ مکرمہ اور اس کے مضافات کو جنیوا اور نیویارک کے مناظر سے مالا مال دیکھنے کے متمنی ہوں۔ ایسا کرنے سے بہت سے لوگوں کی تسکین دل و نظر کا سامان تو لیقینا ہو جائے گا، لیکن جو تاریخ، روایات اور مقاصد اس مقدس شہر اور اس کے مضافات میں پھیلے ہوتے مقامات حج کے ساتھ وابستہ ہیں، ان سب کا خاتمہ ہو جائے گا۔

سوچ بچار کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ عرفات، جبل الرحمت، منیٰ، صفا و مروہ وغیرہ اسلام کی دینی تاریخ کے آثار اور شعائر اللہ ہیں۔ ان آثار و شعائر کو اسی طرح جوں کا توں برقرار اور محفوظ رکھنا چاہیئے جیسا کہ وہ عہد رسالت میں تھے۔ افسوس ہے کہ اسلامی تاریخ کے بہت سے آثار بالکل ختم کر دیے گئے ہیں، بچے کھچے کس مپرسی کے عالم میں ہیں۔ ان میں سے بعض مکہ مکرمہ کے تعمیراتی تغیرات میں ختم ہوتے جا رہے ہیں، حالانکہ جن قوموں کے پاس ماضی کی تاریخ کے کوئی آثار نہیں ہوتے وہ آثار بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ کوئی لیڈر مر جاتا ہے تو جس کمرے میں اس نے جان دی تھی اس کو ٹھیک اسی طرح محفوظ کر دیتی ہیں جس طرح اس لیڈر کی زندگی میں اس کی موت کے وقت تک تھا جس چارپائی اور بستر پر وہ مرا تھا اور موت کے وقت اس کے کمرے کی مختلف اشیا جس حالت میں تھیں انہیں ٹھیک اسی حالت میں رہنے دیا جاتا ہے، تاکہ آنے والی نسلیں انہیں دیکھ کر اپنے لیڈر، اس کے طرز زندگی، اس کے ذوق نظر اور اس کی عادات وغیرہ کا تصور کر سکیں۔ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی سرزمین کا چپہ چپہ اسلامی تاریخ کے آثار سے مالا مال تھا۔ وہ آثار جن سے بڑھ کر آثار دنیا کی کسی قوم کے پاس نہ تھے۔ جنہیں دیکھ کر امت مسلمہ کی تاریخ کے ابتدائی ابواب اور اس کے عظیم و ایمان افروز

مناظر نگاہوں میں پھر جاتے تھے، مگر افسوس صد افسوس جو آثار ہمارے مجد و شرف کے آئینہ دار تھے آج ان میں سے بہت کم اپنی اصلی حالت میں موجود ہیں اور جو موجود ہیں ان میں سے اکثر کی خبر ان شہروں میں بسنے والوں کو بھی نہیں ہے۔ بس اکّا دکّا وہ لوگ جانتے ہیں جنہیں ان آثار سے دلچسپی ہے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ شاید ان کی نشان دہی کرنے والا بھی کوئی باقی نہ رہے گا۔

یہ تو اسلامی تاریخ کے عام آثار کی بات تھی رہے دینی آثار تو کیا صفا و مروہ اور ان کے درمیان سعی کا اپنی اصلی شکل و ہیئت میں باقی ہے؟ اور عرفات میں درخت لگانے کا جو فیصلہ کیا گیا ہے، اسے جامۂ عمل پہنانے کے بعد اس کی حقیقی شکل و صورت برقرار رہ سکے گی؟

(۱۰ ردسمبر ۱۹۹۱ء)

اسلامی شعائر کا نیا روپ

میرے محلّے کی جامع مسجد سے علی الصباح جبکہ دنیا ابھی لذتِ خواب سحر میں گم ہوتی ہے، لاؤڈ اسپیکر پر اذان کی صدا گونجتی ہے اور ساکت و صامت فضا کو مرتعش کرتی، اہلِ ایمان کو بیدار کرتی اور غافل دلوں کو جھنجھوڑتی ہوئی فضا میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ اذان کے کلمات کتنے انقلاب آفرین ہیں اور اگر پکارنے والے کو اس بات کا احساس و شعور ہو کہ وہ کتنے عظیم پیغام کا اعلانِ عام کر رہا ہے اور سننے والے کو خبر ہو کہ انہیں کس مقصدِ عظیم کی دعوت دی جا رہی ہے تو زندگیوں میں کتنا زبردست تغیر آسکتا ہے! لیکن نہ پکارنے والے کو علم ہوتا ہے کہ وہ کیا پکار رہا ہے اور نہ سننے والے باخبر ہوتے ہیں کہ اس پکار کا مطلوب و مقصود کیا ہے۔ سننے والے خوابِ شب کے خوابِ شیریں میں مست رہتے ہیں اور پورے محلّے میں گنے چُنے افراد ہوتے ہیں جو اس پکار کو سن کر اُٹھ بیٹھتے ہیں اور مسجد کی راہ لیتے ہیں۔ ادھر پکارنے والا کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں سے نہیں حلق سے پکار رہا ہے۔ اس کی زبان پر ایک ایسی پکار ہے جو دل کے سوز و درد، جذب و شوق اور آتشِ عشق سے بالکل تہی دامن ہے۔ ایک سپاٹ اور بے جذب و سوز آواز جو مائیکروفون کی قوت کے سہارے فضا میں پھیلتی ہے اور بے رُوح گونج پیدا کرتی ہوئی اس کی پہنائیوں میں ڈوب جاتی ہے۔ ع

رہ گئی رسمِ اذان رُوحِ بلالی نہ رہی

اور یہ رسم دن رات میں پانچ مرتبہ ادا کی جاتی ہے۔ سوزِ بلال رضؓ سے محروم یہ آواز کانوں کے پردے سے ٹکراتی ہے، مگر دلوں پہ کوئی اثر نہیں ہوتا جیسے کوئی کُند تلوار چٹان سے ٹکرائے اور اچٹ کر رہ جائے۔ جب رُوحِ بلالی رضؓ اس پکار میں موجزن تھی تو اسے سن کر وریاوں کے دل دہل جاتے تھے، فضا تھرّا اُٹھتی تھی، پہاڑوں پہ رعشہ طاری ہو جاتا تھا اور انسانی زندگیوں کی کایا پلٹ ہو جاتی تھی۔ لیکن آج ایسی آواز کہیں بھی سننے میں نہیں آتی۔ ؎

سنی نہ مصر و فلسطین میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشۂ سیماب

مؤذّن اذان کہہ چکتا ہے تو ایک ثانیے کے توقّف کے بعد مائیکروفون ہی پہ عربی میں ایک لمبا چوڑا درود جس کا سیرت و احادیث میں کہیں ذکر نہیں پوری قراءت کے ساتھ پڑھنے لگتا ہے۔ یہ سلسلہ اس نے چند ہی روز ہوئے شروع کیا ہے۔ اس درود کا مطلب و مفہوم کیا ہے؟ اگر اس سے پوچھا جائے تو شاید وہ نہ بتا سکے بس ایک رٹی ہوئی عبادت طوطے کی طرح وہ دہرا دیتا ہے اور جو لوگ سنتے ہیں وہ بھی ننانوے فی صد ایسے ہوتے ہیں جو یہ تک تمیز نہیں کر سکتے کہ مؤذّن قرآنِ کریم کی تلاوت کر رہا ہے یا درود پڑھ رہا ہے؟ تاہم وہ ان باتوں سے بے نیاز اپنی دھن میں لگا رہتا ہے۔ دوسری مسجدوں سے اذانیں بلند ہو رہی ہیں، لیکن مائیکروفون کی آواز ان سب پر غالب ہے۔ کوئی دس بارہ منٹ میں یہ وظیفہ ختم ہوتا ہے اور پھر فضا میں سکوت طاری ہو جاتا ہے۔

پہلے پہل تو میں نے اسے پڑھنے والے کی عقیدت پر محمول کیا لیکن پھر فوراً ایک خیال پھانس بن کر کھٹکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مطہرہ ایک مسلمان کی

عقیدت و محبت کا مرجع و مرکز ہے۔ جس دل میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت نہیں وہ ایمان سے خالی ہے۔ اس ذات پاک پر درود و سلام بھیجنا ایک مسلمان کا بہت بڑا سرمایۂ نجات ہے۔ وہ نماز مکمل نہیں ہوتی جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود نہ بھیجا جائے، وہ دعا بارگاہِ الٰہی میں مستجاب نہیں ہوتی اور زمین و آسمان کے درمیان معلق رہتی ہے جب تک کہ حبیبِ خدا پر درود و سلام کا ہدیہ اس کے ساتھ نہ ہو۔ خود اللہ تعالےٰ اور اس کے فرشتے چمنِ انسانی کے اس گلِ سر سبد پر درود و سلام بھیجتے ہیں اور اللہ نے ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بھی درود و سلام بھیجیں۔ اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ (الاحزاب ۵۶)

احادیث میں درود شریف کے بے شمار فضائل بیان ہوئے ہیں۔ انسؓ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "جو شخص مجھ پر ایک بار درود بھیجے گا اللہ اس پر دس مرتبہ رحمت نازل کرے گا، اس کے دس گناہ معاف فرمائے گا اور دس درجے بلند فرمائے گا" (نسائی)۔ عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو بخیل قرار دیا ہے جس کے سامنے حضورؐ کا ذکر بابرکت ہو اور وہ آپؐ پر درود نہ بھیجے۔

پھر کون بدبخت ہے جو اس نعمتِ عظمیٰ کا انکار کرے، اپنا نام بخیلوں کے زمرے میں لکھوائے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جوار سے محرومی اور دونوں جہان میں رسوائی اور زیاں مول لے؟ لیکن ہر اچھے نیک کام کرنے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص نماز میں درود، قعدہ کے بجائے قیام یا رکوع و سجود میں پڑھنے لگے تو اس کا یہ درود اس کے منہ پر مار دیا جائے گا کہ خود اس ذاتِ اطہرؐ نے جس پر کہ وہ درود بھیج رہا ہے یہ تعلیم دی ہے کہ درود نماز کی کس حالت میں اور کن الفاظ میں پڑھنا چاہیئے۔ اگرچہ تمام اوقات میں درود و سلام بھیجنے پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں، لیکن اس کا یہ

مطلب بھی نہیں ہے کہ درود اس طرح پڑھا جائے جس کی نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے اور نہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت و اسوہ میں رہنمائی ملتی ہے۔ کیا ہمارے دلوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی بڑھ کر ہو سکتی ہے؟ اصحاب رسول ؐ کی زندگیاں ہمارے سامنے سیرت و رجال کی کتابوں میں کھلی پڑی ہیں، کیا ہم انہیں بھی درود و سلام کے انہی مصنوعی ہنگامہ آرائیوں میں گم پاتے ہیں جن میں ہم آج اپنے قلب و روح کی زندگی سمجھتے ہیں؟

صحابہؓ کی زبانیں ہر وقت درود و سلام کے نغمات سے معطر رہتی تھیں، لیکن انہیں کبھی بلند آواز سے درود و سلام پڑھتے نہیں سنا گیا۔ انہیں ان لمحات میں بھی جب جوش و جذبات انسان پر غالب آجاتے ہیں۔ ادب، وقار اور احترام و سکون کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے اور تصنع اور ہنگامہ آرائیوں سے بچنے کی تعلیم دی گئی تھی۔ ایک غزوہ میں حالات سے متأثر ہو کر صحابہ کرامؓ نے بلند آواز سے اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ناپسند فرمایا اور ارشاد فرمایا "تمہارا خدا بہرہ نہیں ہے کہ بلند آواز سے پکارتے ہو۔" (او کما قال) جہاں ہنگامہ آرائی سے احتراز کا یہ عالم ہو کیا کوئی شخص تصور کر سکتا ہے کہ صحابہ کرامؓ مسجدوں میں بیٹھ کر "ہو، حق" کے نعرے اسی طرح لگاتے ہوں گے اور اَلصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ کا ورد اسی طرح کرتے ہوں گے جیسے آج ہم کرتے ہیں اور جسے ہم نے اسلام اور عشق رسولؐ کا اول و آخر تقاضا سمجھ لیا ہے؟

حضرت بلالؓ مسجد نبوی کے مؤذن تھے۔ احادیث و سیرت کی کتابیں پڑھیے کہیں آپ کو نظر نہیں آئے گا کہ اس بزرگ ہستی نے جن کے عشق رسولؐ کے آگے ہمارا دعوائے عشق رسولؐ ایک جھوٹ اور سخن سازی کے سوا کچھ نہیں، اذان دینے کے

بعد درود و سلام اسی طرح پڑھا ہو جس طرح آج ایک بزعم خویش محبِ رسولؐ نے پڑھنا شروع کیا ہے۔ اسلام میں جو شعائر ہیں ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ زبردست اہمیت رکھتا ہے۔ ان شعائر کو مسخ کرنا یا جو رنگ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بخش دیا ہے، اس میں کسی قسم کا تغیّر و تبدّل کرنا بہت بڑی جسارت ہے، چنانچہ جب میں نے اس اللہ کے بندے کو ہر صبح اذان کے فوراً بعد مسجّع عبارت میں درود کی تلاوت کرتے سُنا تو یہی بات ذہن میں کھٹکی۔ اذان ایک اسلامی شعار ہے۔ اتنا اہم شعار کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہُوا اور عرب میں فتنۂ ارتداد پھیلا تو خلیفۂ رسولؐ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس فتنے کی سرکوبی کے لیے فوجیں بھیجتے وقت فوجی کمانڈروں کو ہدایت کی کہ جس بستی سے اذان کی آواز بلند ہو، اس سے کوئی تعرض نہ کریں۔ اذان کی پکار کا مطلب ہے کہ وہ بستی مرتد اور منحرف نہیں ہوئی، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق صحابۂ کرامؓ کا معمول یہ تھا کہ جب مؤذن اذان دے چکتا تو یہ دعا فرماتے اَللّٰھُمَّ رَبَّ ھٰذِہِ الدَّعْوَۃِ التَّامَّۃِ وَالصَّلٰوۃِ الْقَآئِمَۃِ اٰتِ مُحَمَّدَنِ الْوَسِیْلَۃَ وَالْفَضِیْلَۃَ وَابْعَثْہُ مَقَامًا مَّحْمُوْدَانِ الَّذِیْ وَعَدْتَّہٗ (اے اللہ! اس دعائے کامل (اذان) اور قائم ہونے والی نماز کے پروردگار! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مرتبہ و عزت اور فضیلت و بزرگی عطا کر اور جس مقامِ محمود کا ان سے تُو نے وعدہ کیا ہے، اس تک انہیں پہنچا) اس دعا کے بعد وہ سُنتیں پڑھتے اور نماز کھڑی ہونے تک ذکر اذکار میں اس طرح منہمک رہتے کہ مسجد میں کسی قسم کا شور و ہنگامہ بپا نہ ہوتا۔ ہر شخص پرسکون فضا میں اپنے رب سے لَو لگائے رہتا۔

اگر اذان کے فوراً بعد من گھڑت درود کی عبارت کو اذان ہی کی طرح بلند آواز سے پکار کر پڑھنا ایسا ہی نیکی کا کام ہوتا، تو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی ہدایت

فرماتے اور اگر عشقِ رسولؐ اس کا تقاضا کرتا تو صحابہ کرامؓ خود اس کا اہتمام کرتے ـــ وہ بزرگ اور مقدس انسان جن سے بڑھ کر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عاشقِ صادق آسمان نے اس زمین پر کسی کو نہیں پایا۔

ممکن ہے کہنے والے کہیں "اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے عہد میں کچھ ایسے کاموں کی نظیر نہیں ملتی جو شریعت کے خلاف نہیں ہیں اور بعد میں ان کا اہتمام برتا گیا ہے، تو ان کو اپنانے میں کیا حرج ہے ؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا نیکی اور سعادت و رحمت ہی سے بہرہ اندوز ہونا ہے، معاذ اللہ کوئی برائی تو نہیں !" شاید کچھ اور لوگ کہیں " ایسے چھوٹے چھوٹے امور پر متشددانہ رویہ درست نہیں ۔ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بہت بڑے مقصد کے لیے مبعوث فرمایا تھا۔ فروعی باتوں میں پڑ کر اس بڑے مقصد کو کیسے سرانجام دیا جاسکتا ہے ؟"

پہلی بات کے جواب میں ہم عرض کریں گے کہ اول تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عمل ہی ہمارے لیے واجب الاتباع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کام کو جس صورت اور جس انداز میں کرنے کا حکم دیا ہے، حضورؐ کی محبت و اطاعت کا تقاضا ہے کہ ہم اسے ٹھیک اسی صورت اور اسی انداز میں کریں۔ صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل یہی تھا۔

یہ مقدس گروہ حضورؐ کی اتباع و اطاعت کا اہتمام یہاں تک برتتا تھا کہ آپؐ کو جو غذائیں مرغوب تھیں، وہی غذائیں اپنے لیے پسند کرتا، سفر کرتے وقت حضورؐ جس مقام پر قیام فرماتے یا سستانے کی خاطر ذرا دیر کو رکتے کسی صحابیؓ کا اس راستے سے گزر ہوتا تو وہ آپؐ کی اتباع میں اسی مقام پر قیام کرتے یا تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر

جاتے۔ نمازِ فجر کی سنتوں کے بعد آپ کا معمول تھا کہ تھوڑی دیر کے لیے قبلہ رُخ دائیں کروٹ پر لیٹ جاتے تھے، چنانچہ صحابۂ کرامؓ نے آپؐ کے نقشِ قدم کی پیروی میں اس امر کو اپنا معمول بنا لیا تھا۔ جب چھوٹے چھوٹے اور روزمرہ کے عام انسانی معمولات کے سلسلے میں جن کا رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مقصدِ بعثت سے کوئی تعلق نہ تھا، صحابہؓ کے ذوقِ اتّباع کا یہ عالم تھا تو جن امور کا تعلق براہِ راست مقصدِ بعثت اور اسلامی شعائر سے تھا۔ ان کے بارے میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اتباع میں کیا کچھ اہتمام نہ کرتے ہوں گے! پس ہمارے لیے رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے احکام کی پیروی کا بہترین نمونہ صحابۂ کرامؓ کے عمل میں ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنے ذہن کی اپج سے کام لے کر کسی معاملے میں طرحِ نو نہیں ڈالی اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد کردہ طریقے پر عمل پیرا رہے۔

دوم اگر ذہن کی اپج سے کام لینے کے دروازے چوپٹ کھول دیے جائیں تو حقیقی اسلامی شعائر مسخ یا بے وقعت ہو کر رہ جائیں گے اور من گھڑت اسلامی شعائر وجود میں آ جائیں گے اور ان کے اہتمام و احترام ہی کو اصل اسلام سمجھا جانے لگے گا۔ اس وقت کتنے ہی اعمال و افعال ہیں جن کا آج مسلمان معاشرے میں اس طرح اہتمام و احترام کیا جاتا ہے گویا وہ اسلامی شعائر ہیں۔ حالانکہ ان کا نہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سنتِ مطہرہ میں کوئی نشان ملتا ہے نہ صحابہؓ کی زندگی میں آثار ملتے ہیں۔ یہ اعمال و افعال شروع میں اسی طرح نیک جذبات اور نیک نیتوں کے ساتھ کارِ ثواب و سعادت سمجھ کر اختیار کیے گئے تھے، مگر آج وہ اسلامی شریعت کا جزوِ لاینفک بن چکے ہیں جن پر لوگوں کے ایمان و کفر کے فیصلے کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح کتنے اعمال مشرکانہ اور بدعات ہیں جو نیکی کے لبادے میں اسلام کے حصار میں در آئی ہیں اور اس کی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہیں۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو کسی اسلامی شعار میں ترمیم و اضافہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ تاہم بہت سے چھوٹے چھوٹے امور ایسے ہوتے ہیں جنہیں اگر شروع میں نظر انداز کر دیا جائے تو بعد ازاں ان سے بڑے بڑے فتنے جنم لیتے ہیں۔ کسی بند میں سوئی کے ناکے ایسا سوراخ کر کے یہ سمجھنا بڑی ہی نادانی ہوگی کہ اس بے مایہ سے سوراخ کا کیا خوف، بند بڑا مضبوط اور مستحکم ہے اس پر آنچ نہیں آئے گی۔ ہماری ساری فلسفہ طرازیوں کے باوجود یہ سوراخ آہستہ آہستہ بڑھتا چلا جائے گا یہاں تک کہ ایک روز بند میں شگاف پڑ جائے گا اور پھر اس سے جو تباہی نازل ہوگی، اس کا تصوّر کچھ ایسا محال نہیں ہے۔ اسی اذان کے فوراً بعد درود کی تلاوت کو لیجئے، اگر اس مؤذّن کی دیکھا دیکھی دوسری مسجدوں میں بھی اس کا اہتمام شروع ہو جائے؛ تو ایک وقت ایسا آسکتا ہے کہ درود کو اذان کا لازمی جُزو سمجھا جانے لگے اور جو لوگ اسے جزوِ لاینفک تسلیم نہ کریں۔ ان کا ایمان و اسلام ہی مشتبہ ہو جائے۔ (۲۴ نومبر ۱۹۵۹ء)

یہ مضمون آج سے تقریباً اُنّیس برس پہلے لکھا گیا تھا۔ اس دوران میں "عشّاقِ رسول" میں ایک انقلاب واقع ہو چکا ہے۔ اب ان کی ہر مسجد سے ہر نماز کے وقت خود ساختہ درود و سلام کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ اذان کے بعد نہیں، اذان سے پہلے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کے نزدیک درود و سلام کے بغیر اذان مکمّل ہی نہیں ہوتی۔

کتابِ الٰہی سے کھیل

رحیم یار خاں کا ایک پٹواری ایک عجب مصیبت میں مبتلا ہے۔ مصیبت کیا ہے اپنے کرتوں کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ حضرت کی اپنی پٹوارن کے ساتھ ایک مدت سے کھینچا تانی چلی آتی تھی۔ یہ اپنے پٹوارے کے نشہ تند میں مست تھے اور آپ جانتے ہیں یہ وہ نشہ ہے جس سے بڑے بڑے لینڈ لارڈ اور وزیر تک لرزاں و ترساں رہتے ہیں، مبادا پٹواری صاحب کا قلم نا چھرا حرکت میں آئے اور ان کی زمین کا جگر چاک چاک ہو کر رہ جائے۔ ادھر پٹوارن صاحبہ کو یہ غرّہ کہ وہ پٹوارن ہیں، زمیندار نہیں۔ آخر یہ تصادم رنگ لایا اور ایک روز پٹواری صاحب نے پٹوارن کے غرّے کو خاک میں ملانے کے لیے بیک وقت تین طلاقیں دے دیں۔

طلاق تو دے بیٹھے، مگر نشہ ہوا ہُوا تو اپنی اس نا معقول حرکت پر سٹپٹائے۔ پٹوارن ان کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ پٹوارن تو خیر انہیں کوئی اور بھی مل سکتی تھی، پٹوارن کی بارہ چودہ سالہ رفاقت کا ثمرہ نصف درجن سے زائد بچوں کا مسئلہ بڑا ہیبت ناک تھا۔ آخر مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اپنی حماقت بیان کی اور مشکل کشائی کی درخواست کی۔ مولوی صاحب نے ایک ضخیم سی کتاب میں غوطہ زن ہو کر فرمایا، چودھری صاحب طلاق تو واقع ہو گئی، اب ایک ہی صورت ہے، حلالہ کروا لیجئے۔ چودھری صاحب کچھ نہ سمجھ سکے اور وضاحت چاہی۔ مولوی صاحب نے فرمایا۔ چودھرائن کا اس شرط پر کسی دوسرے شخص سے نکاح کروا دیجئے کہ وہ چودھرائن کو ایک رات رکھ کر طلاق دے دے گا

بس چودھرائن آپ پر حلال ہو جاتے گی۔ عدّت گزرنے پر نکاح ثانی کر لیجئے اور گھر لے آئیے۔

چودھری صاحب حلالہ کی اس تشریح پر دم بخود رہ گئے۔ لیکن مولوی صاحب کے بقول اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔ فقہ کا حکم یہی تھا۔ حلالہ کروائیے یا چودھرائن سے ہاتھ دھو بیٹھیے۔

قہرِ درویش بر جانِ درویش، پٹواری صاحب نے غیرت کا گھونٹ بھر کر پٹوارن کے لیے عبوری شوہر کی تلاش شروع کر دی۔ کسی ستم ظریف کو سن گن ہو گئی۔ اس نے اخبار میں خبر نکلوا دی کہ ایک پٹواری صاحب کو اپنی بیوی کے لیے عبوری شوہر کی ضرورت ہے۔ خبر کا شائع ہونا تھا کہ راوی کی روایت کے مطابق شہر کی فضا میں رنگینی پیدا ہو گئی۔ کئی من چلوں نے پٹواری صاحب کو اپنی خدمات پیش کر دیں۔ ایک نوجوان کے جذبۂ خدمت کا یہ عالم تھا۔ کہ وہ بہاول نگر سے اڑھائی سو میل کا فاصلہ طے کر کے رحیم یار خاں پہنچا تاکہ پٹواری صاحب کو اس مصیبت سے نجات دلائے اور ثواب کمائے۔ ادھر کراچی سے داؤد نامی ایک صاحب نے پٹواری کو مشورہ دیا کہ میاں غیرت کشی کے کس پھیر میں پڑ گئے ہو، حلالے ڈلانے کی کوئی ضرورت نہیں مسلکِ اہلِ حدیث کے مطابق حلالے کے بغیر اپنی مطلقہ بیوی سے نکاح ثانی کر سکتے ہو۔

یہ تو خبر نہیں پٹواری صاحب من چلے خدام میں سے کسی ایک کی خدمات حاصل کریں گے یا ان کراچی والے صاحب کا مشورہ اپنائیں گے۔ تاہم یہ بات یقینی ہے کہ انہوں نے جو راستہ بھی اختیار کیا ایک نیا دردِ سر مول لیں گے۔ اہلِ حدیث مسلک کے مطابق انہوں نے پٹوارن کو عبوری شوہر سے گزارے بغیر نکاح ثانی کر لیا تو حنفی مولوی صاحب سے انہوں نے پہلے فتویٰ حاصل کیا تھا وہ ان کا حقہ پانی بند کروا دیں گے اور کیا عجب کچھ مدت کے لیے رحیم یار خاں علمائے کرام کا اکھاڑہ بن جائے۔ ایک طرف حلالے کے قائل علماء اپنے دلائل کے لشکر لیے اکھاڑے میں آ خم ٹھونکیں اور دوسری جانب اہلِ حدیث علماء بیک وقت دی جانے والی تین طلاقوں کو ایک طلاق ثابت کرنے کے لیے احادیث

سے استدلال کا انبار لگا دیں۔ علمائے کرام تو خیر اپنا اپنا فریضۂ تبلیغ و اشاعتِ حق انجام دیں گے مگر پٹواری صاحب اس کھینچا تانی میں مارے جائیں گے۔ ایک مرتبہ مرزا غالب بھی کھینچا تانی کا شکار ہو گئے تھے مگر وہ کعبہ و کلیسا کا معاملہ تھا۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

اور پٹواری صاحب کے سامنے کعبہ والوں کی کشمکش ہو گی۔ انہوں نے پٹوار پڑھا ہے حدیث اور فقہ نہیں۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ حیران پریشان سوالیہ نشان بن کر رہ جائیں گے۔

کس کا یقین کیجیے کس کا یقیں نہ کیجیے
لائے ہیں اُن کی بزم سے یار خبر الگ الگ

اور اگر پٹواری صاحب اپنا پرانا مسلک ہی عزیز سمجھ کر سینے سے لگائے رہے اور حلالے کی غیرت کش تدبیر کو عملی جامہ پہنا دیا تب بھی پٹواری ان کے ہاتھ نہ آئے گی۔ اس لیے کہ ایک مرتبہ نکاح کے رشتے میں باندھ کر کون احمق اس سے دست بردار ہونے کو تیار ہو گا ہم نے تو آج تک نہیں سنا کہ کسی نے اپنی مطلقہ بیوی کو عبوری شوہر کروایا ہو اور وہ زوجیت کی عبوری رسوم انجام دینے کے بعد اسے واپس مل گئی ہو۔ اس پر ہمیں لاہور کے ایک بہت بڑے مولوی صاحب یاد آ گئے۔ بیچارے بہت نیک اور شریف تھے، مگر ایک روز کسی بات پر جلال میں آ کر زوجہ محترمہ کو بیک وقت تین طلاقیں دے بیٹھے۔ جوشِ جلال فرو ہوا تو پچھتائے، مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ لاچار اپنے ایک سعادت مند شاگرد کو تخلیے میں بلایا اور حلالے کے لیے تعاون کی درخواست کی۔ سعادت مند شاگرد استاذِ محترم کی استدعا کیسے ٹال سکتا تھا؟ مگر جب وہ نکاح کر چکا تو مولوی صاحب منتظر کہ آج طلاق دیتا ہے کل دیتا ہے ۔۔۔ لیکن جس کو ہلدی لگے نہ پھٹکری بیٹھے بٹھائے چندے آفتاب چندے ماہتاب بیوی مل جائے وہ اسے کیوں چھوڑے گا؟ چنانچہ مولوی صاحب صبر کی سل چھاتی پر رکھ کر رہ گئے اور سعادتمند

شاگرد نے اپنی بیوی کو ساتھ لے کر اپنی راہ لی۔ تو یہاں شاگردی استادی کا مقدس رشتہ بھی دھرا رہ جاتا ہے، وہ تو بیچارے ہیں اور خدمات پیش کرنے والے اخبار میں خبر پڑھ کر اُن کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ ؎

بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر چاہیں

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام و فرامین پر نہ چلنے سے زندگی میں جو پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں یہ واقعہ اس کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔ اسلام نے طلاق کی گنجائش اس لیے رکھی ہے کہ جب میاں بیوی کی کسی صورت نہ بن سکے اور ازدواجی زندگی کا مقصد ہی فوت ہوتا نظر آتے تو میاں طلاق دے کر قیدِ نکاح سے خود بھی آزاد ہو جاتے اور بیوی کو بھی آزاد کر دے۔ یہ اقدام انتہائی ناگزیر صورت میں کرنے کا حکم ہے، چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ حلال امور میں خدا کے نزدیک سب سے مبغوض اور ناپسندیدہ امر طلاق ہے۔ ابغض الحلال الی اللہ الطلاق اور بلا وجہ طلاق دینے والے کے متعلق فرمایا کہ اس پر جنت کی بُو بھی حرام ہے۔

نیز فرمایا نکاح کرو اور طلاق نہ دو، اللہ تعالیٰ کو ایسے مرد اور عورتیں سخت ناپسند ہیں جو بھونرے کی طرح پھول پھول کا مزا چکھتے ہیں۔ تزوجوا ولا تطلقوا فان اللہ لا یحب الذواقین والذواقات۔ ایک طرف طلاق کے بارے میں یہ ارشادات دوسری جانب ہم مسلمانوں نے اسے کھیل بنا لیا ہے۔ بات بات پر طلاق کے الفاظ زبان پر آ جاتے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے طلاق دینے کا بھی ایک ضابطہ مقرر کیا ہے۔ ہر طلاق کے لیے ایک طہر کی مدت رکھی ہے تاکہ اس طویل مدت میں اگر میاں بیوی میں اصلاح کی صورت پیدا ہو سکتی ہو تو کر لی جائے، لیکن یہاں ہوتا یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں دے دی

جاتی ہیں۔ اور پھر جب جذبات پُرسکون ہوتے ہیں تو آنکھیں کھلتی ہیں اور پچھتاتے ہیں۔ اور علماء کے پاس دوڑتے ہیں کہ خدارا دستگیری فرمایئے، ہمارے بچے برباد ہو جائیں گے گھر تباہ ہو جائے گا۔ حالانکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیک وقت تین طلاقیں دینے کو دین کے ساتھ کھیلنا قرار دیا ہے۔

نسائی (حدیث کی کتاب) میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع دی گئی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو بیک وقت تین طلاقیں دے ڈالی ہیں۔ حضور اکرمؐ یہ سن کر غصے میں کھڑے ہو گئے اور فرمایا: ایلعب بکتاب اللہ و انا بین اظھرکم؟ (کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جا رہا ہے حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟) اس حرکت پر حضورؐ کے غصے کا یہ عالم تھا کہ ایک شخص نے عرض کی کیا میں اسے قتل نہ کر دوں؟ رہا حلالہ تو عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ نے حلالہ کرنے والے اور کرانے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ لعن اللہ المحلل والمحلل لہٗ۔ نیز حلالہ کرنے والے کو کرایے کا سانڈ (التیس المستعار) قرار دیا ہے۔ اسلام جس قسم کا پاکیزہ اور عفیف معاشرہ وجود میں لانا چاہتا ہے۔ اس میں کرائے کے سانڈوں اور پھول پھول کا مزا چکھنے والے بھونروں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن یہ بدبختی نہیں تو اور کیا ہے کہ ایک طرف طلاق کو کھیل سمجھ لیا گیا ہے اور دوسری طرف جب اس کھیل سے الجھن پیدا ہوتی ہے تو اس کا مداوا حلالے میں تلاش کیا جاتا ہے جس کے کرنے کرانے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت کا مستوجب قرار دیا ہے۔ حضرت عمرؓ کے عہدِ خلافت میں ایک عورت نے پہلے خاوند کو اپنے اوپر حلال کرنے کے لیے کسی مرد سے نکاح کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس مرد کو حکم دیا کہ وہ اس عورت کو قیدِ نکاح میں رکھے اور طلاق نہ دے ورنہ اسے سزا دی جائے گی۔

(۱۰ دسمبر ۱۹۵۹ء)

"مژدۂ جاں سوز"

کل پڑوس میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ دایہ کی ستم ظریفی دیکھئے اس نے گھر والوں سے کہا کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ وہ تو "مژدہ" سنا کر رخصت ہو گئی اور گھر میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ لڑکے کا باپ بین کر کے بلند آواز سے رونے لگا۔ گھر میں زچہ کے علاوہ وہی ایک فرد تھا۔ آدھی رات کا وقت، رونے اور بین کی آواز سن کر اڑوس پڑوس کے لوگ پریشان ہوئے کہ خدا خیر کرے۔ آخر عقدہ کھلا کہ اس مردِ شریف کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے اور یہ ماتم سخت اس نومولود کی آمد آمد پر ہے۔ اسے اپنی پڑوسن سے یہ کہتے بھی سنا گیا کہ میں ابھی اس نامنجار کا ٹینٹوا دبا دیتا ہوں۔ پڑوسن نے کچھ تسلی تشفی دی، کچھ ڈانٹا ڈپٹا، ورنہ کیا عجب وہ اپنی سی کر گزرتا۔ خدا جانے اس غریب کی رات کیسے گزری۔ صبح ہوئی تو لڑکے کا دادا آیا۔ اسے دایہ نے رات ہی جا کر خوشخبری دے دی تھی کہ تمہارا پوتا ہوا ہے۔ آتے ہی بیٹے کو مبارک باد دی۔ یہ گویا بیٹے کی غیرت کو تازیانہ تھا۔ وہ بگڑ کھڑا ہوا اور جو اول جلول منہ میں آیا بکنے لگا۔ باپ نے کہا، برخوردار! ہوش کے ناخن لو۔ تم نے دیکھا بھی ہے کہ لڑکی ہے یا لڑکا؟ اور اب جو برخوردار نے جائزہ لیا تو حقیقت منکشف ہوئی۔ اس مردِ غیور کا یہ واقعہ سارے محلے میں ایک لطیفہ بن گیا ہے۔ ہر زبان پر ہے رحمت کی لڑکی لڑکا بن گئی۔

لطیفہ بے شک بڑا دلچسپ ہے، مگر میرے لوحِ ذہن پر سورۃ النحل کی آیات ابھر آئی ہیں:۔ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُم بِالْأُنثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ۝ يَتَوَارَىٰ مِنَ الْقَوْمِ مِن سُوءِ مَا بُشِّرَ بِهِ ۚ أَيُمْسِكُهُ عَلَىٰ هُونٍ أَمْ يَدُسُّهُ

فی التراب (النحل: ۵۸-۵۹) جب ان سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کا مژدہ سنایا جاتا ہے تو اس کا چہرہ
کالا سیاہ ہو جاتا ہے اور وہ خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتا ہے، لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے
کہ اس بری خبر کے بعد انہیں کیسے منہ دکھائے۔ سوچتا ہے کہ ذلت و رسوائی کے ساتھ
بیٹی کو لیے رہے یا اسے زمین میں گاڑ دے۔

کسی گھرانے میں لڑکی کی پیدائش عرب جاہلیت میں جس طرح موجب عار سمجھی جاتی
تھی اور پورے گھر میں جس طرح غم و اندوہ کی گھٹائیں چھا جاتی تھیں اس کی عکاسی مندرجہ بالا
آیت میں کی گئی ہے۔ اسلام آیا تو اس نے اس جاہلی عار کو ختم کیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ
علیہ وسلم نے کسی گھر میں بیٹی کی پیدائش کو رحمت قرار دیا۔ اور اس کی صحیح خطوط پر تہذیب و
تربیت کرنے والے ماں باپ کو جنت اور اپنے جوار کا مژدہ سنایا۔ نیز فرمایا جس شخص کی
ایک بیٹی ہو، وہ اسے نہ تو ایام جاہلیت کی طرح زندہ دفن کرے اور نہ اسے ذلیل و خوار کر
کے رکھے اور پالنے پوسنے اور دوسرے حقوق میں لڑکوں پر اس کو ترجیح دے، اللہ اسے
جنت میں داخل کرے گا ــــ مگر مسلمان کہلانے والے اب بھی کتنے گھرانے ہیں جن
میں بیٹی کی پیدائش کی خبر سن کر صف نوحہ و ماتم بچھ جاتی ہے۔ اور یہ تو ایک ایسے شخص اور
گھرانے کا حال ہے جو بالکل نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہے اور علم کی روشنی سے بے بہرہ
ہے، ایک اعلیٰ گھرانے میں تیسری بچی پیدا ہوئی ہے اور بے چاری ماں پر ایک آفت
آگئی ہے۔ ساس اور نندوں کے طعنے کوسنے اور میاں کا جو ماشاء اللہ تعلیم یافتہ اور روشن خیال
ہے، غیظ و غضب اُمڈ پڑ رہا ہے۔ حالی نے جو زمانۂ جاہلیت کی عرب عورت کے متعلق کہا تھا:

جو ہوتی تھی پیدا کسی گھر میں دختر ۔۔۔ تو خوف شماتت سے بے رحم مادر
پھرے دیکھتی جب تھے شوہر کے تیور ۔۔۔ کہیں زندہ گاڑ آتی تھی اس کو جا کر
وہ گود ایسی نفرت سے کرتی تھی خالی ۔۔۔ جنے سانپ جیسے کوئی جننے والی

تو شاید ایسی ہی مصیبت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔ (۱۰ فروری ۱۹۵۹ء)

زیغِ قلب کی کرشمہ سازیاں

قرآن کریم میں بہت سی دعائیں تلقین ہوئی ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ ہدایت کے بعد گمراہی سے محفوظ رکھے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ (آل عمران ۸) (پروردگارا ہمیں راہِ ہدایت پر لگانے کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کر، ہمیں اپنی رحمت سے نواز کہ تیری ذات ہی عطا کنندہ ہے)۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہلِ ایمان کو تلقین فرمایا کرتے تھے کہ وہ اپنے رب سے یہ دعا مانگا کریں: یا مقلّب القلوب ثبّت قلبی علٰی دینک (اے دلوں کو بدلنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر مضبوطی کے ساتھ جما دے) ___ اور یہ حقیقت ہے کہ زیغِ قلب سے بڑھ کر اور کوئی بیماری نہیں اور ہدایت کے بعد گمراہی انسان کی سب سے بڑی بدبختی ہے۔ ایک شخص جو ضلالت و گمراہی کے ماحول میں آنکھیں کھولتا ہے، اسی فضا میں تربیت پاتا اور پروان چڑھتا ہے، اس سے تو یہ امید کی جا سکتی ہے کہ جب اس پر راہِ ہدایت آشکارا ہو جائے گی تو وہ گمراہی کو چھوڑ کر اس سیدھی راہ پر چل کھڑا ہو گا۔ اس لیے کہ جب سے اس نے ہوش سنبھالا ہے، اپنے گرد و پیش تاریکی ہی کو محیط دیکھا ہے، روشنی سے وہ آشنا ہی نہیں ہُوا۔ اُسے یہی بتایا گیا کہ یہ تاریکی ہی روشنی ہے، چنانچہ جب اس کے سامنے واقعی روشنی لائی جائے گی اور کہا جائے گا کہ روشنی وہ نہیں ہے جسے تم سمجھ

رہے ہو، بلکہ یہ ہے کہ جس نے اپنے ماحول کو منور کر دیا ہے، تیرگی جس سے چھٹ کر رہ گئی ہے اور دُور دُور تک ہر چیز نظر آنے لگی ہے، تو اگر وہ فی الواقع اندھا نہیں ہے یا تاریکی کے تعصب نے اس کی بصیرت و بصارت پر پردے نہیں ڈال دیے ہیں تو وہ تسلیم کر لے گا کہ روشنی فی الحقیقت یہی ہے اور اب تک وہ تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔

اس کے برعکس جو شخص روشنی ہی میں آنکھیں کھولتا ہے، روشنی ہی میں پروان چڑھتا ہے، مگر اس کا دل کچھ ایسا ٹیڑھا ہو جاتا ہے اور اس کی بصیرت کی آنکھیں کچھ اس طرح پھوٹ جاتی ہیں کہ وہ روشنی کو تاریکی اور تاریکی کو روشنی سمجھنے لگتا ہے، تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ روشنی میں سیدھی راہ پر چلا جا رہا ہے۔ اسے روشنی کے نام سے اتنی چڑ ہو جاتی ہے کہ جب کوئی روشن شے اس کے سامنے لائی جاتی ہے تو وہ چلانے لگتا ہے، اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے اور کہتا ہے یہ تو تاریکی ہے، روشنی وہ ہے جسے تم تاریکی کہتے ہو۔ ایسے شخص کا کوئی علاج ممکن نہیں آپ لاکھ روشنی کی تعریف و توصیف بیان کریں، اس کی کیفیت و اثرات واضح کریں، تاریکی اور اس کے فرق کو آشکارا کریں، لاکھ استدلال پیش کریں کہ روشنی شے لطیف و پُرنور ہے اور تاریکی کثیف و بے نور۔ آپ کی کوئی حجت اس پر اثر نہ کرے گی۔ آپ کے دلائل اس کے بہرے کانوں پر اچٹ کر رہ جائیں گے۔ اس لیے کہ وہ روشنی سے بے خبر نہ تھا، نہ اس کی کیفیت و اثرات اس کے لیے اجنبی تھے۔ معاملہ ناواقفیت یا بصارت سے محرومی کا نہیں دل کی ٹیڑھ اور بصیرت کی آنکھوں کے اندھے پن کا ہے۔

ٹھیک یہی کیفیت اس شخص کی ہوتی ہے جو ہدایت کی روشنی چھوڑ کر ضلالت کی تیرگی کو اپنا لیتا ہے۔ دل کی ٹیڑھ اسے بصیرت کی آنکھوں سے دیکھنے اور دل و دماغ سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیتی ہے۔ وہ ضلالت کو ہدایت سمجھتا ہے، ٹیڑھی راہوں کو صراطِ مستقیم گردانتا ہے اور ہلاکت کے گڑھوں کو زندگی کی نعمتیں

قرار دیتا ہے۔ وہ ضلالت کی راہ کو راہِ ہدایت گردانتا اور اس پر چلتا ہے تو اس کا ہر قدم اسے ہدایت سے دور لیے چلا جاتا ہے۔ آپ اس کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ اپنے راہوار کو مہمیز لگا کر اور سرپٹ دوڑا دیتا ہے۔ آپ کی کوئی کوشش اسے روکنے اور راہِ ہدایت کی طرف پلٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس کا زیغ قلب اسے ہلاکت کی وادیوں میں پہنچا دیتا ہے، مگر وہ یہی سمجھتا ہے کہ سلامتی کی راہ پر رواں ہے۔ پھر سوچیے ایسے شخص سے بڑھ کر بدبخت اور کون ہو سکتا ہے؟ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا ۝ الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا ۝ "کہیے ہم تمہیں ان لوگوں کی خبر نہ دیں جو اعمال کے لحاظ سے سب سے زیادہ گھاٹا پانے والے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیاوی زندگی کی تمام سعی و جہد رائیگاں گئی اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ اچھے عمل کر رہے ہیں۔" (الکہف ۱۰۳-۱۰۴)

زیغ قلب کی کرشمہ سازیاں دیکھنی ہوں تو ان گروہوں کی تاریخ پر نظر ڈالیے یا ان افراد کی داستانِ حیات سنیے جو پہلے ہدایتِ الٰہی سے فیض یاب تھے مگر پھر دل کی کجی کا شکار ہوئے اور راہِ ہدایت کو چھوڑ کر ضلالت کے راستے پر چل کھڑے ہوئے اور دل کی کجی نے بصیرت کی آنکھیں اس طرح پٹ کر دیں کہ اس ضلالت کی راہ کو ہدایت کی شاہراہ اور صراطِ مستقیم قرار دینے لگے اور جو لوگ راہِ ہدایت پر گامزن تھے انہیں گمراہ گرداننے لگے۔ آج ہمارے دور میں اس کی مثال مرزائی اور منکرینِ سُنّت ہیں۔ ہدایت کے بعد زیغ قلب انسان کو گمراہی کی ہلاکت خیز وادیوں میں ہدایت کے نام پر کس طرح بھٹکا دیتا ہے اس کا اندازہ کسی بھی مرزائی اور منکرِ سُنّت سے بات چیت کر کے کیا جا سکتا ہے۔ آج کی صحبت میں ایک منکرِ سُنّت کا تذکرہ مطلوب ہے۔

بظاہر بڑے مردِ معقول، مگر بات چیت ہوئی تو آشکارا ہو گیا کہ زیغِ قلب نے کم از کم دین کی حد تک عقلِ سلیم چھین لی ہے۔ ایک بات کو مانتے بھی تھے اور اس سے انکار بھی کرتے تھے انہیں یہ تسلیم تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف قرآن کی تلاوت ہی نہیں کی ایک معاشرہ بھی تعمیر کیا، اس معاشرے کی مذہبی، فکری، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور اجتماعی رہنمائی بھی کی۔ سیاست کے اصول وضع فرمائے، تنازعات کے فیصلے کیے، فوجوں کی قیادت کی اور جنگ و صلح کے ضوابط بھی تشکیل دیے۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ یہ سارے کام مرکزِ ملت کی حیثیت سے انجام دیے تھے۔ جب ان سے عرض کیا کہ قرآن حکیم یہ جو کہتا ہے کہ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (تیرے رب کی قسم! لوگ اس وقت تک صاحبِ ایمان نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے تنازعات میں آپ کو فیصلہ کن اتھارٹی نہ مان لیں اور آپ جو فیصلہ کریں اس کے آگے بے چون و چرا دل میں کسی قسم کی تنگی لائے بغیر سرِ تسلیم خم کر دیں۔ النساء — ۶۵) تو اس کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ کیا یہ آیت آپ کے مزعومہ مرکزِ ملت کے تصور کا تیا پانچا نہیں کر دیتی اور یہ اعلان نہیں کرتی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت و اتباع مرکزِ ملت کی حیثیت میں نہیں، رسول کی حیثیت میں، صرف ایک دور کے لیے نہیں رہتی دنیا تک سارے ادوار کے لیے مسلمانوں پر فرض ہے؟ — تو صاف مکر گئے۔ کہنے لگے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تلاوتِ قرآن کے علاوہ کوئی کام نہیں کیا۔

جب ان سے کہا گیا یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ تاریخ کیا شہادت دیتی ہے؟ تو ارشاد ہوا تاریخ؟ آپ کی تاریخ تو غلط روایات کا مجموعہ ہے اور پھر لگے اس "خانہ ساز تاریخ" کے نمونے بتانے! لطف یہ کہ جن روایات کے بل پر وہ اسلام کی تاریخ پر سیاہی پھیر رہے تھے، وہ سب کی سب موضوع روایات ہیں۔ جن کو محدثین ہی نے نہیں ارباب سیر اور ثقہ مؤرخین نے بھی کذب و افتراء قرار دیا ہے، یعنی جناب نے ایک طرف جھوٹی روایات کے خلاف

محاذ قائم کر رکھا ہے اور دوسری طرف جھوٹی اور کمزور روایات کو اپنے استدلال کی بنیاد بناتے اور اس پر اپنی فکر کی عمارت تعمیر کرتے ہیں!

جنابِ شیخ کا نقشِ قدم یُوں بھی ہے اور یُوں بھی

زیغِ قلب کا ایک نمونہ اور ــــ ارشاد ہُوا سُنّت مسلمانوں میں افتراق پیدا کرتی ہے اور ان کی وحدت کا شیرازہ بکھیرتی ہے ــــ یعنی

خرد کا نام جنوں رکھ لیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

عرض کیا کیوں کر؟ ارشاد ہُوا نماز ہی کو لیجئے۔ کوئی سینے پر ہاتھ باندھتا ہے، کوئی ناف پر ہاتھ جوڑ کر پڑھتا ہے، کوئی رفع یدین کرتا ہے، کوئی نہیں۔ عرض کیا گیا آپ کو اس میں پراگندگی اور افتراق نظر آتا ہے، حالانکہ نماز کے ارکان سب مسلمانوں میں متفق علیہ ہیں۔ نماز کی ہیئت قیام، رکوع و سجود، قومہ، قعدہ، تشہد اور جلسہ کسی کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح نماز کی رکعتوں میں بھی کوئی اختلاف نہیں۔ اس کے برعکس اگر سُنّت کو چھوڑ کر صرف قرآن کریم کو لیا جائے تو آپ نماز کی جزئیات و تفصیلات تو ایک طرف اصولوں بلکہ ہیئت و شکل تک میں متفق نہیں ہو سکتے۔ آپ کے پرویز صاحب اقامتِ صلوٰۃ کے معنی نظامِ ربوبیت کا قیام بتاتے ہیں، ایک دوسرا آدمی کہہ سکتا ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مراد محض دعائیں اور اللہ کا ذکر کرنا ہے اور اس کے لیے کوئی سی بھی شکل اختیار کی جا سکتی ہے۔ ایک تیسرے شخص کے نزدیک یہ شکل بس قرآن میں بتائے ہوئے اوقات میں دو بعض کے نزدیک تین ہیں اور بعض کے نزدیک پانچ۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر مالا جپنا ہو سکتی ہے، چوتھے کے نزدیک مسجد میں حاضری یا کوئی خاص اہتمام بھی ضروری نہیں ہو سکتا۔ بس دنیاوی کام کاج کے دوران میں نماز کا وقت آ جائے تو ہاتھ کھڑے کر کے دعا مانگ لی اور اللہ کا ذکر کر لیا، نماز کا فریضہ ادا

ہو گیا۔ اور یہ کوئی مفروضہ باتیں نہیں۔ صرف قرآن کو ماننے والے اب تک جتنے افراد ہوئے ہیں ان میں بس ایک بات پر اتفاق ہے اور وہ ہے انکار حدیث، باقی ہر معاملے میں ہر شخص اپنی اپنی ڈفلی بجا رہا ہے اور اپنا اپنا راگ الاپ رہا ہے۔ سنت جسے آپ افتراق کا باعث سمجھتے ہیں، فی الحقیقت اس کی بدولت تو اُمت کو وحدت عطا ہوئی ہے۔ یہ سنت رسول ؐ کا اتباع ہی ہے جس کی وجہ سے رنگ و نسل، زبان اور وطن ہر شے الگ الگ ہونے کے باوجود دنیا بھر کے مسلمان ایک رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں۔ اپنی اجتماعی زندگی کے جس معاملے میں بھی انہوں نے سنت رسول ؐ کو چھوڑا ہے اس میں ان کے اندر اختلاف پیدا ہو گیا ہے اور اس اختلاف نے ہر جگہ مختلف شکل و صورت اختیار کر رکھی ہے جس نے بھی کہا ہے، خوب کہا ہے کہ سنت عالمگیر، روشن اور ہر جگہ یکساں ہوتی ہے اور بدعت ہر جگہ جدا اور مختلف رنگ کی ہوتی ہے۔

دوران گفتگو "مرکز ملت" کا ذکر خیر بھی چھڑا۔ مرکز ملت کے بارے میں ان صاحب کا تصور یہ تھا کہ وہ ملک کے عام سربراہوں کی طرح کا ہو گا، اس کے اختیارات محدود ہوں گے، وہ پارلیمنٹ کے مشورے سے امور مملکت انجام دے گا، پارلیمنٹ کثرت رائے سے جو فیصلہ کرے گی اسے تسلیم ہو گا اور وہ اس فیصلے کا پابند ہو گا، چاہے اس کے خیال میں غیر قرآنی ہی کیوں نہ ہو۔

خبر نہیں یہ ان کے مطالعے کی کمی تھی یا بے خبری، پرویز صاحب کے تصور مرکز ملت سے ان کا تصور بالکل ہی مختلف تھا۔ پرویز صاحب جس "مرکز ملت" کے "خالق" ہیں وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہو گا، بلکہ وہ "اللہ" ہو گا۔ اللہ ہی نہیں اللہ کا رسول ؐ بھی ہو گا۔ [پرویز] صاحب صاف صاف کہتے ہیں کہ اللہ و رسول ؐ کی اطاعت سے مراد مرکزی حکومت کی اطاعت ہے جو قرآنی احکام نافذ کرے گی۔ یہ مرکزی حکومت، مرکز ملت ہی کا دوسرا نام ہے۔ گویا پرویز

صاحب کا مرکزِ ملت، اللہ اور رسول کے مجموعے سے وجود میں آئے گا۔ یوں بھی وہ خود کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں جہاں بھی اللہ اور رسول کا ایک ساتھ ذکر ہوا ہے اس سے مراد ایک ہی شے ہے یعنی مرکزِ ملت۔ اب جو شخص کہتا ہے کہ اس اللہ کی حیثیت وہی ہوگی جو کسی ملک کے ایک عام صدر کی ہوتی ہے، اُسے عرشِ خداوندی سے معزول بھی کیا جا سکتا ہے اس کے اختیارات میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے، وہ عام انسانوں کے مشورے کا پابند بھی ہو سکتا ہے، اس پر اپنے بندوں کی طرح عدالتِ عالیہ میں مقدمہ بھی چلایا جا سکتا ہے تو یا وہ ضرورت سے زیادہ ذہین و فطین ہے اور لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتا ہے یا زیغِ قلب نے اس سے یہ سمجھنے کی صلاحیت بھی سلب کر لی ہے کہ اپنے "اللہ" کو اس نیچی سطح پر لاتے ہوئے اُسے قرآن کی کتنی ہی آیات کو نئے معنی پہنانے پڑیں گے۔ اس طرح اسے اپنے پیرومرشد پرویز کو ایک بار پھر یہ زحمت دینی ہوگی کہ وہ پرانی تیار کردہ لغتِ قرآن کو دریا برد کر دیں اور عربی زبان و لغت کا جھٹکا کرتے ہوئے نئی لغت تیار کریں۔

مرکزِ ملت کے سلسلے میں سوچ بچار کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ قرآن کے احکام و تعلیمات کی تعبیر کے جو اختیارات پرویز صاحب اپنے مرکزِ ملت کو دیتے ہیں ان سے تو اُمتِ مسلمہ، مرکزِ ملت کا بازیچہ بن جائے گی۔ اس کا جو دینی، تہذیبی، اخلاقی، معاشی اور اجتماعی ڈھانچہ سنتِ رسول کی بدولت بن چکا ہے اسے تو خیر مرکزِ ملت صاحب توڑ پھوڑ کر رکھ ہی دیں گے کہ وہ عجمی سازش کا نتیجہ ہے، مگر پھر کوئی نیا ڈھانچہ وجود میں نہ آ سکے گا۔ اس وقت دنیا بھر کے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں جو یک رنگی، ہم آہنگی اور وحدت پائی جاتی ہے وہ ختم ہو کر رہ جائے گی۔

پاکستان میں جو "مرکزِ ملت" برسرِ اقتدار ہوگا، وہ قرآن کریم کے احکام کی تعبیر و تشریح انڈونیشیا کے مرکزِ ملت سے بالکل مختلف کر سکتا ہے۔ اسی طرح متحدہ عرب جمہوریہ

کا مرکزِ ملت کا، تیونس کے مرکزِ ملت سے اور مراکش کا مرکزِ ملت، سوڈان کے مرکزِ ملت سے مختلف تعبیر کرے گا۔ مثلاً رمضان کے روزوں کو لیجیے۔ تیونس کے مرکزِ ملت صاحب فرمان جاری کریں گے کہ روزہ انسان کو کمزور کر دیتا ہے اور محنت پوری طرح نہ کر سکنے سے قومی پیداوار میں کمی آ جانے کا اندیشہ ہے اور وقت کا تقاضا یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ قومی پیداوار حاصل ہو اس لیے رمضان کے روزے منسوخ کیے جاتے ہیں۔ ہر مسلمان فی روزہ ایک مسکین کے کھانے کی قیمت خزانۂ عامرہ میں جمع کروا دیا کرے۔ انڈونیشیا کے مرکزِ ملت بہادر حکم جاری کریں گے کہ قرآن میں ایّام معدودات آیا ہے جو عربی لغت میں دس دن تک کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے مہینے کے بجائے صرف دس دن کے روزے رکھے جائیں۔ پاکستان کے مرکزِ ملت (اور وہ پرویز صاحب ہی ہو سکتے ہیں) کا فرمان جاری ہو گا کہ لغت میں صوم کے معنی چپ رہنا ہیں۔ مگر عجمی سازشیوں نے خواہ مخواہ دن بھر بھوکا پیاسا رہنے کو صوم قرار دے دیا، اس لیے بھوک پیاس والا روزہ منسوخ کیا جاتا ہے، آئندہ لوگ بس دن بھر چپ شاہ بن جائیں، صوم کا فریضہ ادا ہو جائے گا۔ کسی ملک کے مرکزِ ملت صاحب ماضی کی روایات کے بہت ہی عاشق ہوئے تو مہینے بھر کے روزے تو بحال رکھیں گے، البتہ فرمان جاری کر دیں گے کہ روزے رمضان کے مہینے کے بجائے سردیوں میں کسی مہینے رکھ لیے جائیں۔ —— رمضان کا مہینہ گرمیوں میں بھی آ جاتا ہے اور گرمیوں کے موسم میں بھوکا پیاسا رہنا اپنی انرجی ضائع کرنا اور صحت پر فاتحہ پڑھنے کے مترادف ہے۔ غرض روزے کا فریضہ جو ایک خاص رنگ، خاص مقصد اور خاص فلسفہ رکھتا ہے اور پوری اُمت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالتا ہے، اس کا مسلمان ملکوں کے مرکزانِ ملت کے ہاتھوں یہ حشر ہو گا۔ اسی پر قرآنِ حکیم کے دوسرے احکامات اور تعلیمات کو قیاس کر لیجیے۔ نتیجۃً ہر مرکزِ ملت قرآن کے نام پر ڈیڑھ اینٹ کا معاشرہ الگ تعمیر کرے گا جس کا کوئی پہلو بھی قرآن کے

ماننے والے دوسرے معاشروں سے مطابقت نہ رکھے گا۔

یہ حشر تو امتِ مسلمہ کا مجموعی حیثیت سے ہو گا۔ خود ایک ملک کے اندر اس کا کوئی ڈھانچا نہ بن سکے گا۔ آج ایک مرکزِ ملت اللہ و رسول بنے "لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ" کا کوس بجا رہے ہیں، قرآن کی تعبیر و تشریح اپنی خواہشات اور مرضیات کے مطابق کر رہے ہیں اور اس کے سانچے میں اپنے "بندوں" کے فکر و نظر، اخلاق و کردار، تہذیب و تمدن اور معاشرت و سیاست کو ڈھال رہے ہیں، کل وہ دوسری دنیا (اگر وہ کوئی ہے تو، کیونکہ مرکزِ ملت کا فلسفہ گھڑنے والے آخرت سے مراد کسی قوم کا مستقبل قرار دیتے ہیں) کو سدھار جاتے ہیں یا ان کے "بندوں" میں سے کوئی طاقت ور "بندہ" "قوت" کے بل پر انہیں معزول کر دیتا ہے اور خود تختِ الوہیت و رسالت پر جلوہ افروز ہو جاتا ہے یعنی مرکزِ ملت بن جاتا ہے تو وہ اپنے پیشرو کے بنائے ہوئے سارے نقشے پر خطِ تنسیخ پھیر دیتا ہے، معاشرے کی تعمیر تو اس پیش رو کے ہاتھوں جتنی کچھ ہو چکی تھی اس کو ڈھا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ اس نے قرآنی معارف کو غلط سمجھا تھا، صحیح وہ ہیں جو میں سمجھا ہوں، چنانچہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کے مطابق قرآن کے معانی گھڑتا ہے اور ملت کی تعمیر کا نیا فرآنی سانچا بناتا ہے۔ چند برس بعد اس کی قضا بھی آ جاتی ہے اور یہ تیسرے صاحب اللہ اور رسول کے منصب عالیہ پر سرافراز ہوتے ہیں وہ اپنے پیشرو کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتے اور قرآن کو اپنی اہواء کے مطابق جامۂ عمل پہناتے ہیں۔ غرض ہر نیا آنے والا مرکزِ ملت، جانے والے کے کام کو منسوخ کر کے اپنی مرضیات کے مطابق خطوط وضع کرے گا اور اس طرح قوم و ملت ان کے تجربات کا تختۂ مشق بنی رہے گی آئے دن کی اکھاڑ پچھاڑ اور تخریب و تعمیر سے کوئی بھی تہذیبی و اجتماعی ڈھانچا نہ بن سکے گی تخریبِ ملت کا یہ وہ نسخہ ہے جو آج تک اس کے دشمنوں کو بھی نہ سوجھا تھا۔ یہ نسخہ ملتِ اسلامیہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کا وہ کام کرے گا جو ملت کے دشمنوں

کی فوجی و تہذیبی طاقت صدیوں کی سر توڑ کوشش کے باوجود انجام نہیں دے سکی۔

ایک بات اور ـــ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مطہرہ ہر عاصی سے عاصی اور خطاکار سے خطاکار مسلمان کی محبت و ایمان کا مرکز ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ اگر مسلمان مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہیں تو وہ میرے رسولؐ کی اتباع کریں، تبھی میں ان سے محبت کروں گا (قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ۔ آل عمران ۳۱) جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے رسولؐ جو فیصلہ فرمائیں اہلِ ایمان کا کام یہ ہے کہ اس فیصلے کے آگے بے چون و چرا سر جھکا دیں اور اپنے دل میں ذرا بھی تنگی نہ لائیں (فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتَّىٰ يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ۔۔ النساء ۶۵) جن کی آواز آپ کے حضور اپنی آواز کو بلند کرنے اور جن کے حضور عام آدمیوں کی طرح اونچی آواز میں باتیں کرنے پر یہ وعید سنائی گئی تھی کہ تمہارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں گے (لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ ٥ الحجرات ۲) خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسلمان کی نشانی یہ بتائی تھی کہ اس کے دل میں میری محبت اپنے ماں باپ اور دوسرے سب انسانوں سے بڑھ کر ہوتی ہے اور اس کے بغیر اس کا دعویٰ ایمان غلط ہے (لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّىٰ أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۔) اللہ تعالیٰ کے یہی ارشادات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات ہیں کہ ایک مسلمان یہ تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ آپؐ کی ذات سے کوئی کینہ اور بغض رکھتے ہوئے مسلمان رہ سکتا ہے، اپنے مقدس ہادی و رہنما کی عزت پر کٹ مرنے کو وہ اپنے ایمان کا تقاضا سمجھتا ہے۔ بقول ظفر علی خاں مرحوم :

نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی عزت پر   خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

یہ تو ہم خطا کار مسلمانوں کی کیفیت ہے مگر میں نے اس گفت گو کے دوران میں محسوس کیا کہ جو اسم مقدس ہم عاصیوں کے لیے زندگی، ایمان اور نجات کا پیغام بر ہے وہ زیغِ قلب کے ان مریضوں کے کانوں میں پڑتا ہے تو وہ سخت پیچ و تاب کھانے لگتے ہیں۔ میں نے جب بھی ان منکرِ سنّت کے دلائل کو رد کرنے کے لیے رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت و اتباع کے دلائل دیے۔ ان صاحب کی قوتِ برداشت جواب دے گئی وہ ہر بار سخت گرم ہو جاتے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بس اب الجھ ہی پڑیں گے۔

(۱۷ - ۲۴ جولائی ۱۹۶۱ء)

—— ✤ ——

منکرینِ سُنّت کا فریب

"ایشیا" کے گزشتہ شمارے میں محمّد فاروق صاحب نے حیدرآباد سے منکرینِ سنّت کے سرخیل پرویز صاحب کی آمد آمد کی داستان اور کالج کے طلبہ سے خطاب کا قصّہ بیان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان کی تقریر کے بعد بزمِ طلوعِ اسلام کراچی کی جانب سے لفافوں میں بند پمفلٹ تقسیم ہوئے۔ مراسلہ نگار کو جو لفافہ ملا اس میں ایک پمفلٹ تھا:

"پاکستان کے چند بڑے بڑے منکرینِ حدیث"

مراسلہ نگار کے بیان کے مطابق اس پمفلٹ میں مسلمانوں کے چند بڑے بڑے علماء کو منکرینِ حدیث قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ وہ حدیث کے زبردست حامی ہیں۔ مولانا مودودی کو بھی انھی "منکرینِ حدیث" میں شمار فرمایا گیا ہے۔

خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیئے
ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہیئے

اصل میں پرویز صاحب نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ ان کی دعوتِ انکارِ سُنّت کو اس طبقے کے افراد تو بڑی خوشی سے قبول کر لیتے ہیں جو مذہبی رہنا چاہتا ہے اور ہاتھ سے جنّت بھی دینا نہیں چاہتا۔ یہ دعوت ان کے لیے اپنے اندر بڑی کشش رکھتی ہے۔ سُنّت کا قلادہ گلے سے اتار دیجیے اور پھر جس کھیت میں چاہے منہ مار لیجیے اور جس چراگاہ کو جی میں آئے روند دیجیے اور قرآن کا مومن کہلایئے، لیکن عام مسلمان جو قرآن کے ساتھ ساتھ سُنّت کی پیروی

کو بھی ایمان کا لازمی تقاضا سمجھتے ہیں، وہ ان کے دام میں آنے کے لیے تیار نہیں۔ اس لیے عام مسلمانوں کو پھانسنے کے لیے انہوں نے یہ تکنیک اختیار کی ہے کہ وہ چند بڑے بڑے علمائے اسلام کے منکرینِ حدیث ہونے کا پراپیگنڈا کرتے ہیں۔ گویا وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں؛ ؎

نہ من تنہا دریں میخانہ مستم
جنید و شبلی و عطارؒ و ہم مست

یعنی اگر مسلمان یوں میری جانب متوجّہ نہیں ہوتے تو وہ یہ سن کر کہ فلاں فلاں عالم بھی میرا ہم نوا ہے ضرور متوجّہ ہوں گے ـــــ دوسروں کا نام بے جا طور پر استعمال کر کے اپنی عظمت کا قصر تعمیر کرنا پرویز صاحب کا پرانا شیوہ ہے۔ اقبال مرحوم کے نام کو وہ اس مقصد کے لیے ابتداہی سے استعمال کر رہے ہیں۔ وہ گاہے گاہے قائدِ اعظم مرحوم کا نام بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس طرح وہ پاکستان کے مسلمانوں کو یہ تأثر دیتے ہیں کہ قائدِ اعظم کی نگاہ میں ان کی ذات والاصفات بڑی اہمیت رکھتی تھی؟ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنّت پر ایمان رکھنے والے ہم مسلمان تو کسی کی جانب کوئی غلط بات منسوب کرنے کے اس فعل کو جھوٹ اور مکر و فریب سے تعبیر کریں گے مگر پرویز صاحب نے جن "قرآنی معارف" کو ساڑھے تیرہ سو برس کے عرصے میں پہلی مرتبہ اُمّت پر آشکارا کیا ہے، اُن کی رُو سے یہ عین صدق و حق ہے، چنانچہ وہ ضمیر کی ادنیٰ خلش اور شرمساری کے بغیر شاہ ولی اللہ تک کو منکرینِ حدیث کی صف میں شامل کر لیا کرتے ہیں۔

ویسے پرویز صاحب ہی دوسروں کے نام اپنے پراپیگنڈے کے لیے استعمال کرنے میں مہارت نہیں رکھتے۔ ہر وہ شخص یا گروہ جو حق کے نام پر باطل کا علمبردار ہو، دوسروں کو اپنی جانب متوجّہ کرنے یا اپنے آپ کو برسرِحق ثابت کرنے کے لیے عموماً یہی کھیل کھیلتا

ہے۔ مثلاً قادیانی حضرات جب ختمِ نبوّت سے متعلق دلائل کا جواب دینے سے عاجز آجاتے ہیں تو وہ "صوفی گل خیرہ" سے لے کر شیخ ابن العربیؒ تک کے "صوفیا" کا نام گن جاتے ہیں کہ یہ سب حضرات نبوّت کے جاری ہونے کے قائل تھے۔ یا اگر آپ ان کے "نبی" صاحب کی سیرت و کردار کے چند اوراق کھول کر ان کے سامنے رکھیئے اور سوال کیجیئے کہ کیا نبی ایسا ہو سکتا ہے؟ تو وہ فوراً مختلف انبیاء کے متعلق یہودیوں کی گھڑی ہوئی روایات سنانے لگیں گے کہ صاحب پہلے نبی بھی تو اس کردار کے ہو گزرے ہیں (العیاذ باللہ) غرض اپنی بدمستی کو لباسِ جواز پہنانے کے لیے جنید و شبلی و عطّار کو اپنے دوش بدوش کھڑا کرنا حق فراموش افراد اور گروہوں کا عام شیوہ ہے۔

قادیانیوں کا ذکر چھڑا ہے تو یہ بھی سن لیجئے کہ پہلے تو یہ حضرات اپنے مسلک کی تبلیغ اپنے "حضرت" کی "پیش گوئیوں" کے ذریعے کیا کرتے تھے، مگر اب کچھ مدّت سے انہوں نے "الہاماتِ مرزا" کو در کنار رکھ کر امریکہ کے جریدہ "لائف" اور "علامہ" نیاز فتح پوری تک کو استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ "لائف" میں ان کی سرگرمیوں کا حال چھپ گیا بس پھر کیا تھا انہوں نے اس کا ترجمہ کروا کر ناواقف اور بے خبر مسلمانوں میں تقسیم کرنا اور اپنے آپ کو برسرِ حق ہونا ثابت کرنا شروع کر دیا۔ اسی طرح کہیں علامہ صاحب نے آنجہانی مرزا صاحب کی "بصیرت" کی شان میں قصیدہ پڑھ دیا اب قادیانی حضرات ہیں کہ اسے پمفلٹ کی صورت میں چھاپ کر مسلمانوں میں اس طرح بانٹ رہے ہیں گویا بہت بڑی "شہادت" ہاتھ آگئی ہے۔ حالانکہ علامہ نیاز فتح پوری صاحب کی اپنی بصیرت کا یہ حال ہے کہ انفس و آفاق میں پھیلے ہوئے ان گنت آثار دیکھنے کے باوجود خدا کے وجود ہی کو محلِّ نظر سمجھتے ہیں، نبی پر ایمان لانا تو ایک طرف وہ وحی و الہام کی حقیقت سے بھی انکاری اور معاد و آخرت کے بارے میں شک رکھتے ہیں۔ ایسے "با بصیرت" شخص ہی کو مرزا صاحب کے ہوا خواہ اپنے برسرِ حق ہونے کی شہادت میں پیش کر سکتے ہیں!

بات منکرینِ سُنّت کی ہو رہی تھی۔ یہ لوگ ہماری تاریخ کے ان رجالِ عظیم کو، جن کی وساطت سے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی احادیث و روایات ہم تک پہنچی ہیں، بلا کسی امتیاز کے نہایت دریدہ دہنی کے ساتھ وضاعین، دروغ گو اور عجمی سازش کے علمبردار کہتے ہیں اور مشورہ دیتے ہیں کہ ہم احادیثِ رسول ؐ کے ذخائر کو تاریخ کے زمرے میں شمار کریں اور ان کو دین کا مأخذ نہ مانیں اور ان کی خواہشاتِ نفس پر جسے وہ قرآنی معارف کا نام دیتے ہیں، ایمان لے آئیں۔ آیئے آج ہم ان رجالِ عظیم کی سیرت و کردار کے چند پہلوؤں پر ایک نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ اخلاق و ایمان کے اعتبار سے وہ کتنی بلند شخصیتیں تھیں، جن کے منہ یہ بندگانِ ہوس آرہے ہیں۔

ان منکرینِ سُنّت میں سے اکثر وہ لوگ ہیں جن کی عمر کا ایک بڑا حصّہ کفّار کی چاکری اور ان کا کلمہ بلند کرنے میں گزرا ہے (اور اگر سُنّت کو ماننے والے مسلمان پاکستان نہ بناتے تو مرتے دم تک یہ کفّار ہی کا نمک کھاتے رہتے) اور ان قرآنی معارف کے بیان کرنے اور ان پر ایمان لانے والوں کو کبھی احساس تک نہ ہُوا کہ قرآن کفّار اور طاغوت کی چاکری کو حرام قرار دیتا ہے، لیکن جن مردانِ عظیم کے یہ منہ آتے ہیں، ان کی کیفیت یہ تھی کہ وہ اہلِ حکومت ـــ کافر نہیں مسلمان اہلِ حکومت ـــ کے قریب تک نہیں پھٹکتے تھے، ان سے اجتناب کرتے تھے اور اگر خلفاء ان کی جلالتِ علم کے پیشِ نظر خود ان کی قدم بوسی کو حاضر ہوتے تھے تو نہایت بے نیازانہ برتاؤ کرتے تھے۔

سعید بن مسیّبؒ جن کی جلالتِ علم کے بڑے بڑے صحابہؓ بھی معترف تھے اور جو اپنے زہد و ورع کی بدولت ساداتِ تابعین میں گنے جاتے ہیں، اموی خلیفہ عبدالملک نے بارہا ان سے ملنے کی خواہش کی مگر انہوں نے ہمیشہ انکار کر دیا۔ ایک مرتبہ وہ مدینے گیا اور مسجدِ نبوی کے دروازے پر کھڑے ہو کر انہیں بلا بھیجا۔ انہوں نے پیغام سن کر جواب دیا: "نہ امیر المومنین کو مجھ سے کوئی حاجت ہے اور نہ مجھے ان سے احتیاج۔ اگر امیر المومنین

کو کوئی ضرورت ہو بھی تو وہ پوری نہیں ہو سکتی ۔ عبدالملک نے یہ جواب سن کر اپنے آدمی کو پھر بھیجا، مگر کہہ دیا کہ سختی نہ کرنا۔ سعید بن مسیبؒ نے وہی پہلا جواب دیا۔ وہ شخص جھلا اٹھا، بولا: "اگر امیرالمومنین نے ہدایت نہ کی ہوتی تو میں تمہارا سر ان کی خدمت میں لے جاتا۔ امیرالمومنین تمہیں بار بار بلا بھیجتے ہیں اور تم ایسا جواب دیتے ہو۔" سعیدؒ نے کہا "اگر عبدالملک میرے ساتھ بھلائی کرنا چاہتا ہے، تو وہ بھلائی میں تمہیں بخشتا ہوں۔ اور اگر اس کا ارادہ کچھ اور ہے تو وہ جو چاہتا ہے کر گزرے، میں تو نہیں جاؤں گا۔" عبدالملک نے یہ جواب سنا تو بولا: "خدا ابو محمد پر رحم کرے، ان کی سختی بڑھتی ہی جاتی ہے۔"

ایوب بن ابی تمیمہ سختیانیؒ غلام تھے مگر کشورِ علم و عمل کے تاجدار تھے۔ امام مالکؒ، سفیان ثوریؒ، اعمشؒ اور قتادہؒ ایسے حضرات ان کے حلقۂ تلمذ سے تعلق رکھتے تھے۔ اربابِ حکومت سے ہمیشہ اجتناب کرتے حتیٰ کہ وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ کوئی خلیفہ ان کے مکان پر آتے۔ ایک مرتبہ فرمایا: "مجھے میرا بیٹا جگر و دل و جان سے پیارا ہے۔ مگر اس کے باوجود مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ میں اسے اپنے ہاتھوں سے دفن کروں بہ نسبت اس کے کہ ہشام یا کوئی اور خلیفہ میرے پاس آتے۔"

یزید بن ولید سے ان کے ذاتی مراسم تھے مگر جب وہ خلیفہ بنا تو دعا کی اے اللہ میرے ذکر کو چھپا لے۔

محمد بن سیرینؒ بڑی ہی باعظمت شخصیت تھے، لیکن اربابِ اقتدار اور سلطنت کے اعیان و امراء سے ان کی بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ ایسے خلیفہ راشد نے ان کے اور حسن بصریؒ کے پاس کچھ ہدایا بھیجے۔ حسن بصریؒ نے تو انہیں قبول کر لیا لیکن انہوں نے انہیں واپس کر دیا۔

اربابِ حکومت سے اس استغنا و اجتناب کے ساتھ ساتھ ان رجالِ عظیم

میں جو حق گوئی و بے باکی اور عزیمت پائی جاتی تھی، منکرینِ سُنّت جو ہر چڑھتے سورج کو "مرکزِ ملّت" کے "تختِ" پر بٹھا کر اس کی پُوجا کرنے کو تیار رہتے ہیں (بشرطیکہ اس کے ذریعہ انہیں اپنے عزائم پورے ہوتے نظر آئیں) اپنے لیے اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

سعید بن مسیّبؒ ہی کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ عبدالملک کی ان سے اتفاقاً ملاقات ہو گئی۔ تو بولا "ابو محمدؒ اب میری یہ حالت ہو گئی ہے کہ اگر اچھا کام کرتا ہوں تو اس پر کوئی مسرّت نہیں ہوتی اور کوئی بُرا کام کرتا ہوں تو اس کا کوئی رنج نہیں ہوتا"۔ فرمایا: "اب تمہارا قلب پوری طرح مر گیا ہے"۔

ایک مرتبہ سعید ابن مسیّبؒ کے پاس سے بنی مروان کا ہرکارہ گزرا۔ سعیدؒ نے اس سے پُوچھا: "تم بنی مروان کے ہرکارے ہو؟" اس نے کہا "ہاں"۔ پُوچھا "تم انہیں کس حال میں چھوڑ آئے ہو؟" اس نے جواب دیا: "اچھے حال میں"۔ ابن مسیّبؒ نے فرمایا: "وہ انسانوں کو بھوکا رکھتے ہیں اور کتّوں کا پیٹ بھرتے ہیں"۔ یہ سن کر ہرکارہ آپے سے باہر ہو گیا مُطّلب بن سائب جو ابن مسیّبؒ کے ہمراہ تھے کہتے ہیں کہ میں نے کسی طرح اس کا غصّہ فرو کر کے اُسے بھیج دیا اور پھر سعیدؒ سے کہا: "خدا تمہاری مغفرت کرے، تم کیوں اپنی جان کے دشمن بن گئے ہو؟" انہوں نے فرمایا: "احمق! چُپ رہ۔ بخدا جب تک میں اللہ کے حقوق کی حفاظت کرتا ہوں اس وقت تک وہ مجھے ان کی گرفت میں نہ دے گا"۔

یزید بن ہارونؒ بلند پایہ مُحدّث تھے اور اتنی بلند شخصیت کہ عبّاسی خلیفہ مامون الرشید بھی ان کی جرأتِ حق گوئی سے خوف کھاتا تھا۔ وہ ایک مدّت تک صرف اس وجہ سے اپنے عقیدہ خلقِ قرآن کا اعلان نہ کر سکا کہ ہارون نے میری تردید کر دی تو زبردست ہنگامہ اٹھ کھڑا ہو گا۔ وہ کہا کرتا تھا۔ لولا مکان یزید بن ھارون لاظھرت القرآن مخلوقا۔ یزید بن ہارونؒ کو مامون کے اس رجحان کی خبر تھی، لیکن اس کے باوجود ان کی حق گوئی کا یہ عالم تھا کہ بے خوف ہو کر اعلان کرتے تھے۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ جو شخص خلق قرآن کا قائل ہے وہ کافر ہے۔"

محدثین کرام احادیث کی چھان بین کرنے اور صحت پرکھنے میں اس قدر محنت و مشقت، دقت علم و نظر اور احتیاط و ورع سے کام لیتے تھے کہ انہیں پورا الیقین ہوتا تھا کہ جو شخص ان کے معیار پر کھوٹا ثابت ہوا ہے وہ فی الواقع کھوٹا ہی تھا اور انہوں نے اسے غیر ثقہ اور ناقابل قبول قرار دینے میں کوئی غلطی نہیں کی۔ اس کی ایک مثال ہارون بن بشیر الرازیؒ کے بیان سے سامنے آتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے یحییٰ بن معینؒ کو دیکھا قبلہ رُو بیٹھے ہوئے تھے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے اور دعا مانگ رہے تھے "اے خدا اگر میں نے کسی شخص پر تنقید و جرح کر کے اس کی کذب بیانی واضح کی ہو، مگر اس میں وہ بات نہ ہو تو میری مغفرت نہ فرمانا۔" اس دیدہ ریزی اور احتیاط و ورع کے باوجود محدثینؒ جب کوئی حدیث بیان کرتے تو ان کی راتوں کی نیند اس خیال سے حرام ہو جاتی کہ کہیں ان سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو گئی ہو! چنانچہ وہ انہیں بار بار پرکھنے ہی میں پوری رات گزار دیتے۔ خود یحییٰ بن معینؒ جنہیں اپنے معیار کی صحت کا یقین کامل ہوتا تھا، کہتے ہیں "میں بعض اوقات حدیث بیان کر دیتا ہوں لیکن پھر اس خوف سے رات بھر اس کی چھان بین اور نقد و نظر میں جاگتا رہتا ہوں کہ کہیں میں نے اس میں غلطی نہ کر دی ہو۔"

اور یہ یحییٰ ابن معینؒ وہ ہیں کہ جب فوت ہوئے تو ان کا جنازہ اس شان سے اٹھا کہ آگے آگے ایک شخص پکارتا جاتا تھا "یہ اس شخص کا جنازہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ منسوب ہونے والی باتوں کو دور کرتا تھا۔ لوگ اس پکار کو سن کر جوق در جوق جنازے میں شریک ہوتے جاتے اور آپس میں کہتے جاتے "ھذا الذی ذب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الکذب" یہ وہ شخص ہیں جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹ کو دور کیا ہے۔ یہ ہیں وہ عظیم انسان، منکرین سنت جن کے منہ آتے ہیں اور ان کے کردار پر کیچڑ اچھالتے ہیں اور خود

ان کا اپنا یہ حال ہے کہ لوگوں کی طرف غلط بات منسوب کرنے سے ذرا انہیں شرماتے۔

۲۲ر نومبر، ۲۷ر دسمبر ۱۹۶۰ء

شبِ معراج کا تحفہ

شبے دیباچۂ صبحِ سعادت
ز دولت ہائے روز افزوں زیادت
سوادِ طرّہ اش خجلت دہِ نور
بیاضِ غرّہ اش نورٌ علیٰ نور
نسیمش جعدِ سنبل شانہ کردہ
ہوایش اشکِ شبنم دانہ کردہ
طرب راچوں سحر خنداں ازاں لب
گریزاں روزِ محنت زو شباشب
دریں شب آں چراغِ اہلِ بینش
منزلے آفریں از آفرینش
چوں دولت خود زبد خواہاں نہانی
سوئے دولت سرائے اُمِّ ہانی

بہ پہلو تکیہ بر مہرِ زمیں کرد
زمیں را مہدِ جانِ نازنیں کرد
دلش بیدار و چشمش در شکرِ خواب
ندیدہ چشمِ بخت ایں خواب در خواب
در آمد ناگہاں ناموسِ اکبر
سبک رو تر ازیں طاؤسِ اخضر
بر و بالیدہ پر کای خواجہ برخیز
کہ امشب خوابت آمد دولت انگیز
بروں بر یک زماں زیں خوابگہ رخت
تو بختِ عالمی بیدار بہ بخت
ازاں دولت سرا چوں خواجۂ دیں
خراماں شد بہ عزمِ خانۂ ایں
شد از صبوحیاں گردوں صدا دہ
کہ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ

(جامی)

معراجِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مقدسہ ہی کا نہیں، پوری تاریخ انسانیت کا ایک عظیم الشّان واقعہ ہے۔ ایک عظیم الشّان واقعہ جس نے زمانے کے دھارے کا رُخ موڑ دیا اور شاہراہِ حیات پر اخلاق و تمدّن کا ایک ایسا بلند و بالا مینارِ نور نصب کر دیا جس کی روشنی سے بے نیاز ہو کر انسانی قافلے ایک قدم بھی راہِ راست پر چل نہیں سکتے۔ لیکن دیکھنے والا یہ دیکھ کر سرگشتہ و حیران رہ جاتا ہے کہ انسان کی عملی زندگی کے لیے یہ عظیم الشان واقعہ جس قدر اہمیت اپنے دامن میں رکھتا ہے اتنا ہی اس کو عقل و دانش کی پیچیدگیوں اور افسانہ پسندیوں میں گم کر دیا گیا ہے۔ اغیار تو اغیار ہیں۔ وہ اگر اس عظیم واقعہ کے ظہور کا انکار کریں تو یہ انکار قابلِ فہم ہے کہ جو رسولِ صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یقین و ایمان نہیں

رکھتے، وہ شبِ اسریٰ کے اس واقعے کو کیوں کر تسلیم کر سکتے ہیں۔ کور بین آنکھ اگر روشنی کے وجود ہی سے انکار کرتی ہے تو وہ اس منبع پر کیسے ایمان لائے گی جس سے نور کی کرنیں پھوٹ پھوٹ کر ایک عالم کو منور کر رہی ہیں۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم
چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

مگر اپنوں نے کچھ خود کی واماندگیوں اور کچھ غیروں سے ذہنی مرعوبیت کی بنا پر اس واقعے کو جس طرح تاویلات کا گورکھ دھندا بنا ڈالا ہے وہ زیادہ افسوس ناک ہے۔

ایمان و صدّیقیت کا ایک عالم وہ تھا کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے قریشِ مکّہ شبِ اسریٰ کی واردات کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ لو تمہارے صاحب یہ تو کہتے ہی تھے کہ ان پر آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے، آج انہوں نے یہ خبر سنائی ہے کہ وہ راتوں رات بیت المقدس اور آسمانوں کی سیر کر آئے ہیں تو یہ مردِ مومن جو حقیقتِ حال سے بے خبر تھے کسی تذبذب اور تامّل کے بغیر جواب دیتے ہیں کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو اگر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے واقعی یہ بیان فرمایا ہے تو میں گواہی دیتا ہوں کہ حضورؐ سچ فرماتے ہیں۔ اور ایک حالت یہ ہے کہ مدتوں سے ذہنی و فکری مُوشگافیاں جاری ہیں، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جسدِ عنصری کے ساتھ معراج پر تشریف لے گئے تھے یا یہ عالمِ خواب کا واقعہ تھا۔ آج جبکہ انسان سپوتنک اور مصنوعی سیاروں کے ذریعے چاند اور مریخ پر پہنچا اور آسمان میں تھگلی لگایا چاہتا ہے شاید ان لوگوں کے لیے جن کی خرد معراج کی حقیقتِ اصلیہ سے بہرہ یاب ہونے سے قاصر تھی بصیرت افروزی کا کوئی سامان مل جائے۔ لیکن اس فکری مُوشگافی اور بحثم بحثی کا انجام یہ ہُوا ہے کہ اُمّت کی نظر سے معراج کی اصل اہمیّت اوجھل ہو گئی۔ اس کے علماء نے اسے اپنی ذہنی نبرد آزمائیوں کا موضوع بنا لیا اور اس کے عوام اسے اپنی خوش عقیدگی کا سرمایہ سمجھ بیٹھے معراج کا واقعہ جب پیش آیا ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو دعوتِ حق دیتے

ہوئے گیارہ برس گزر چکے تھے۔ مکہ میں جن سعید روحوں کو اس دعوت پر لبیک کہنا تھی وہ کہہ چکی تھیں اور اب متمردین اور شورہ پشتوں یا ایسے لوگوں کے سوا اور کوئی باقی نہ رہا تھا جن کے دل کی آنکھیں دعوتِ حق کی فتوحات اور کامرانیوں سے کھل سکتی تھیں۔ اب یہ دعوت نئے مرکز کو منتقل ہونے والی تھی جہاں اسے ایک اسٹیٹ کی روح و رواں بننا تھا۔ اب تک اس دعوت کا دائرہ عقائد و نظریات کو دلوں میں راسخ کرنے اور اخلاق و کردار کی اصلاح تک محدود تھا، آئندہ اس کی بنیادوں پر ایک ایسی مملکت تعمیر کی جانے والی تھی جسے رہتی دُنیا تک قوموں اور ملکوں کے لیے ہدایت و رہنمائی کا نمونہ بننا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حضور بلا کر وہ اصول عطا کیے جن پر مدینہ کی اسلامی ریاست اور مسلم معاشرہ قائم کیا جانے والا تھا۔

یہ اصول سیاست، اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت، تجارت، تعلیم غرض ہر شعبۂ زندگی سے متعلق تھے۔ ان میں بتایا گیا تھا کہ ایک اسلامی ریاست میں اقتدارِ اعلیٰ کا مالک اللہ کی ذات ستودہ صفات ہے۔ اسی شاہنشاہِ کائنات کی بندگی اور غلامی اس ریاست کا مقصدِ وجود ہونا چاہیئے۔ تمدن میں خاندان کو بنیادی اہمیت حاصل ہے اور افرادِ خاندان کے باہمی خوش گوار تعلقات پر ہی اس تمدن کی مضبوطی اور قوت کا انحصار ہے۔ معاشرہ کے مختلف طبقات باہم ہمدردی، بہی خواہ اور مصائب و آلام میں مددگار ہونے چاہئیں۔ دولت کے ضیاع، بے جا بخل اور اسراف سے بچ کر معیشت کی بنیادیں استوار کرنی چاہئیں۔ وسائلِ رزق کا جو انتظام اللہ نے کر دیا ہے اس کو بعینہٖ برقرار رکھنا چاہیئے۔ معاشی مشکلات اور رزق کی کمی کے خوف سے افزائش نسل کی روک تھام نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ رزق کی کنجیاں اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ جو تمہیں رزق دیتا ہے وہی آنے والی نسلوں کو بھی دے گا۔ فواحش اور بدکاری کے دروازے کلیتہً بند ہی نہ کر دینے چاہئیں بلکہ ایسا ماحول بھی پیدا کرنا چاہیئے جس میں ان دروازوں کے کھلنے کا امکان ہی نہ رہے۔ انسانی جان کا احترام کرنا چاہیئے اور حق کے بغیر کسی انسان کا خون نہیں بہانا چاہیئے۔ عہد و پیمان کا پاس کرنا چاہیئے کہ اس کی اللہ کے آگے جواب دہی کرنا ہوگی

تجارت، صدق و دیانت اور ٹھیک ٹھیک ناپ تول پر مبنی ہونی چاہیئے۔ نظامِ تعلیم کی بنیاد وہم و گمان اور اٹکل پچوں کے بجائے اللہ کے دیئے ہوئے علم پر رکھنی چاہیئے۔ غرور و نخوت سے مسلم معاشرے اور افراد کو احتراز کرنا چاہیئے۔

یہ تھے انسان کی حیاتِ اجتماعی کے وہ اصول جو معراج کی بابرکت اور عظیم رات میں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی وساطت سے نوعِ انسان کو دیئے گئے۔ ان اصولوں پر مدینہ کی جو اسلامی ریاست قائم ہوئی اور جو اسلامی معاشرہ وجود میں آیا تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ وہ ایک ایسا معاشرہ تھا جو ایک اللہ کے سوا کسی کے آگے سرنگوں نہ ہوتا تھا جس کے افراد سگے بھائیوں سے بڑھ کر ایک دوسرے کے ہمدرد، بہی خواہ اور مددگار تھے، جو پاکیزگیٔ فکر و نظر اور طہارتِ اخلاق و کردار کا پیکر تھے، جو تجارت، معیشت معاشرت اور سیاست غرض زندگی کی ہر کسوٹی پر کھرا سونا تھے۔ جن کے عہد و پیمان پر دشمن بھی اعتماد کرتا تھا اور جن کی زندگی سادگی، فیّاضی، خوفِ خدا اور مسئولیّتِ آخرت کے احساس سے عبارت تھی اور جو اسلامی ریاست وجود میں آئی وہ امن و امان، نظم و ضبط، عدل و قسط، انسانی مساوات اور نظریہ و عمل کی ہم آہنگی کا ایک دلپذیر مرقّع تھی۔ جہاں جاہلی امتیازات اور طبقاتی تفریقات ناپید تھیں اور جہاں حکمران اور عوام ایک ہی قانون کے تحت زندگی بسر کرتے تھے۔ جہاں اگر کوئی امتیاز تھا تو ان نظریات و عقائد پر ایمان و عمل کی بنیاد پر تھا جس پر یہ ریاست اور معاشرہ قائم تھا۔

شبِ معراج کی سب سے بڑی اہمیت یہی ہے اور آج بھی اس کے دامن میں کوئی پیغام مسلمانوں کے لیے ہے تو یہی کہ جو اصولِ اخلاق و تمدّن اللہ نے اپنے حبیب صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اپنی بارگاہ میں مدعو فرما کر عطا کیے تھے ان پر وہ اپنے معاشرے اور ریاست کی بنیادوں کو ازسرِ نو اُستوار کریں۔ دنیا کو آج بھی ان اصولوں کی ویسی ہی احتیاج ہے جیسی احتیاج اس وقت تھی جب رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کو سفرِ معراج پر بلایا گیا۔ بلکہ دنیا سے پہلے

خود مسلمانوں کو ان کی ضرورت ہے۔ وہ جہاں آزاد ہیں وہاں اپنے نفس و خواہشات کی بندگی کر رہے ہیں اور جہاں محکوم ہیں وہاں اغیار کے آگے سرنگوں ہیں۔ ان کا معاشرہ پراگندہ اور باہمی عناد کا شکار ہے۔ ایک دوسرے کی ہمدردی، بہی خواہی اور دکھ سکھ میں موانست قصۂ ماضی بن چکی ہے۔ ان کا تمدن جن بنیادوں پر قائم تھا وہ ایک ایک کر کے ڈھے چکی ہیں۔ فواحش، بدکاری اور بے حیائی کا ایک طوفان ہے جو امڈا آ رہا ہے۔ بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہے۔ مسلمان کی جان بغیر کسی حق کے مباح قرار پا چکی ہے۔ تجمل اور اسراف نے ان کی معیشت کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ اللہ کی رزاقیت پر سے ان کا ایمان اٹھ چکا ہے اور وہ ہر جگہ قتل اولاد کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔ بددیانتی اور بدعہدی، جہالت اور وہم و گمان کی پیروی اور غرور و تکبر ان کی قومی خصوصیات بن چکی ہیں۔ اخلاقی قدریں ایک ایک کر کے دم توڑتی جا رہی ہیں۔ ان کی زندگی اسی پیغام کو اپنانے میں ہے جو شبِ معراج ان کو دیتی ہے۔

سَرَيْتَ مِنْ حَرَمٍ لَيْلًا إِلَىٰ حَرَمٍ
كَمَا سَرَى الْبَدْرُ فِي دَاجٍ مِّنَ الظُّلَمِ

وَبِتَّ تَرْقَىٰ إِلَىٰ أَنْ نِّلْتَ مَنْزِلَةً
مِنْ قَابِ قَوْسَيْنِ لَمْ تُدْرَكْ وَلَمْ تُرَمِ

وَأَنْتَ تَخْتَرِقُ السَّبْعَ الطِّبَاقَ بِهِمْ
فِي مَوْكِبٍ كُنْتَ فِيهِ صَاحِبَ الْعَلَمِ

حَتَّىٰ إِذَا لَمْ تَدَعْ شَأْوًا لِّمُسْتَبِقٍ
مِنَ الدُّنُوِّ وَلَا مَرْقًى لِّمُسْتَنِمِ

يَا رَبِّ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا أَبَدًا
عَلَىٰ حَبِيبِكَ خَيْرِ الْخَلْقِ كُلِّهِمِ

(امام بصیریؒ)

(۵ فروری ۱۹۵۹ء)

عشقِ رسولؐ کے تقاضے

عید میلاد النبیؐ اب کی بار بڑی دھوم دھام سے منائی گئی۔ عام مسلمان یوں تو پہلے بھی اس تقریب کو بڑے ارمانوں کے ساتھ منایا کرتے تھے مگر اس مرتبہ حکومت نے سرکاری طور پر منانے کا اہتمام و اعلان کیا تو گویا اس نے مسلم عوام کے رہوارِ عقیدت کے لیے مہیز کا کام کیا اور اس طرح تقریب کی شان دوبالا ہو گئی۔ جہاں تک امرِ واقع کا تعلق ہے۔ ۱۲ ربیع الاوّل پوری انسانی تاریخ میں ایک غیر فانی اہمیت کا حامل ہے۔ اس روز وہ ذاتِ بابرکات پہلوئے آمنہ سے ہویدا ہوئی جس نے تاریخ انسانی کے دھارے کا رُخ پلٹ دیا۔ انسانیت کو پستیوں سے نکال کر عظمت و رفعت کے آسمان پر پہنچایا، انسان کو ان زنجیروں سے نجات دلائی جس میں وہ صدیوں سے جکڑا چلا آ رہا تھا۔ اس کی پشت سے وہ بوجھ اتارے جن کے نیچے وہ قرنہا قرن سے دبے جا رہا تھا، جس نے اسے کفر و ضلالت کی تاریکیوں سے نکال کر راہِ حق و ہدایت پر چلایا، اس کے دکھوں اور آلام کا مداوا بخشا اور دنیا کو ایک ایسا نظامِ اجتماعی دیا جس کو اپنا کر وہ امن و سلامتی کی گہوارہ بن سکتی ہے اور جس میں رنگ و نسل، وطن اور علاقے اور امارت و افلاس کی بنیادوں پر انسان اور انسان کے درمیان کوئی تفریق نہیں ہے۔ فی الواقع رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عالمِ انسانی پر بہت بڑا احسان ہے۔ آپ رحمۃ للعالمین بن کر آئے تھے اور اسے غیر بھی تسلیم کرتے ہیں کہ آپ نے دنیا کا دامن تہی رحمت سے بھر

دیا۔ آپؐ ہی کے طفیل وہ اُمّتِ مسلمہ وجود میں آئی جو بعد کے ہر دور اور ہر زمانے کی تاریکیوں میں دوسری اُمّتوں کے لیے مینارہ نورِ ہدایت بنی رہی ہے اور جس نے انسانی نقطۂ نظر سے ایسے افراد لاکھوں کی تعداد میں پیدا کیے ہیں کہ کوئی دوسری اُمّت اس معاملے میں اس کی ہمسری کا دعوٰی نہیں کر سکتی۔ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دنیا پر یہ عظیم احسان ہے اور سخت احسان فراموش ہے وہ انسان جو اس احسان کو تسلیم نہ کرے اور عالمِ انسانی کے اس محسنِ اعظم کی ممنونیت اور احسان مندی کے جذبے سے جس کا دل خالی ہو۔

پھر جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے محبّت و عقیدت ان کے ایمان کا تقاضا ہے۔ جس شخص کے دل میں آپؐ کی محبّت نہیں وہ اپنے دعوٰئ ایمان میں جھوٹا ہے۔ ایمان و اسلام اور رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم سے محبّت، دونوں لازم و ملزوم ہیں اور محبت بھی وہ جس کے آگے دوسری ساری محبّتیں ماند پڑ جائیں۔ خود نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے :

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہٖ وولدہٖ والناس اجمعین

(تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک اپنے دعوٰئ ایمان میں صادق نہیں ہو سکتا جب تک وہ میری محبّت کو اپنے باپ، اپنے بیٹے اور دنیا کے سب لوگوں کی محبّت پر ترجیح نہیں دیتا۔

لیکن اس محبّت کا تقاضا پورا کرنے کا جو ڈھنگ ہم مسلمانوں نے اختیار کیا ہے وہ ہمیں سلف صالحین کی زندگی میں کہیں نظر نہیں آتا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بڑھ کر رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا محبِّ صادق اور کون ہو سکتا ہے۔ ہمیں ان کی زندگی میں ایسے واقعات تو نظر آتے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاد پہ اپنا گھر بار، بال بچّے اور مال و دولت چھوڑ دیتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی دکھائی دیتے

ہیں کہ کفار ان پر ظلم و ستم توڑ رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر تمہاری جگہ تمہارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں تو کیسا ہو؟ اور وہ تیغ ستم کا شکار ہوتے ہوتے کہتے ہیں کہ بخدا ہم تو یہ بھی گوارا نہیں کرتے کہ ہماری جنتوں کے مرکز صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک پھانس بھی چبھ جائے۔ اُحد کی جنگ میں مسلمانوں کی اپنی غلطی سے جیتی ہوئی جنگ کا پانسہ پلٹ جاتا ہے اور مسلمان کفار کے دو طرفہ نرغے میں آجاتے ہیں اور شور مچ جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں تو حضرت انس رضؓ کے چچا انس بن نضر رضؓ پکار اٹھتے ہیں، حضور ؐ کے بعد زندگی کا کیا مزا؟ پھر وہ گھمسان کے رن میں گھس جاتے ہیں اور لڑتے ہوئے شہید ہو جاتے ہیں۔ لڑائی کے بعد ان کی لاش دیکھتے ہیں تو اسّی سے زیادہ زخم ان کے جسم پر تھے۔ کوئی شخص پہچان نہیں سکتا۔ ان کی بہن انگلی دیکھ کر پہچانتی ہیں۔ اسی عالمِ اضطراب میں حضرت کعب رضؓ کی نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑ جاتی ہے، بلند آواز سے اہلِ ایمان کو مژدہ جانفزا سناتے ہیں، صحابہ حضور ؐ کے گرد و پیش حصار باندھ کر دشمن کے مقابلے میں سینہ سپر ہو جاتے ہیں۔ وہ بار بار ہجوم کر رہا ہے۔ محبین صادق پروانہ وار نثار ہو رہے ہیں۔ ایک بار اس کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ حضور ؐ فرماتے ہیں کون مجھ پر اپنی جان فدا کرتا ہے؟ سات انصاری لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں اور ایک ایک کر کے آپ پر نثار ہو جاتے ہیں۔ ابو دجانہ رضؓ آپ پر جھک کر سپر بن جاتے ہیں اور جو تیر آتے ہیں اپنی پیٹھ پر روکتے ہیں۔ حضرت طلحہ رضؓ چاروں طرف سے برستی ہوئی تلواروں کو ہاتھ پر روکتے ہیں تو ایک ہاتھ کٹ کر گر پڑتا ہے۔

یہ تو میدانِ جنگ میں جان نثاروں کا جذبۂ سرفروشی و حُبِّ رسول ؐ تھا۔ جنگ کے اس انجام کی خبر سن کر خواتین مدینے سے نکل آتی ہیں۔ ایک انصاری خاتون کو اطلاع ملتی ہے، اس کے باپ شہید ہو گئے ہیں۔ وہ جواب میں کہتی ہیں مجھے یہ بتاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو عافیت سے ہیں؟ بتانے والا اسے بتاتا ہے۔ تمہارے بھائی اور شوہر

بھی خلعتِ شہادت سے سرفراز ہو گئے ہیں۔ مگر وہ مومنہ صادقہ گھر کا گھر صاف ہونے کی خبر سن کر کسی قسم کا نالہ و شیون نہیں کرتی۔ پوچھتی ہے تو یہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس حال میں ہیں؟ لوگ بتاتے ہیں۔ آنحضور بخیریت ہیں۔ وہ خاتون آگے بڑھ کر چہرۂ انور پر نظر ڈالتی ہیں اور پکار اٹھتی ہیں: کل مصیبة بعدك جلل۔ آپ زندہ ہیں تو سب مصائب و آلام ہیچ ہیں ؎

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا

اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا ایک اور مظاہرہ بھی دیکھتے ہیں۔ منافقین کا سردار عبداللہ ابن اُبی تبوک کے غزوے میں کہتا ہے۔ ذرا مدینے پہنچ لیں، ہم باعزت لوگ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کریں گے۔ اس کے صاحب زادے عبداللہؓ جو ایمانِ صادق کی حلاوت سے آشنا تھے اور جانتے تھے کہ اس ایمان کا ابتدائی اور بنیادی تقاضا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو ماں باپ اور عزیز و اقارب سے مقدم سمجھنا ہے، مدینے پہنچ کر تلوار سونت لیتے اور راستے میں کھڑے ہو جاتے ہیں کہ عزت اللہ اور اس کے رسول کو سزاوار ہے اور میں اس ذلیل شخص کو مدینے میں داخل نہ ہونے دوں گا۔ یہاں عزت والے یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی ہی رہیں گے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہؓ سے فرماتے ہیں کہ اسے جانے دو تب وہ اپنے باپ کا راستہ چھوڑتے ہیں۔

یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مطہرہ سے اس محبت و عقیدت کی چند مثالیں ہیں جس سے صحابۂ کرام رض کی زندگی مزین تھی۔ یہ محبت و عقیدت اس ایمان کا تقاضا تھا جس کے بغیر اللہ پر ایمان اور اس سے محبت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اسی محبت و عقیدت سے توانائی حاصل کر کے صحابۂ کرام رض نے تاریخ انسانی کے دھارے کا رخ بدل ڈالا اور شاہراہِ حیات پر ایسے نقوشِ جمیل ثبت کیے جن کی تابانی آج بھی آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی
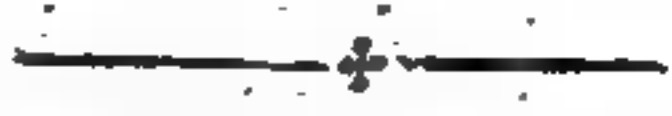
صحابہ کرامؓ اور ان کے متّبعین نے اپنی سیرت و کردار اور لہو سے عشق و جنون کی جو لازوال و بے مثال تاریخ مرتب کی ہے اس تاریخ میں کوئی ایسا ورق نظر نہیں آتا جس میں یہ لکھا ہو کہ یہ نفوسِ قدسیہ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا یومِ ولادت بھی مناتے تھے، اپنی بستیوں کو جھنڈیوں سے آراستہ و پیراستہ کرتے تھے، اپنے گھروں میں چراغاں کرتے تھے، جلوس نکالتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی شان میں قصائد پڑھتے اور باجوں تاشوں سے سڑکوں اور گلیوں میں ہنگامہ مچاتے ہوئے پورا دن رات گزار دیتے تھے۔[1] رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبت کا تقاضا تو یہ تھا کہ ہم اپنی زندگیوں کو حضورؐ کے

---

[1] یہی نہیں انہوں نے ان اہم واقعات کی یاد بھی کبھی نہیں منائی جو اُمّتِ مسلمہ کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتے تھے جسے وہ اپنے جذبہ عشقِ رسولؐ اور رگِ گردن کے لہو سے لکھ رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہجرت فرما کر مدینے تشریف لائے۔ اسلام کی تاریخ میں یہ پہلا نقطۂ تغیّر (TURNING POINT) تھا۔ اس عظیم الشان واقعے پر پورا مسلم یثرب استقبال کے لیے امڈ آیا، جوش و جذبات کا یہ عالم تھا کہ خواتین اور بچیاں چھتوں پر بیٹھی نگاہیں فرشِ راہ کیے استقبالیہ گیت گا رہی تھیں لیکن آنے والے برسوں میں صحابہ کرام رضؓ نے کبھی یومِ ہجرت نہ منایا۔ بدر کی جنگ کے لمحات تیرہ برس پہلے وجود میں آنے والی اُمّتِ مسلمہ کی زندگی کے فیصلہ کن لمحات تھے۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے جنگ کی رات بارگاہ الٰہی میں دعا کرتے ہوئے عرض کی تھی کہ تیرے یہ بندے شہید ہو گئے تو ان کے بعد تیرا نام لینے والا کوئی نہ رہے گا۔ ملّی زندگی کے اس نازک ترین مرحلے میں حاصل ہونے والی فتح پر بھی انہوں نے کبھی جشن نہ منایا۔ حضورِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے وصال کے سانحے نے صحابہ کبار رضؓ کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ (باقی اگلے صفحے پر)

اسوۂ حسنہ کے سانچے میں ڈھالنے، اللہ کی جانب سے آپ جو نظامِ زندگی لائے تھے اور جسے باقی سارے نظام ہائے زندگی پر غالب کرنے کی جدّوجہد میں آپ نے اپنی ساری زندگی گزار دی تھی اسے پہلے خود اپناتے اور پھر دنیا بھر میں غالب کرنے کی سعی و جہد کرتے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں زندگی کا جو منہاج، قانون اور احکام و ہدایات دی تھیں انہیں اپناتے اور جن امور سے روکا تھا ان سے رک جاتے، حضورؐ نے زندگی کے معاملات میں جو فیصلے صادر فرمائے ان کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتے اور اس راستے میں اپنے مال و جان، ماں باپ، بیوی بچوں، عزیز و اقارب، گھر بار اور کاروبار کسی شے کی محبت کو پاؤں کی زنجیر نہ بننے دیتے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو حضورؐ کی سُنّتِ مطہّرہ پر استوار کرتے، لیکن اس سب کچھ سے تو ہم گویا بے تعلق ہو چکے ہیں۔ ہم سال بھر انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیت سے زندگی کی اس راہ پر رواں دواں رہتے ہیں جس سے ہٹا کر راہِ راست پر چلانے کے لیے حضورؐ تشریف لائے تھے اور ایک دن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں مدحت سرائی اور مجالس میلاد بڑی شان و شوکت سے منعقد کر کے اور تزک و احتشام سے جلوس نکال کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ ہم نے حضورؐ کے ساتھ دعوائے عشق و محبت کا حق ادا کر دیا ہے۔ ع

شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم

عشقِ رسولؐ کے اظہار کا یہ بہت آسان اور سستا طریقہ صدیوں بعد تراشا گیا ہے۔ جب مسلمان فکری و سیاسی اعتبار سے زوال و انحطاط کی راہ پر گامزن ہو چکے تھے، جب مسلم حکمران اپنی خاندانی حکومتوں کا جوا ہمیشہ کے لیے مسلّط رکھنے اور اپنے غیر اسلامی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) لیکن خلافتِ راشدہ کے عہد میں کبھی اس حسرتناک دن کی یاد نہ منائی گئی +

اور غیر قانونی اعمال و کردار سے عامۃ المسلمین کی توجہ ہٹانے اور انہیں فروعی باتوں میں الجھائے رکھنے کے لیے گوناگوں تدبیریں کیا کرتے تھے، جب علم دین کا لبادہ اوڑھے ہوئے تن آسان اور دنیوی مفادات کے بندوں اور پیٹ پرستوں نے اقتدار اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی سرگرمیوں پر ٹوکنا اور معروف کے کاموں کا حکم دینا اور ان کی صحیح خطوط پر اخلاقی و دینی تربیت کرنا چھوڑ دیا تھا اور مسلمانوں پر اپنی بزرگی کا سکّہ برقرار رکھنے کے لیے ان کے پاس بجز اس کے اور کوئی چارہ نہ رہا تھا کہ وہ ان کے دینی جذبات سے کھیلتے ہوئے انہیں دین کے نام پر نئے نئے مشاغل میں مصروف کیے رکھیں۔ اس نظریۂ فکر نے جو خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ ان کا احاطہ ان سطور میں نہیں کیا جا سکتا، لیکن وہ ایسی خرابیاں نہیں ہیں جنہیں دینِ حق کے مزاج اور مطالبات کو سمجھنے والا کوئی صاحبِ عقل و بصیرت محسوس نہ کر سکے۔ سب سے بڑی خرابی جو پیدا ہو گئی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی فکری و عملی توانائیاں، ان کی دولت، ان کی جدّ و جہد، ان کا جوش و خروش، ان کی صلاحیتیں ایک ایسے کام پر صرف ہو رہی ہیں۔ جو اس مشن کے لیے ذرا بھی مفید نہیں ہے جس کی خاطر رسول اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے تھے ــــ مگر اس کی ذمّہ داری عام مسلمانوں پر عائد نہیں ہوتی۔ انہیں تو یہی بتایا گیا ہے کہ اسلام قبول کرنے اور رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبت کا تقاضا بس ایسی ہی باتوں سے پورا ہو جاتا ہے کہ مجالسِ میلاد منعقد کی جائیں اور ان میں حضورؐ کو حاضر ناظر سمجھ کر قیام کیا جائے اور جھوم جھوم کر یا نبی سلام علیک یا حبیب سلام علیک پڑھا جاتے، جلوس نکالے جائیں، نعتیں پڑھی جائیں اور چراغاں کیا جائے۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں جتنی بدعات، گمراہیاں، مشرکانہ رسوم، قبیح رواج اور غیر اسلامی اعمال و افعال پائے جاتے ہیں، انہوں نے اسلام ہی کے نام پر ان کے اندر راہ پائی ہے۔ مسلمان ان بدعات، مشرکانہ رسوم و عقائد میں صرف اس لیے مبتلا ہیں کہ علمائے سُوء نے انہیں یہی بتایا ہے کہ اسلام انہی کا نام ہے۔ وہ ان بدعات اور غیر اسلامی

اعمال کو حسن خلوص، جوش و خروش اور حُسنِ عقیدت سے انجام دیتے ہیں۔ اس سے بجائے خود ایک بڑا اہم سبق ملتا ہے۔ وہ یہ کہ اگر ان کے اس خلوص، جوش و خروش اور حُسنِ عقیدت کا رُخ صحیح راستے کی طرف موڑ دیا جائے تو اس سے ایک عظیم کام لیا جا سکتا ہے۔

میلاد النبیؐ کی تقریب ہی کو لیجئے۔ مسلمان عوام کس ذوق و شوق سے اس کو منانے کی تیّاریاں کرتے ہیں، کس خلوص اور حُسنِ عقیدت سے ان تیاریوں کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں، اس مقصد کے لیے کتنی جانفشانی سے جدّوجہد کرتے ہیں اس کے اہتمام و انصرام میں کس طرح دن رات ایک کر دیتے ہیں، کس فیاضی سے دولت خرچ کرتے ہیں، کس سرگرمی سے بازاروں کو سجاتے اور سڑکوں پر دروازے بناتے ہیں اور پھر کس جوش و خروش اور کن پاکیزہ جذبات و احساسات کے ساتھ جلوس نکالتے ہیں، اگر ان کے اس خلوص، حُسنِ عقیدت، جانفشانی، جدّوجہد، فیّاضی، سرگرمی، جوش و خروش اور پاکیزہ جذبات و احساسات کا رُخ موڑ کر اس مشن کی تکمیل میں لگا دیا جائے جس کے لیے حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوئے تھے، تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کتنا عظیم انقلاب اس دنیا میں رُونما ہو سکتا ہے۔

ہمارے عوام کے دلوں میں اسلام و ایمان رچا بسا ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی محبّت میں ان کے دل سرشار ہیں۔ وہ اس گئے گزرے دَور میں بھی اسلام اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نام پر کٹ مرنے کو اپنی بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ قوّت و عظمت کا یہ وہ منبع ہے جس سے دنیا کی کوئی دوسری ملّت بہرہ یاب نہیں لیکن قوّت و عظمت کے اس منبع سے پھوٹنے والے چشموں کا پانی رائیگاں جا رہا ہے۔ اس پانی سے اگر کشتِ ملّت کی ٹھیک طریقے سے آبیاری کی جائے تو یہ پھر اسی طرح سرسبز و شاداب ہو سکتی اور لہلہا سکتی ہے۔ جس طرح کہ قرنِ اوّل میں لہلہائی تھی۔ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا

سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْاَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (محمدؐ اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان و شفیق ہیں۔ آپ انہیں رکوع و سجود اور اللہ کے فضل اور خوشنودی کی طلب میں مصروف دیکھیں گے۔ سجدوں کے نشان ان کی پیشانیوں پر ہیں۔ یہ ہے ان کی صفت تورات میں اور انجیل میں۔ ان کی مثال بیان کی گئی ہے کہ گویا ایک کھیتی ہے جس نے پہلے کونپل لگائی۔ پھر اس کو تقویت دی۔ پھر وہ گدرائی، پھر اپنے تنے پر کھڑی ہو گئی۔ کاشت کرنے والوں کو وہ خوش کرتی ہے تاکہ کفار ان کے پھلنے پھولنے پر جلیں۔ جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور جنہوں نے نیک اعمال کیے ہیں اللہ نے ان سے مغفرت اور بڑے اجر کا وعدہ فرمایا ہے۔ (الفتح ۲۹)

مسلمانوں کی صلاحیتیں غلط راہوں سے موڑ کر جب بھی صحیح راستوں پر ان سے کام لیا گیا ہے ایک عظیم انقلاب معاشرہ میں رونما ہو گیا ہے۔ برصغیر میں اس کی بہترین مثال سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک میں ملتی ہے۔ سید شہیدؒ اور ان کے ساتھیوں کی جدوجہد سے لاکھوں مسلمانوں نے بدعات، گمراہیوں، مشرکانہ رسوم، قبیح رواجوں اور غیر اسلامی زندگی سے توبہ کر کے خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کا عہد کیا۔ اس طرح ان کا خلوص، حُسنِ عقیدت، جوش و خروش، سرگرمیاں اور دلچسپیاں جو پہلے غلط، بے نتیجہ اور مضر کاموں میں صرف ہو رہی تھیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے مشن کی تکمیل میں صرف ہونے لگیں۔ اب کیا عالم، کیا عامی، ہر شخص معروفات کو پھیلانے، منکرات کو مٹانے

اور اعلائے کلمۃ اللہ بلند کرنے کی جدوجہد میں لگ گیا۔ جس وقت یہ تحریک اٹھی ہے مسلمان معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی زوال کا بڑی تیزی سے شکار ہو رہے تھے۔ لیکن اس نے ان کے اس زوال کی تیز رفتاری کو روک دیا اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ایسے سرفروش پیدا کئے جنہوں نے اپنی شہ رگ کا خون دے کر گلشنِ اسلام پر چھائی ہوئی خزاں کو بہار میں بدلنے کی سعی و جہد کی۔ ان سرفروش مجاہدین کی داستانِ رنگیں سرحد کے کوہ و دشت سے انڈیمان کے جزائر تک پھیلی ہوئی ہے۔ چونکہ اس وقت برصغیر میں اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا اس لیے اس تحریک کو اپنی ساری توانائیاں اس اقتدار کو بحال کرنے میں صرف کرنی پڑیں۔ اور اللہ کو ابھی منظور نہ تھا کہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوتی۔ لیکن اس کے باوجود عام مسلمان معاشرے پر اس تحریک کے جو انقلابی اثرات مترتب ہوئے وہ کچھ کم نہ تھے۔ یہ تحریک جہاں جہاں پہنچی، شریعت کی پابندی، ایمان کی پختگی، اخوت، باہمی محبت و رافت، شرک و بدعت سے نفرت، صداقت شعاری، جفاکشی، تقویٰ، سادگی و تواضع، ایثار، خدمتِ خلق، غیرتِ دینی، شوقِ جہاد و شہادت، صبر و استقامت اور دوسری اسلامی اقدار کا دَور دورہ ہو گیا۔ بعد کے برسوں میں برصغیر کے مسلمانوں نے اپنے دین و تہذیب کو فرنگی تہذیب سے بچانے کی جتنی بھی جدوجہد کی وہ فی الحقیقت اسی تحریک کا پیدا کردہ ثمرہ تھی۔

کہنے کا مقصود یہ ہے کہ اس وقت اس تحریک نے مسلمانوں کے فکر و عمل میں جو عظیم انقلاب برپا کیا، اقتدار ہاتھوں میں نہ ہونے کی وجہ سے اس سے ملت کی اجتماعی زندگی کو اسلامی خطوط پر تعمیر نہ کیا جا سکا۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے اقتدار مسلمانوں کو واپس مل چکا ہے اور یہ اقتدار حاصل بھی اسی لیے کیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے اسلامی نظام حیات کو ملت کی انفرادی و اجتماعی زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اب مسلم عوام کی توانائیوں، صلاحیتوں اور ان کے دینی جذبات و احساسات کا رخ صحیح سمت موڑ کر ان سے بڑا عظیم الشان انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ (ترجمان ۱۹۵۹ء)

سعادتوں اور برکتوں کا مہینہ

ایک سال کی جدائی کے بعد رمضان کا مبارک و مقدس مہینہ پھر اپنے دامن میں رحمت و برکت اور مغفرت و کرم کا ابر لیے اہل ایمان کی بستیوں پر امڈ آیا ہے اور چھما چھم برس رہا ہے۔ کیا ہی سعادت مند ہیں وہ لوگ جو اس کے موتیوں سے اپنے دامانِ تہی کو بھر لیں گے اور کتنے ہی بدبخت ہیں وہ لوگ جن پر ابر رحمت و کرم امڈ امڈ کر برسے گا مگر وہ اس سے بے نیاز پورا مہینہ غفلت اور طغیان و عصیان میں گزار دیں گے اور انہیں کچھ بھی احساس نہ ہو گا کہ کتنا عظیم مہینہ، کس قدر بے پایاں رحمت لیے ان پر سایہ گستر ہوا تھا مگر انہوں نے اسے اپنی غفلت کیشی و سرمستی میں ضائع کر دیا۔ ربنا لا تجعلنا منھم ۔

یہ عظیم و بابرکت مہینہ ہر سال آتا ہے اور اللہ کے اطاعت شعار بندوں کو شاد کام کر کے تقویم حیات میں پناہ لینے چلا جاتا ہے۔ اس ماہ کی عظمت و فضیلت کا سبب یہ ہے کہ اسی میں اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی کی ہدایت کے لیے اپنی آخری کتاب ــــ قرآن کریم ــــ نازل فرمائی۔ اللہ کا یہ اتنا بڑا احسان ہے کہ انسان اس پر اس کی جتنی بھی شکر گزاری کرے کم ہے۔ یہ مہینہ اسی احسان کی شکر گزاری اور احسان مندی کا مہینہ ہے لیکن اس ماہ کی عظمت کو جس بات نے دو بالا اور اسے اسلامی زندگی میں اہم ترین مہینہ بنا دیا وہ یہ ہے کہ یہ مہینہ اہلِ ایمان کی تربیت کردار کے لیے مختص کر دیا گیا ہے۔

اس مہینے میں اہلِ ایمان اپنے روزمرہ کے معمول اور اپنی زندگی کی لگی بندھی روش چھوڑ کر اپنے شب و روز اس مقصد کی تیاری میں لگا دیتے ہیں جس کے لیے اللہ نے اپنی کتاب نازل فرمائی ہے اور وہ مقصد یہ ہے کہ قرآن کریم انسانی زندگی کے لیے جو نظامِ حیات دیتا ہے اور نوعِ انسان کو جس راہ پر چلانا چاہتا ہے، وہ خود بھی اپنی زندگی کو اس نظام کے سانچے میں ڈھالیں اور اس راہِ راست پر چلیں اور دنیا کو بھی اس راستے پر چلائیں اور اس نظام کے مطابق ان کی زندگیوں کو ڈھالیں۔

یہ اتنا عظیم الشان مقصد ہے کہ اسے پورا کرنے کے لیے اس کے علمبرداروں کے لیے عظیم سیرت و کردار کا حامل ہونا ازبس ضروری ہے اور اس کے بغیر وہ اس راہ پر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اس عظیم مقصد کو پورا کرنے کے لیے سب سے پہلی چیز جس کی ضرورت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی ہستی کا یقین پوری طرح جاگزین ہو۔ ان کا یہ ایمان ہو کہ جس ذاتِ باری نے انہیں اتنے عظیم مقصد کے لیے برپا کیا ہے وہ خود بھی بڑی عظیم ذات ہے، اس کی نظر کائنات کے ذرّے ذرّے پر ہے۔ ظواہر پر ہی نہیں پردوں کے پیچھے جو کچھ چھپا ہے اس پر بھی وہ نظر رکھتا ہے۔ وہ اپنے بندوں کے ظاہری اعمال ہی کو نہیں دیکھتا، ان کے دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔ کوئی چیز اس سے اوجھل نہیں۔ دن کا اجالا ہو یا رات کی تاریکیاں، انسان جو عمل بھی کرتا ہے اس کی اُسے خبر ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کی عظمت کا یہ تصور انسان کے دل میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ جس مقصدِ زندگی کو اس نے اپنایا ہے اس میں اسے مخلص ہونا چاہیے۔

زندگی کے نشیب و فراز میں اس کا ظاہر و باطن یکساں ہونا چاہیئے، منافقت، دو رنگی اور ظاہر فریبی سے اس کا کردار پاک ہونا چاہیئے، اس لیے کہ جس ذاتِ باری تعالیٰ کے حکم کی طاعت میں اس نے اس مقصدِ زندگی کو اختیار کیا ہے۔ اس پر اس کا ظاہر و باطن پوری طرح عیاں ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ اس مقصد کے ساتھ اس کا لگاؤ محض ظاہری ہے یا مخلصانہ، وہ جس راہِ راست پر چلنے کا مدعی ہے، اپنے دل کی گہرائیوں سے اس پر یقین رکھتا ہے یا نہیں اور یہ تصوّر و احساس یوں تو سبھی عبادات پیدا کرتی ہیں، سبھی اس مقصد کے لیے اہلِ ایمان کی سیرت و کردار کی تربیت کرتی اور انہیں تقویٰ کے اسلحہ سے لیس کرتی ہیں، تاہم روزہ یہ کارِ عظیم سب سے مؤثر طریقے سے انجام دیتا ہے۔ دوسری ساری عبادات ایسی ہیں جنہیں ادا کرتے ہوئے بہر حال ایک دنیا دیکھتی ہے لیکن روزہ واحد عبادت ہے جس کی کسی کو خبر نہیں ہو پاتی۔ ایک شخص بے روزہ رہ کر بھی اپنے آپ کو روزہ دار ظاہر کر سکتا ہے یا روزہ رکھ کر چوری چھپے کھا لے تو بھی کسی کو ہوا نہیں لگ سکتی۔ اس عبادت کو وہی شخص اس کے پورے تقاضوں کے ساتھ ادا کر سکتا ہے جس کے دل کی گہرائیوں میں یہ بات راسخ ہو چکی ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے اور اس کے ہر فعل و عمل پر ہر آن اس کی نظر ہے۔

اس عظیم مقصد کو پورا کرنے کے لیے دوسری چیز جس کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ اس مقصد کے علمبردار آخرت کی جوابدہی کا پورا پورا احساس رکھتے ہوں۔ ان کا یہ ایمان ہو کہ اس مقصد کو اپنا کر دین کی اصطلاح میں اللہ کی کتاب پر ایمان لا کر جو ذمہ داری انہوں نے قبول کی ہے اگر اسے پورا نہ کیا یا اس کی انجام دہی میں کوتاہی برتی تو ایک روز ایسا آئے گا کہ انہیں اپنی اس غفلت اور کوتاہی کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ اور روزہ، انسان میں جوابدہی کا یہ احساس بڑے مؤثر طریقے سے پیدا کرتا ہے۔ ایک شخص روزہ تنہا یوں

میں رہتے اور اندھیری کوٹھڑیوں میں چھپے ہوئے بھی اس لیے پورا کرتا ہے کہ اُسے ایک روز مرنا ہے اور اپنے اعمال کا حساب ایک ایسی ہستی کے سامنے دینا ہے جس سے کوئی چیز ڈھکی چھپی نہیں۔ جو خوب جانتا ہے کہ اس کے بندے نے روزہ رکھنے میں کوئی کوتاہی یا غفلت برتی ہے یا اُسے ٹھیک ٹھیک پورا کیا ہے۔

اس عظیم مقصد کو پورا کرنے کی راہ میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے ایک دنیا سے لڑائی مول لینا پڑتی ہے۔ تعلقات چھوڑنے پڑتے ہیں، زندگی کی آسائشیں اور دلچسپیاں تجنی پڑتی ہیں، مرغوب خواہشات کو دامن دل سے جھٹکنا پڑتا ہے، بھوک، افلاس کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں اور بسا اوقات جان تک سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ غرض اس مقصد تک پہنچنے کے لیے خارزاروں سے گزرنا ہوتا ہے۔ اتنی مشکلات و مصائب برداشت کرنا کچھ آسان نہیں۔ روزہ ان خارزاروں سے گزرنے اور مشکلات و مصائب کو برداشت کرنے کی صلاحیت و قوت بڑی خوبی سے انسان میں پیدا کرتا ہے۔ روزہ انسان کے نفس اور اس کی خواہشات کو اللہ تعالیٰ کے احکام کا مطیع بناتا ہے اور یہ نفس انسانی ہی ہے جس کی عیش کوشی اور یہ اس کی خواہشات ہی ہیں جن سے محبت انسان کو مشکلات و مصائب سے فرار کا خوگر بناتی ہے۔ روزہ انہی خواہشات پر ضرب لگاتا ہے۔ ناجائز اور ناپسندیدہ خواہشات تو بہر حال ناجائز اور ناپسندیدہ ہیں وہ انسان کی جائز اور ناگزیر خواہشات پر بھی ایک خاص مدت کے لیے قدغن لگا دیتا ہے۔ اس طرح انسان کو نہ صرف ناجائز خواہشات سے ہاتھ اٹھانے کا عادی بناتا ہے بلکہ اس کے اندر یہ جذبہ بھی پیدا کرتا ہے کہ اپنائے ہوئے مقصد زندگی (اسلام و ایمان) کی راہ میں اگر اسے اپنی جائز خواہشات اور ضروریات بھی قربان کرنا پڑیں تو وہ کسی تذبذب کے بغیر راضی خوشی کر دے گا۔ جو شخص اللہ کی خوشنودی

کے لیے ایک خاص وقت تک اپنے اوپر کھانا پینا، اپنی بیوی سے تعلّقات، جو عام حالات میں جائز اور حلال ہی نہیں، فریضے کی حیثیت رکھتے ہیں، اپنے اوپر حرام کرلیتا ہے اور جو شب و روز کا بڑا حصہ اپنے آقا و مالک کی رضا کی تلاش میں جاگتے اور رکوع و سجود میں بسر کرتا ہے اس سے لیقینا یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے بھوک پیاس سہہ لے گا، قرابت داروں کے تعلّقات اور ان سے محبّت اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بنیں گے، حق کی راہ میں آنے والی ہر مشکل اور مصیبت کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے گا اور اپنے اللہ کی راہ میں اپنے نفس پر ہر قسم کی تکلیف اٹھالے گا۔

اس مقصد کے علمبرداروں کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کی زندگیاں اخلاقی صفات سے مزیّن اور اخلاقی عیوب اور برائیوں سے پاک ہوں۔ وہ ایک دوسرے کے بہی خواہ، ہمدرد اور غم خوار ہوں، ایک دوسرے سے محبت کرتے ہوں۔ صفِ کارزار میں باہم دیگر معاون اور مددگار ہوں۔ صبر و توکّل ان کا سرمایۂ حیات ہو۔ فیّاض ہوں۔ صدق شعاری ان کا طرۂ امتیاز ہو، ان کی زندگیاں دنیا کے لیے امن کا پیغام ہوں، جھوٹ جو نفاق کی علامت ہے اس سے نفور ہوں۔ برائیوں سے خود بھی مجتنب ہوں اور دوسروں کو بھی باز رکھتے ہوں۔ فریب کاری اور فحش باتوں سے احتراز کرتے ہوں، آپس میں لڑتے جھگڑتے نہ ہوں۔ ان کا معاشرہ بڑے گناہ تو ایک طرف رہے، چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی پاک ہو۔ یہ ساری باتیں ماہِ رمضان کے روزے پیدا کرتے ہیں اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی بنا پر ماہِ رمضان کو عظیم اور بابرکت مہینہ قرار دیا گیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ شعبان کی آخری تاریخ کو جس کی عظمت و برکت کی خبر اہلِ ایمان کو ان الفاظ میں دی:

"اے لوگو! تم پر ایک بہت ہی عظیم اور بابرکت مہینہ سایہ گستر ہونے کو ہے۔ اس بابرکت مہینے کی ایک رات ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اللہ نے اس مہینے کے روزے تم پر فرض کیے ہیں اور رات کے قیام کو نفل قرار دیا ہے۔ جو شخص اس مہینے میں ایک نفل ادا کرے گا اسے فرض کے برابر ثواب ملے گا اور جو ایک فرض ادا کرے گا وہ دوسرے مہینوں کے ستّر فرضوں کے برابر ثواب پائے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا اجر جنّت ہے اور یہ مواساۃ کا مہینہ ہے ...... !"

جب اس بابرکت اور مقدّس مہینے کی آمد آمد ہوتی تو احادیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اس کا ایک ایک لمحہ عبادت وطاعت میں بسر کرنے کے لیے کمر کس لیتے، اہلِ ایمان کو اللہ کی رحمت وبرکت کے خزانوں سے اپنی جھولیاں بھرنے کی ترغیب دیتے اور اس کے ایک ایک پہلو کی اہمیّت اور اس کے نتائج واضح کر کے انہیں عمل پر اکساتے۔ فرماتے :

كُلُّ عمل ابن آدم يُضاعف الحسنة بعشر امثالها الى سبع مائة ضعف قال الله تعالىٰ ان الصوم فانه لى وانا اجزى به يدع شهوته وطعامه من اجلى (متفق عليه)

ابنِ آدم کو اس کی نیکیوں کا صلہ دس گنا سے سات سو گنا تک دیا جاتا ہے۔ لیکن روزہ دار بھوک، پیاس اور شہواتِ نفس سے مجاہدے کی جو مشقّت محض اپنے رب کی خوشنودی کے لیے کرتا ہے، اس کا بدلہ اللہ خود اپنے دستِ کرم سے جتنا چاہے عطا کرے گا۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے : فى الجنة ثمانية ابواب منها باب يسمى الريان لا يدخله الا الصائمون (متفق عليه) جنّت کے آٹھ دروازوں میں سے ایک باب الرّیّان صرف روزہ داروں کے لیے مخصوص کر دیا گیا

ہے۔کبھی فرماتے: للصائم فرحتان، فرحة عند فطرہ و فرحة عند لقاء ربه۔ روزہ دار دو مواقع پر پھولے نہیں سمائے گا: ایک روزہ افطار کرتے وقت اور دوسرے اپنے پروردگار سے ملاقات کے وقت۔کبھی ارشاد ہوتا:۔ لخلوف فم الصائم اطیب عند اللہ من ریح المسك۔ روزے دار کے مُنہ کی خوشبو اللہ کے ہاں کستوری کی خوشبو سے بہتر ہوتی ہے۔کبھی فرماتے: الصیام والقرآن یشفعان للعبد یقول الصیام ای رب انی منعتہ الطعام والشھوات بالنہار فشفعنی فیہ و یقول القرآن منعتہ النوم باللیل فشفعنی فیہ فیشفعان (البیہقی) روزہ اور قرآن پاک دونوں قیامت کے روز بندے کی شفاعت کریں گے۔ روزہ کہے گا الٰہی! میں نے اسے دن کے وقت کھانے پینے اور خواہشات سے روکے رکھا اس لیے میری سفارش قبول فرمائیے۔ چنانچہ اللہ اس سفارش کو شرفِ قبولیت بخشے گا کبھی ارشاد ہوتا: من صام رمضان ایمانا و احتسابا غفرلہ ما تقدم من ذنبہ (متفق علیہ) جس شخص نے رمضان کے روزے ایمان اور محض اللہ کی خوشنودی اور ثواب حاصل کرنے کی خاطر رکھے اللہ اس کے تمام سابقہ گناہ معاف کر دے گا۔کبھی ارشاد ہوتا۔ ما من عبد یصوم یوما فی سبیل اللہ الا باعد اللہ ذلك الیوم وجہہ عن النار سبعین خریفا (متفق علیہ) بندہ اللہ کے لیے روزہ رکھتا ہے تو اللہ اس کے چہرے کو آگ سے ستر برس کے فاصلے تک دُور کر دیتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترغیب و انذار کے ذریعے بھی اس مقدس مہینے کی اہمیت دلوں میں جاگزین کرتے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو منبر لانے کا حکم فرمایا۔منبر حاضر کیا گیا۔ آپؐ نے پہلی سیڑھی پر قدم مبارک رکھا تو فرمایا آمین۔ دوسری سیڑھی

پر قدم رکھا۔ تو فرمایا آمین۔ تیسری پر قدم رکھا تو فرمایا آمین۔ بعد میں صحابہ کرامؓ نے اس کا سبب دریافت کیا تو ارشاد فرمایا۔ کہ میرے پاس جبریلؑ آئے اور انہوں نے کہا جس نے رمضان المبارک کا مہینہ پایا اور اس نے اپنے گناہ نہ بخشوائے وہ ہلاک ہوا۔ اس پر میں نے آمین کہا۔ ایک مرتبہ ارشاد ہوا جو شخص رمضان کا ایک روزہ بلا عذر شرعی ترک کرتا ہے خواہ وہ زندگی بھر روزے رکھے، اس ایک روزے کا بدل نہیں ہو سکتا۔

ترغیب و ترہیب کا یہی وہ اہتمام تھا جس نے قرنِ اول کے مسلمان معاشرے کے ایک ایک فرد میں وہ ذوق و شوق پیدا کر دیا تھا کہ ہر شخص صوم و صلوٰۃ میں ایک دوسرے سے مسابقت کرتا تھا۔ نفلی روزے کثرت سے رکھے جاتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کو اعتدال و میانہ روی کی تلقین اور رہبانیت و اسلام کے درمیان فرق و امتیاز کی وضاحت فرمانا پڑتی۔ رہے ماہِ رمضان کے فرض روزے تو ان کا اہتمام اس شدّت سے ہوتا کہ جب مسلمان جنگِ بدر کو نکلے ہیں تو اس روز بھی سب روزے سے تھے اور حضورؐ سرورِ کائنات کو روزہ توڑ دینے کا حکم دینا پڑا۔ یہ اہتمام اور ذوق شوق مسلمانوں میں ہمیشہ برقرار رہا اور اسے انہوں نے معاشرے کی اسلامی زندگی کا طرۂ امتیاز سمجھا اس لیے کہ اسلام میں اور جتنی فرض عبادات ہیں وہ ظاہر و عیاں ہیں۔ نماز آپ پڑھیں گے تو جماعت کے ساتھ۔ زکوٰۃ دیں گے تو اس کی بھی خبر دوسروں کو ہو جائے گی اور حج کریں گے تو بھی ایک دنیا کو اس کا پتہ چل جائے گا۔ لیکن روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کا بندہ اور خدا کے سوا کسی کو علم نہیں ہو سکتا۔ اس فرض کی ادائیگی وہی شخص کرے گا جس کی رگ و پے میں ایمان سرایت کر چکا ہو جسے اللہ کے حاضر و ناظر ہونے کا پورا پورا الیقین ہو اور جس کو آخرت کی باز پرس اور جواب دہی کا احساس کامل ہو۔ اور یہی وہ تین امور ہیں جن پہ ایک معاشرے کی اسلامی زندگی کا دارومدار ہے۔ ایک مسلمان معاشرے میں اگر ایسے لوگوں کی کثرت ہے جن پر روزہ

فرض ہے لیکن وہ نہیں رکھتے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اس معاشرے کی اسلامی روح کمزور ہو گئی ہے۔ اور اگر وہ روزہ خوری کا کھلے عام مظاہرہ کرتے ہوئے نہیں شرماتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ روح موت سے ہم کنار ہو چکی ہے۔ چنانچہ مسلمانوں نے ہمیشہ اس مبارک مہینے کی حرمت و تقدیس کا اہتمام کیا ہے۔ اگرچہ اللہ نے بیماروں، مسافروں اور بعض خاص حالات میں) عورتوں کو روزہ قضا کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ مگر مسلمانوں نے رمضان کی حرمت کو یہاں تک ملحوظ رکھا کہ گھروں میں دن کے وقت چولھوں سے دھواں تک اٹھنا معیوب سمجھا جاتا، الّا یہ کہ کوئی اشد ضرورت آپڑتی ـــ اسی طرح مسافر بھی کھلے عام کھانے پینے سے اجتناب کرتے رہے ہیں مگر مادّیت پرستی جیسے جیسے ہمارے معاشرے میں نفوذ کرتی جارہی ہے اور دین سے لگن اور فرائض و عبادات سے انہماک میں کمی آتی جاتی ہے ہمارے معاشرے کی اسلامی روح کمزور پڑتی جارہی ہے۔ اب نہ اس مقدس مہینے کی وہ اہمیّت دلوں میں باقی ہے اور نہ وہ احترام ہی ملحوظ رکھا جاتا ہے جو امّتِ مسلمہ ہمیشہ اپنے دینی شعائر کے بارے میں ملحوظ رکھتی آئی ہے۔ ہماری زبان کی مشہور ضرب المثل ہے بیوی روزہ نہ رکھیں تو سحری بھی نہ کھائیں بالکل ہی کافر ہو جائیں۔ مطلب یہی ہے کہ اگر روزہ نہیں رکھا تو کیا اب دن کو کھلے عام کھا کر بالکل ہی کفر کا مظاہرہ کریں۔ لیکن اب یہ احساس بھی ختم ہوتا جارہا ہے۔ آپ نے اپنے محلّوں اور بستیوں میں دیکھا ہو گا کتنے ہی مسلمان گھروں میں سحری کے وقت موت کی سی خاموشی چھائی رہتی ہے اور جب دن چڑھ آتا ہے تو پکوان پکتے ہیں اور لذتِ کام و دہن کا سامان کیا جاتا ہے۔ رہے بازار تو وہاں ہوٹلوں اور ریسٹورانوں میں پردوں کے پیچھے ہی نہیں کھلے عام کھانے پینے اور سگریٹ کا دھواں اڑانے کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور کوئی اللہ کا بندہ نہ شرم محسوس کرتا ہے نہ غیرت کہ وہ جس امّت کا فرد ہے اس کا شعار کیا ہے اور جس کتاب اور رسولؐ پر ایمان لانے کا وہ مدّعی ہے اس کے احکام و فرامین کیا ہیں!

(۲۸ فروری ۱۹۶۱ء)

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں

یہ سطور ایسے وقت میں قلم بند کی جا رہی ہیں کہ ماہِ صیام کا آخری عشرہ جا رہا ہے جسے رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے عِتقٌ مِّنَ النَّارِ (دوزخ سے رہائی) کا عشرہ فرمایا ہے۔ اس عشرے کے اختتام پر غرّہ شوّال نمودار ہو گا تو یہ ماہِ مقدّس جو اپنے دامن میں رحمت و برکت اور جُود و مغفرت کا ابرِ بے پایاں لے کر آیا تھا، پھر ایک سال کے لیے زمانے کی تقویم میں پناہ لینے کے لیے رخصت ہو جائے گا اور یکم شوّال کا سورج طلوع ہو گا تو اہلِ ایمان کی بستیاں تہلیل و تکبیر کے نعروں سے گونج اٹھیں گی۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد ــــــــ اور مسلمان اظہارِ شکر و سپاس کے لیے صاف ستھرے لباس پہنے عیدگاہوں کی طرف نکل کھڑے ہوں گے۔ شکر و سپاس اس بات کا کہ اللہ نے انہیں اپنے آخری رسول محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ایمان لانے کی توفیق عطا فرمائی اور اس طرح اپنے اس قرآن کی حامل اُمّت میں کیا جو انسانیّت کی ہدایت اور راہنمائی کے لیے ماہِ رمضان میں اتارا گیا تھا۔ وہ قرآنِ عظیم جس کے پیش کردہ نظامِ حیات کے سانچے میں ڈھل کر ابنِ آدم مجد و شرفِ انسانیّت کی اعلیٰ ترین بلندیوں میں پرواز کر سکتا ہے، نیز شکر و سپاس اس بات کا کہ نزولِ قرآن کا یہ مبارک مقدّس مہینہ ایک بار پھر ان پر سایہ گستر ہوا۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ اِلّا اللہ و اللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد

عیدگاہوں کی طرف جاتے ہوئے اہلِ ایمان کے قلب و دماغ اپنے آقا و مولا کی کرم نوازیوں سے سرشار اور حسرت و مسرّت سے معمور ہوں گے۔ حسرت اس بات پر کہ حق کے جلووں سے منور وہ شب و روز رخصت ہو گئے جو خیر و برکت کا سامان اپنے دامن میں لیے ہوئے تھے، جن کا ایک ایک لمحہ زندگی بخش اور جانفزا تھا، جب بندگانِ خدا نے اپنی راحت و آرام، کام و دہن کی لذّت یابی، خوابِ شیریں اور لذاتِ نفس سے کنارہ کش ہو کر اپنے آپ کو اس مقدّس مہینے کے تقاضے کو پورا کرنے اور اپنے آقا و مولا کے ابرِ کرم کے لٹتے ہوئے گوہر اپنے دامن تہی میں بھرنے کے لیے وقف کر دیا تھا۔

وہ راتوں کا قیام اور رکوع و سجود، وہ سحر خیزی اور اپنے رب کے عطا کردہ رزق سے پیٹ بھر کر عبادتِ الٰہی و تلاوتِ قرآن، وہ دن بھر کی بھوک پیاس اور سلامت روی اور اعتدال کی زندگی۔ وہ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃِ، حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کی ندا بلند ہوتے ہی بارگاہِ خداوندی میں حاضری، وہ شام کے وقت افطاری کا ذوق و شوق سے انتظار اور جسم کو قوتِ لایموت بہم پہنچا کر اگلے روزے کے لیے تازہ دم ہو جانے کی تیاری، وہ فضا میں اللہ اکبر کی صدا بلند کرتے ہوئے یہ اعلان کہ طاعت و آزمائش کا ایک دن بیت گیا۔ مہینے بھر کے ایک ایک مبارک لمحے کی ان لذت بخشیوں کی یاد کے ساتھ ساتھ اس احساس نے انہیں رنجور و غمگین بنا رکھا ہے کہ خدا جانے یہ بابرکت لمحے زندگی میں پھر آ سکیں گے یا نہیں۔ کتنے ہی عزیز و اقارب، دوست احباب اور شناسا تھے جو پارسال ان کے ساتھ اس جشنِ شکر و سپاس منانے میں شریک تھے اور آج وہ ان کی صفوں سے غائب شہرِ خموشاں میں منوں مٹی تلے دبے روزِ حشر کا انتظار کر رہے ہیں، شب و روز کی گردش اور ماہ و سال کی آمد و رفت اب ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں

رکھتی، وہ اپنا عمل اپنے ساتھ لے جا چکے، اب اس دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا اور کیا خبر کہ آج جو ان کی صفوں میں موجود ہیں، آنے والا سال انہیں موجود نہ پائے۔ کون جانتا ہے کتنے لوگ اس وقت تک شہرِ خموشاں کے مکین بن چکے ہوں گے۔

اور مسرت ہے تو اس بات کی کہ اللہ نے انہیں خیر و نیکی کے ان لمحات سے بہرہ اندوز ہونے کی توفیق بخشی، وہ اپنے مولا کے ابرِ کرم سے جی بھر کے سیراب ہوئے، اطاعت و عبودیت کے ارمان توفیقِ الٰہی کی حد تک پورے کیے۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد

فی الحقیقت عید الفطر اگر مسرت و شادمانی کا دن ہے تو انہی خوش بخت بندگانِ حق کے لیے جنہوں نے اس مقدس و بابرکت مہینے کے مطالبات ٹھیک ٹھیک پورے کیے اور اپنی زندگی کو طاعت و تقویٰ سے سنوارا، انہی کو زیب دیتا ہے کہ وہ گھروں سے نکل کر کھلے میدانوں اور مسجدوں میں اپنے خالق و پروردگار کی بارگاہ میں شکر و سپاس کے لیے سجدہ ریز ہوں اور دعا کریں کہ وہ ان کی شب و روز کی مشقت قبول فرمائے، اگر بشریت کے تقاضے سے کوئی نقص اور کوتاہی ان کے عمل میں رہ گئی ہے تو اس سے درگزر فرمائے اور اپنی بارگاہ سے مردود و نامراد نہ لوٹائے۔

باقی رہے وہ حرماں نصیب جنہوں نے اس مقدس ماہ کے شب و روز زندگی کے عام ہنجار کی مانند غفلت و نافرمانی اور طغیان و سرکشی میں گزار دیے۔ رحمتِ حق کا دریا بہہ رہا تھا اور وہ اس سے محروم تشنہ کام کھڑے رہے، از وقتی طور پر سیراب ہوئے نہ دوسری زندگی کے لیے ذخیرہ کیا۔ اللہ کا ابرِ کرم چھاجوں برس رہا تھا اور وہ اس سے بے نیاز دامن نہی لیے اپنی غفلت شعاریوں میں ڈوبے رہے، مگر صبحِ عید طلوع ہوتے ہی زرق برق لباس پہن کر شاداں و فرحاں عیدگاہوں کی طرف نکل کھڑے ہوتے ہیں کاش انہیں احساسِ زیاں ہوتا تو مسرت میں ڈوبنے کی بجائے حسرت و پشیمانی کے سمندر میں

غرق ہو جاتے۔ نعرہ ہائے شادمانی بلند کرنے کے بجائے روتے اور صفِ نوحہ و ماتم بچھا کر ان کی غفلت کوشی نے انہیں کتنی بڑی سعادت سے محروم کر ڈالا۔ تبریک و تہنیت کے بجائے وہ ایک دوسرے کو تعزیت کا پیغام دیتے کہ ماہِ عظیم حیاتِ ابدی کا پیغام لے کر ان پر سایہ فگن ہوا اور انہوں نے برکت و سعادت کی اس زندگی کو ٹھکرا دیا۔

اسلام میں تہوار دو ہی ہیں۔ ایک عید الفطر اور دوسرا عید الاضحیٰ اور یہ دونوں تہوار نہایت سادہ ہیں۔ تہوار کا جو تصوّر دوسری قوموں اور مذہبوں میں پایا جاتا ہے، اسلام کے ان تہواروں کا تصوّر اس سے یکسر مختلف ہے۔ دوسری قوموں کے تہوار اپنے دامن میں اول تو کوئی مقصد ہی نہیں رکھتے، زیادہ تر وہ کسی مذہبی بزرگ یا قومی ہیرو کو خراجِ تحسین ادا کرنے کا مظہر ہوتے ہیں اور اگر کوئی مقصد ہوتا بھی ہے تو جس انداز کے ساتھ یہ تہوار منائے جاتے ہیں، اس میں یہ مقصد غتر بود ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ ان تہواروں سے کوئی سرمایۂ زندگی حاصل کرنے کے بجائے اُلٹا اپنے دامن میں اخلاق و کردار کی جو پونجی ہوتی ہے، اسے بھی غرقِ مئے عشرت کر ڈالتے ہیں۔ یہ تہوار باجوں تاشوں، دھوم دھڑکوں، میلوں ٹھیلوں اور رندانہ محفلوں سے عبارت ہوتے ہیں اور ان باتوں کی اسلام میں کیسے گنجائش ہو سکتی ہے، جب کہ اس کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ انسان کو لاابالی پن، کجروی اور غفلت کی زندگی سے نکالے اور ایک ذمّہ دار، راست رو، پاکیزہ، باوقار اور باشعور زندگی بسر کرنے کا ڈھنگ سکھائے۔ وہ عبادات سے لے کر تہذیب و تمدّن اور معیشت و سیاست تک چلنے کے اصول دیتا ہے وہ سب کے سب نہایت سادہ، انسان میں احساسِ ذمہ داری پیدا کرنے اور امن و سلامتی اور وقار و شعور کی زندگی سے ہم کنار کرنے والے ہیں۔

یہی حال اسلام کے تہواروں کا ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اور صحابۂ کرام

رضوان اللہ علیہم اجمعین، جس طریقے سے عید اور بقرعید کے تہوار منایا کرتے تھے ان کا ذکر احادیث اور تاریخ کی کتابوں میں ملتا ہے۔ ان کو پڑھیئے وہ شور و شغب سے پاک دھوم دھڑکوں سے خالی اور غفلت و نفس پرستی کا شکار بنانے والے اعمال و اشغال سے قطعاً پاک ہوتے تھے جس وقار اور سادگی، اعتدال، اللہ سے لو، احکام الٰہی کی والہانہ اطاعت، رفق و عاطفت، اخوت و مؤانست اور حق کے ذوق و شوق سے ان مقدس اور بزرگ ہستیوں کی زندگی عبارت تھی، وہی ان تہواروں کا طغرائے امتیاز تھا۔

وجہ ظاہر ہے یہ دونوں ایک ہی تعلیم کا حاصل تھے۔ یہ تہوار اللہ کی کبریائی، دین حق کی صداقت اور اُمتِ مُسلمہ کی عظمت و رفعت کا مظہر ہوتے مسلمان علی الصباح نہاتے یا صاف ستھرے کپڑے زیب تن کر کے نکلتے۔ ان کے راستے اللہ کی حمد و ثنا اور تحمید و تقدیس کے نغموں سے گونج اُٹھتے۔ عید گاہ میں بوڑھے، جوان، عورتیں، بچے صف در صف کھڑے ہو کر اپنے رب کی بارگاہ میں جُھک جاتے۔ دوگانہ ادا کرنے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دیتے جس میں مسلمانوں پر ان کے مقصدِ زندگی، شہادتِ حق کی اہمیت واضح کرتے اور انہیں انفاق فی سبیل اللہ پر اُبھارتے۔ خطبہ ختم ہو چکتا تو عید الاضحی ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور بہت سے صحابہ رض وہیں قربانی کرتے اور عید الفطر ہوتی تو تہلیل و تکبیر کے نغمے بلند کرتے ہوئے راستہ بدل کر اپنے گھروں کو چلے جاتے۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد

ان تہواروں پر وہ بھی کھاتے پیتے اور کام و دہن کو لذت بخشنے کا سامان کرتے، مگر ان کی اس سامان آرائی کا مقصد محض شکم پری نہ ہوتا اور نہ وہ اسراف سے کام لیتے، بلکہ ان کے اس کھانے پینے میں بھی احسان مندی اور شکر گزاری کا جذبہ کارفرما ہوتا۔ پھر وہ اپنے پیٹ کی فکر سے پہلے اپنے معاشی اعتبار سے کمزور بھائیوں کی فکر کرتے تھے

عید الفطر ہوتی تو نماز عید کو نکلنے سے پہلے فطرانہ کی صورت میں اپنے ان بھائیوں کو عید کی مسرتوں میں شریک کرتے تھے اور عید الاضحیٰ ہوتی تو قربانی کا ایک تہائی گوشت ان کا ہوتا تھا۔ ان مواقع پر وہ تفریحات سے بھی دل بہلاتے لیکن ان کی تفریحات لہو و لعب سے پاک ہوتیں اور انہیں اپنے مقصدِ زندگی سے غافل کرنے کے بجائے اسے پورا کرنے کے قابل بناتیں۔

عید، بقر عید کے تہوار آج ہم بھی ہر سال مناتے ہیں مگر وہ اس روح سے یکسر تہی دامن ہوتے ہیں۔ جو اسلام میں مطلوب و مقصود ہے اور جس کی مکمل جھلک ہمیں قرنِ اول میں دکھائی دیتی ہے۔ ہمارے ان تہواروں میں بجز دو رکعت نماز اور فطرانہ و قربانی کے اور کوئی شے اس عیدِ باسعادت سے مماثلت نہیں رکھتی اور یہ مماثلت بھی ظاہری ہے۔ وہ وقار اور سادگی جو ان تقریبات کا طرۂ امتیاز تھا اب ختم ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ باجوں، تاشوں، رقص و سرود، لہو و لعب اور غیر اخلاقی و غیر اسلامی مشاغل نے لے لی ہے اور ان پر کفار کے تہواروں کا سا رنگ چڑھ گیا ہے۔ دوگانے کی ادائیگی کا اہتمام ہر جگہ ایک محدود طبقہ کرتا ہے، باقی طبقات و عناصر ان مقدس تہواروں کو بالکل عام تہواروں کے انداز میں گزارتے ہیں۔ اس طرح وہ تہوار جو اپنے دامن میں مسلمانوں کے لیے زندگی کا پیغام رکھتے ہیں۔ ایک ایسی فضا میں گزر جاتے ہیں جو ان کی اسلامی روح کے لیے تباہ کن ہوتی ہے۔ اے اللہ کے بندو! ان مقدس دنوں کی عظمت و اہمیت کو پہچانو اور انہیں غیر مسلموں کے تہواروں کی صف میں نہ لا کھڑا کرو۔

اللہ اکبر اللہ اکبر لا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر و للہ الحمد۔

(مارچ ۱۹۶۱ء)

عہدِ طاعت و وفا

عیدالاضحیٰ کے دن ہر وہ شخص جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان اور مالی استطاعت رکھتا ہے، اللہ کی راہ میں بھیڑ، بکری، اونٹ، گائے اور دنبے میں سے کسی جانور کی قربانی دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ ہر سال قربانی ادا فرماتے رہے۔ اصحابِ رسول رضوان اللہ علیہم اجمعین، جنہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ حق و ہدایت میں تربیت پائی تھی اور جو آپؐ کے اُسوۂ حسنہ کی اتّباعِ کامل کو ایمان کا لازمی تقاضا سمجھتے تھے، قربانی دیتے رہے۔ حضرت عبداللہ ابنِ عمرؓ سے کسی نے دریافت کیا "کیا قربانی فرض ہے؟" آپ نے جواب میں فرمایا: ضَحّٰی رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَالْمُسْلِمُوْنَ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان قربانی دیتے آئے ہیں اُمّتِ مسلمہ کو برپا ہوئے چودہ سو سال ہونے کو ہیں، وہ دن ہے اور آج کا دن، پوری اُمّت کا اس پر تعامل رہا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل، صحابہ کرامؓ اور پوری اُمّت کا متفق علیہ تعامل قربانی کی اہمیّت اور نظامِ دین میں اس کے مقامِ بلند و عظیم کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ اہمیّت اور مقامِ عظمت اپنا ایک پس منظر رکھتے ہیں اور ان کے پیچھے باقاعدہ ایک دینی فلسفہ کارفرما ہے۔

زید بن ارقم رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا۔ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ مَا ھٰذِہٖ الْاَضَاحِیَ۔ اے اللہ کے رسول! یہ قربانیاں کس نوعیت کی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا سُنَّۃُ اَبِیْکُمْ اِبْرَاھِیْمَ۔ یہ تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سُنّت ہیں۔ اس مختصر سے سہ لفظی جملے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے وہ سارا پس منظر اور فلسفہ بیان کر دیا ہے جو قربانی اپنے دامن میں رکھتی ہے۔ ابراہیم علیہ السّلام ایک اولوا العزم پیغمبر، مُسلم حنیف، اللہ کے محبوب اور فرماں بردار بندے، اخلاقِ حسنہ کے پتلے، صبر و عزیمت کے پہاڑ، مُوحّد اور دینِ خالص کے علمبردار تھے۔ آپ ساری دنیا سے کٹ کر خالصتاً خدائے واحد کے ہو رہے تھے۔ آپ کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ اللہ نے آپ کی ایک اکیلی شخصیت کو پوری امّت کے ہم پلّہ قرار دیا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں بھی آپ کا ذکر اللہ نے کیا ہے، بڑے پیارے انداز اور با عظمت پیرائے میں کیا ہے۔ آپ کی ساری زندگی کفر و شرک، ضلالت اور خداوندانِ باطل کے خلاف جدوجہد اور اللہ کی طاعت و فرماں برداری کا مرقّع تھی۔ کسی مقصد کی سعی و جہد اور کسی نصب العین تک پہنچنے میں جن ابتلاؤں اور آزمائشوں سے سابقہ پڑ سکتا ہے ابراہیم علیہ السلام ان سب آزمائشوں اور ابتلاؤں سے دوچار ہوتے اور ان میں پورے اترے دنیا کا کوئی رشتہ اور تعلّق، کسی شے کی محبّت یا خوف زنجیرِ پا نہ بن سکا۔

انسان کسی مقصد کو اپناتا ہے تو اس کا گرد و پیش اور ہر وہ ادارہ اس کی راہ میں مزاحم ہوتا ہے جس کو اپنے کسی مفاد پر ضرب پڑنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ سب سے پہلے اس کا خاندان اس کے آڑے آتا ہے۔ اس کے ماں باپ اور خویش و اقارب خاندان کی مصلحتوں اور مفادات کے نام پر اسے اس مقصد سے باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اگر وہ ان کی پند و نصیحت پر کان نہیں دھرتا اور خاندان کی مصلحتوں اور مفادات پر اس مقصد کو قربان کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا تو اہلِ خاندان اس کے دشمن ہو جاتے ہیں اور اس سے اپنے تعلّقات منقطع کر لیتے ہیں۔ پھر وہ معاشرہ مزاحم ہوتا ہے جس کی گود میں وہ آنکھیں کھولتا اور پروان چڑھتا ہے۔ پھر معاشرے اور ملک پر چھایا ہوا اقتدار اس کی مزاحمت کرتا ہے۔ اگرچہ اوّل الذکر مخالفتیں بھی کچھ کم شدید نہیں ہوتیں، لیکن اقتدار کی مزاحمت زیادہ شدید اور پُرخطر ہوتی ہے۔ بسا اوقات دار و رسن تک کا مرحلہ پیش آجاتا ہے۔ ان خارجی مزاحمتوں اور مخالفتوں کے علاوہ خود انسان کا نفس اور اس کی فطرت میں گندھے ہوئے جذبات و احساسات قدم قدم پر دامن گیر ہوتے ہیں۔ بسا اوقات ماں باپ اور بیوی بچّوں کی محبّت اس کے پاؤں کی زنجیر بن جاتی ہے، بعض اوقات قوم، گھر بار اور وطن کی اُلفت اس کے عزائم اور ارادوں کو ڈگمگا دیتی ہے۔

سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام ایک انسان ہی تو تھے، لیکن وہ اپنے مقصد کی دُھن میں نہ خارجی مزاحمتوں کو خاطر میں لائے نہ انھوں نے ان جذبات و عواطف اور علائق کی پروا کی جو انسانی فطرت کا خاصّہ ہوتے ہیں۔ اللہ نے ان کو فطرتِ سلیم بخشی تھی۔ جب وہ شعورِ حق کی دولت سے بہرہ مند ہوئے سب سے کٹ کر خدائے واحد کی بارگاہِ عظیم میں جھک گئے اور اللہ کے لیے اپنے دین کو خالص کر کے اپنے باپ، قوم اور اقتدارِ وقت کو پکار کر کہہ دیا: اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (الانعام ۷۹) تو ان کے خاندان، معاشرے کے استحقاق یافتہ طبقات اور حکومتِ وقت نے فوراً بھانپ لیا کہ ان کے اس اعلان کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے، چنانچہ ان سب نے ان کے ساتھ کشمکش چھیڑ دی۔ ان کے باپ آزر نے جو ملک کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا تھا اور جسے ملک میں شاہی خاندان کے بعد عظمت و تقدّس کا سب سے اونچا مقام حاصل تھا ان سے

صاف صاف کہہ دیا۔ کہ تم نے اپنے باپ دادا کے دین سے اعراض کی روش ترک نہ کی تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا اور تمہارے ساتھ اپنے تعلقات منقطع کر لوں گا۔ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ط (مریم - ۴۶) ابراہیم علیہ السلام نے اس تہدید کے جواب میں راہِ حق و ہدایت کو چھوڑنے اور اپنی دعوت کو تج دینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ پدرِ بزرگوار! آپ اس شرط پہ مجھے شفقتِ پدری سے محروم کرنا چاہتے ہیں تو پھر میرا بھی آپ کو سلام ہے آپ کی راہ اور ہے اور میری راہ اور۔ آپ مجھے چھوڑتے ہیں تو میں بھی آپ کو اور اس چیز کو چھوڑتا ہوں جس کو آپ اپنی دعاؤں اور تمناؤں اور آرزوؤں کو بر لانے والا مرکز قرار دیتے ہیں۔ البتہ میں اپنے مہربان پروردگار سے آپ کے حق میں دعائے مغفرت طلب کرتا رہوں گا۔

سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّیْ (مریم ۴۷ - ۴۸)

دین و مذہب، معاشرت و تمدن اور ملک و حکومت کے متعلق آپ کے نظریات قوم میں پھیلے تو وہ بھی آپ سے برسرِ پیکار ہو گئی۔ وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ (الانعام - ۸۰)

معبد میں بتوں کی توڑ پھوڑ کے واقعے نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ گرفتار کر کے بادشاہِ وقت کے سامنے حاضر کیے گیے جو اپنی ربوبیت اور خدائی کا دعویدار تھا اور کہتا تھا کہ وہ مالک الملک ہے، ملک کے باشندے اس کے بندے ہیں، وہ ان کی قسمتوں کا مالک ہے، اس کا فرمان ان کے لیئے قانون ہے، وہ جس بات کو معروف قرار دے گا اسے معروف سمجھا جائے گا اور جسے منکر قرار دے گا اسے منکر تسلیم کیا جائے گا۔ اس کی ذات اجتماع و تمدن کی واحد بنیاد اور اس کا اقتدار ان کی وحدت و جمعیت اور دین و عقائد کا سرچشمہ ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کا تصورِ حیات اور نظریۂ اجتماع و تمدن اور اس کی ضرب کا ہدف پہلے ہی یہ سارے امور اہلِ نظر سے مخفی نہ

تھے، بادشاہ سے ان کی جو بات چیت ہوئی اس کے آئینے میں اسے اپنے اقتدار کا سنگھاسن ڈولتا نظر آیا۔ اس نے پہلے کہ ایسا خطرناک نظریہ ذہنوں میں جڑ پکڑے اس نے آپ کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا فیصلہ کر لیا اور موت کا طریقہ بھی ایسا سنگین تجویز کیا جس سے ایک دنیا عبرت پکڑے کہ اقتدار اور سماج کے باغیوں کا انجام کیا ہوتا ہے۔ حکم ہوا کہ انہیں آگ میں ڈال دیا جائے۔ ابراہیم علیہ السّلام نے اس فیصلے کو خندہ پیشانی سے سُنا اور اپنے اللہ کا حکم بلند رکھنے کی خاطر بے خوف و خطر آگ میں کود گئے۔

بے خطر کُود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اپنے بندے کے عشق و محبّت اور استقامت و توکل کا یہ مظاہرہ دیکھ کر اللہ تعالیٰ کی نصرت حرکت میں آئی، دہکتی ہوئی آگ چمن زار میں تبدیل ہو گئی اور ابراہیم علیہ السّلام کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَّسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ (الانبیاء - ۶۹) اللہ کی راہ میں یہ دوسری آزمائش تھی جس میں سیّدنا ابراہیم علیہ السّلام پورے اُترے۔

تیسری آزمائش وطن کو خیرباد کہنے اور غربت کی زندگی کی صورت میں سامنے آئی۔ اپنے وطن کی سرزمین کو دعوتِ حق کے بیج کے لیے بنجر اور ناساز گار پا کر آپ زرخیز زمین کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ مدّتوں بادیہ پیمائی کرتے رہے حتیٰ کہ اسی تگ و دو میں جوانی رخصت ہو گئی اور بڑھاپے نے آلیا۔ آخر کار شام آئے اور وہیں ڈیرے ڈال لیے۔ یہیں شب و روز کی تمنّاؤں اور سالہا سال کی دعائے نیم شبی کا حاصل اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے۔ اور ابراہیمؑ اس خیال سے پھولے نہ سماتے کہ جس دعوتِ حق کے لیے وہ زندگی بھر مصائب اور صعوبتوں سے دوچار رہے اس کے جاری رہنے کی اُمید پیدا ہو گئی۔ لیکن ابھی ابتلاء کی بھٹی سے گزر کر سونے کو اپنے زرِ خالص ہونے کا مزید ثبوت مہیّا کرنا باقی تھا۔ حکم ہوا کہ اس بچے کو اس کی ماں سمیت وادیٔ غیر ذی زرع میں چھوڑ آؤ۔ اللہ کا فرمانبردار

بندہ حکم کی تعمیل میں اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی زندگی کی رفیق اور ننھے منھے بچے کو ایک ایسی بے آب وگیاہ وادی میں چھوڑ آئے جہاں زندہ رہنے کا بظاہر کوئی سامان نظر نہ آتا تھا۔ کالے کوسوں تک آبادی کا نشان تھا نہ پانی، نہ گرمی سردی کی سختیوں اور جنگلی وحوش سے بچنے کے لیے سر چھپانے کی کوئی جگہ اور پناہ تھی۔

ابراہیم علیہ السّلام ایک مدّت کے بعد وہاں پہنچے تو اس وادیٔ غیر ذی زرع میں ایک بستی آباد ہو چکی تھی۔ بچہّ چلنے پھرنے اور ماں باپ کے چھوٹے موٹے کام کاج میں ہاتھ بٹانے کے قابل ہو چکا تھا۔ اب سخت ترین آزمائش کا وقت آن پہنچا تھا۔ انسان اپنے خویش واقارب سے محرومی گوارا کر لیتا ہے، لوگوں کے ہاتھوں اذیّتیں سہہ لیتا ہے، قیدو بند کی صعوبتیں برداشت کر لیتا ہے، پھانسی پر جھول جاتا ہے، گھر بار اور وطن بھی چھوڑ دیتا ہے اور اپنے بیوی بچّوں کی جدائی بھی انگیز کر لیتا ہے مگر کیا کوئی باپ اپنے بڑھاپے کے سہارے، زندگی کی متاع، آنکھوں کے نور، جگر کے ٹکڑے اور اُمیدوں اور تمنّاؤں کے پیکر کے گلے پر چھری چلانے پر بھی آمادہ ہو سکتا ہے؟ ابراہیم علیہ السّلام نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ فی الحقیقت ساری دُنیا سے کٹ کر اللہ کے ہو چکے ہیں اور اللہ کی اطاعت و فرماں برداری سے نہ کسی دشمن اور جابر قوّت کا خوف انہیں روک سکتا ہے نہ کسی محبوب ہستی کی محبت زنجیرِ پا بن سکتی ہے۔ باپ نے سعادت مند اور صبر و رضا کے پیکر بیٹے کو اللہ کے حکم سے آگاہ کیا تو اس نے بے چُون وچرا گردنِ اطاعت خم کر دی۔ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ۔ اور پھر چشمِ فلک نے عجیب نظارہ دیکھا۔ مکّہ کی بستی سے دُور مِنیٰ کے میدان میں خدا کا سن رسیدہ پیغمبر ابراہیم علیہ السّلام اپنے لختِ جگر کو اوندھے منہ لٹا کر اس کی گردن پر چھری چلا رہا تھا۔ فرشتے آسمانوں پر حیران کھڑے اطاعت گزاری کے اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے آدمؑ کی تخلیق پر اللہ سے کہا تھا: اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا وَ

وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ (کیا تو ایسی ہستی کو پیدا کرنا چاہتا ہے جو زمین میں فساد پھیلائے گی اور خون ریزی کرے گی) تو اللہ نے جواب دیا تھا: اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (میں خوب جانتا ہوں کہ یہ ہستی کس قسم کی ہوگی!) ان پر اس کنائے کی شرح واضح ہو رہی تھی آج ان پر آدم کا وہ مقامِ بلند آشکارا ہو رہا تھا جس کا تصور وہ اس کی تخلیق کے وقت نہ کر پائے تھے۔ زمین و آسمان کی گردش تھم گئی تھی۔ چھری اپنا کام نہ کر پائی تھی کہ بارگاہِ حق سے ندا آئی بس اے ابراہیمؑ! بس، تم نے اپنا خواب سچا کر دکھایا۔ وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ (الصافات ۱۰۴ - ۱۰۶) فدیے میں دُنبہ ذبح کر دیا گیا۔ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۔ آزمائش کی اس بھٹّی میں کندن ثابت ہونے کے بعد آپ کو امامتِ عالم کے منصب پر فائز کر دیا گیا۔ انہوں نے اپنے جگر گوشے اسمٰعیل علیہ السلام کے ساتھ مل کر خدا کے جس گھر کی نیو ڈالی اسے دنیا بھر کے حق پرستوں کا مرکز قرار دے دیا گیا۔ ان کی وفا شعاریوں اور اطاعت گزاریوں کو ملّتِ ابراہیمؑ میں رائج کر دیا گیا۔ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو کسی مُستفسر کے جواب میں فرمایا تھا یہ قربانیاں تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہیں تو یہی اس اُولوالعزم پیغمبر کا وہ کردار ہے جس کی یاد کو دل و دماغ کی گہرائیوں میں زندہ و تابندہ رکھنے کے لیے اُمّتِ مسلمہ ہر سال عیدِ قربان مناتی ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی زندگی، روشنی کا ایک بلند و بالا مینار ہے جس سے ملّتِ ابراہیمؑ اکتسابِ نور کر کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ظلمتوں میں اُجالا کر سکتی ہے۔ یہ زندگی بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا بندۂ مُسلم ہونے کا دعویٰ کھیل نہیں ہے: ؎

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

یہ راہ کوئی پھولوں بھری راہ نہیں ہے، جو بھی اس راہ پر شعور کے ساتھ گامزن ہوتا ہے، کانٹے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ بھاری مشکلات اور کٹھن آزمائشوں کا سامنا ہوتا ہے اور اپنی ایک ایک عزیز ترین متاع نچھاور کرنی پڑتی ہے۔ ؎

ترکِ مال و ترکِ جان و ترکِ سر!

در طریقِ عشق اوّل منزل است!

اس جلیل القدر اور اولوالعزم انسان کا یہ اسوۂ حیات سبق دیتا ہے کہ ایک مومن و مسلم کو کس طرح اپنے خالق و مالک کی مرضی اور حکم کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا چاہیئے۔ یہ اسوہ بتاتا ہے کہ دعوتِ حق کو سربلند کرنے کے لیے کتنی پتّہ ماری، محنت، عرق ریزی اور تگ و دو کی اور کیسے مضبوط یقین و ایمان اور بلند حوصلگی کی ضرورت ہوتی ہے اور طاعت و وفا کا وہ معیار کون سا ہے جس پر پورا اتر کر اُمّتِ مسلمہ امامتِ اقوامِ عالم کے منصب کی سزاوار ہو سکتی ہے۔

اُمّتِ مسلمہ جو ہر سال عیدِ قرباں مناتی ہے اور سنّتِ ابراہیم علیہ السّلام کی پیروی میں جانور ذبح کرتی ہے تو درحقیقت یہ ایک عہد ہے جو وہ اپنے اللہ سے کرتی ہے تو جانور کی گردن پر چھری رکھتے وقت زبان پر وہی کلمات جاری ہوتے ہیں جو حضرت ابراہیمؑ نے دنیا بھر کی محبتوں، رشتوں اور بندھنوں سے کٹ کر ایک اللہ کے ہو جانے کا اعلان کرتے ہوئے کہے تھے۔ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ■ (میں نے ہر طرف سے کٹ کر اپنا رُخ اس ذات کی طرف کر لیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میری

نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب پروردگارِ عالم ہی کے لیے ہے۔ اُس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں، مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور (اس حکم کے آگے) سب سے پہلا سرِ تسلیم خم کرنے والا میں ہوں) ۔ ان کلمات کو دہراتے ہوئے گویا مسلمان یہ عہد کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السّلام کے اُسوہ و کردار کو حرزِ جان بنائیں گے۔ جس طرح انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی جان، گھر بار، وطن، اور عزیز و اقارب قربان کر دیے تھے حتیٰ کہ رضائے الٰہی کی خاطر اپنے جگر گوشے کے گلے پر چھری رکھ دی تھی ہم بھی اسی طرح اپنا سب کچھ حق کے راستے میں قربان کر دیں گے اور اسی جذبۂ صادق کے ساتھ احکامِ خداوندی کے آگے سر جھکا دیں گے۔

مسلمان ہر سال جو ہزاروں، لاکھوں جانوروں کا خون بہاتے ہیں تو اس میں یہی حکمت پوشیدہ ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے عید الاضحیٰ کے روز قربانی کا خون بہانے کو اللہ کے نزدیک ابنِ آدم کا بہترین عمل قرار دیا ہے: مَا عَمِلَ ابْنُ آدَمَ مِنْ عَمَلٍ يَوْمَ النَّحْرِ أَحَبَّ إِلَى اللّٰهِ مِنْ إِهْرَاقِ الدَّمِ ط قرآن حکیم میں جو یہ کہا گیا ہے کہ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ط اللہ کو تمہارے ذبیحوں کا گوشت اور خون مطلوب نہیں ہے بلکہ خلوص اور تقویٰ درکار ہے، تو اس کے معنی یہی ہیں کہ سُنّتِ ابراہیمؑ کی پیروی میں خون بہاتے وقت اسوۂ ابراہیم علیہ السلام کو اپنانے کی تڑپ اور اللہ کے احکام کی اطاعت کا جذبۂ صادق دل میں موجود ہونا چاہیے۔

یہ ہے قربانی کی اہمیت و پس منظر اور اس کی حکمت۔ اپنی اسی اہمیت اور حکمت کے طفیل قربانی اسلامی شعار بن چکی ہے لیکن گزشتہ چند سالوں سے اس شعارِ اسلامی کے خلاف ایک فتنہ برپا کیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ جو مستشرقین کے زلّہ ربا ہیں اور سُنّتِ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم اور اجماعِ اُمت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں اور حَسبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ کا نعرہ
بلند کر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلیم کردہ دین کی بنیادیں ڈھانے اور اپنی نفس پرستیوں
کو قرآنی نظام کا نام دے کر مسلمانوں کی گردن کا قلادہ بنانے کی خواہش رکھتے ہیں اس
فتنہ آرائی میں پیش پیش ہیں۔ قربانی ان سب سے بڑی سنتوں میں سے ایک ہے جو
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمل تواتر کی صورت میں ہم تک پہنچی ہیں، جن پر ہر دور اور
ہر زمانے میں پوری اُمت کا تعامل رہا ہے۔ اگر یہ لوگ اس سب سے بڑی سنت کو غیر اہم
اور غیر ضروری منوانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے
قلعے میں ایک ایسا شگاف ڈال دیتے ہیں جس کی راہ سے یکے بعد دیگرے دوسری سنتوں
پر شب خون مارا جا سکتا ہے۔

قربانی کی مخالفت میں یہ لوگ سب سے بڑا اعتراض یہ پیش کرتے ہیں کہ عیدِ اضحیٰ کی قربانی
کا حکم قرآن میں نہیں ہے حالانکہ اگر قرآن کے ساتھ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین
کا ماخذ تسلیم نہ کیا جائے تو قرآن کریم کے احکام اور اصولوں کی تشریح و توضیح کا کام ہر شخص کی
اہوا اور عیش پرستیوں کے حوالے ہو جاتا ہے۔ یہ سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہے
جس سے اُمتِ مسلمہ کا ملی اور اجتماعی ڈھانچہ وجود میں آیا ہے۔ اُمتِ مسلمہ کو اپنی جن خصوصیات
کی بدولت اقوام و ملل میں امتیاز حاصل ہے ان میں سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا عظیم ہاتھ
کارفرما ہے۔ اسلام کے اجتماعی نظام میں جو کشش، قوتِ انجذاب اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے،
وہ بھی سنتِ رسول ہی کے طفیل ہے۔ سنتِ رسول کے بغیر اسلام کی اجتماعیت اپنا سارا
رنگ و آب اور جلال و جمال کھو دیتی ہے، اس لیے کہ یہ رنگ و آب اور جلال و جمال اسے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی رہنمائی میں دیا ہے۔ وَمَا یَنطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ
هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوحٰى (النجم۔ ۳) ایک عام انسانی ذہن بزعم خویش قرآن پاک کے اصولوں
اور احکام کی روشنی میں جس نوعیت کا بھی اجتماعی نظام تشکیل دے گا وہ اس کے اہوائے نفس

اور میلانات ہی کا مظہر ہوگا اور اس میں یقیناً وہ الٰہی جمال و جلال اور کشش نہ ہوگی جو اللہ کی رہنمائی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں تشکیل کردہ نظام اجتماعی میں ملتی ہے۔

یہ لوگ دوسرا اعتراض یہ کرتے ہیں کہ آخر اللہ کو جانوروں کی قربانی سے کیا مطلوب ہے؟

اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ بے شک اللہ کو قربانیوں کا گوشت اور خون مطلوب نہیں ہے، لیکن جیسا کہ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام کی اطاعت گزاری اور وفا شعاری کا یہ عظیم کارنامہ ملتِ ابراہیمؑ میں رائج کر کے اس کردار کو مسلمانوں کی رُوح و قلب میں زندہ رکھنے کی تدبیر کی گئی ہے جس کا مظاہرہ انہوں نے مسلم حنیف بن کر کیا تھا اس کی بہترین مؤثر صورت یہی ہو سکتی تھی جو تجویز کی گئی ہے۔ یہ صورت اس صورت سے قریب تر مشابہت رکھتی ہے جو منیٰ کے میدان میں پانچ ہزار برس پہلے پیش آئی تھی۔ ایک مسلمان جب چھری ہاتھ میں لیے اپنے پالے اور خریدے ہوئے جانور کی گردن پر چلانے کو آمادہ ہوتا ہے تو اس کا دل اطاعت و وفا شعاری کے تقریباً انہی جذبات سے سرشار ہوتا ہے جنہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنے لختِ جگر کی گردن پر چھری رکھ دینے پر آمادہ کر دیا تھا۔ یہ عملی علامت ہے اس عہد کی کہ اگر اللہ کے دین کو کبھی میری اپنی یا میرے بچوں کی قربانی مطلوب ہوئی تو ہم کسی پس و پیش کے بغیر قربان ہو جائیں گے۔

جانوروں کی قربانی کو چھوڑ کر آپ کوئی دوسرا طریقہ اختیار کریں، جیسا کہ منکرینِ سنّت تجویز کرتے ہیں، دلوں میں وہ جذبات پیدا نہیں ہو سکتے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہیں اور جن کو زندہ رکھنے کی خاطر سنّتِ ابراہیمؑ کو جاری کیا گیا ہے۔ اقبال مرحوم نے جہاد کو حرام قرار دینے والوں کے متعلق کہا تھا: ؎

کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل
کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر

قربانی کے مخالفین کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ جو لوگ ایک جانور کی چھری چلانے میں ہچکچاتے اور حجت بازی سے کام لیتے ہیں ان سے اپنے نفس پر چھری چلانے کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے؟

(۳۱ مارچ ۱۹۶۶ء)

یقیں سے محروم تدبیریں

اشتراکی چین آجکل غلّے کی قلت کا شکار ہے۔ مسلسل تین برس سے پیداوار گر رہی ہے۔ ہر سال پیداوار کا ہدف بڑھ چڑھ کر مقرر کیا جاتا ہے۔ اشتراکی چین اور اس کے پراپگنڈسٹ دن رات ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ امسال غلّے کی پیداوار اگلے پچھلے ریکارڈ مات کر دے گی اور مسلسل بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ بھرنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئے گی، مگر نتیجہ نہ صرف وہی ڈھاک کے تین پات نکلتا ہے بلکہ صورتِ حال سال بسال بد سے بدتر ہوتی جاتی ہے۔

وزیرِ اعظم چو این لائی کے الفاظ میں مسلسل تین برس سے اشتراکی چین قحط کا شکار ہے مگر اس مرتبہ حالت گزشتہ دو برس سے کہیں بدتر ہے ۔۔۔ ایسی کیفیت سے ملک پچھلے ایک سو سال میں دوچار نہیں ہوا۔ ۱۳ کروڑ ۳۰ لاکھ ایکڑ رقبہ (جو چین کی کل قابلِ کاشت زمین کا نصف ہے) یا تو قحط یا آندھیوں اور طوفانوں کا نوالہ بن گیا ہے یا کیڑوں مکوڑوں اور ٹڈّوں نے چاٹ لیا ہے۔

کچھ یہ بات نہیں کہ سوشلسٹ حکومت محض صفحۂ قرطاس پر "خطوطِ خمدار" و "مرپیچدار" کی نمائش کر کے اور بلند آہنگ نعرے لگا کر رہ جاتی ہے اور کاغذ پر بنے ہوئے منصوبے جامۂ عمل پہن نہیں پاتے۔ مسلسل تین برس ہو رہے ہیں انہوں نے اپنی افرادی قوت اور وسائل و ذرائع کا بہت بڑا حصہ ان منصوبوں کی تکمیل میں لگا رکھا ہے۔ چین کے قدیم دیہاتی

معاشرے کی بساط درہم برہم کی جا چکی ہے اور دیہاتی آبادی کمیونوں میں منتقل کر دی گئی ہے جہاں کسانوں ــــ مرد و زن اور بچوں ــــ سے بیلوں کی طرح کام لیا جاتا ہے۔ دن کو سورج کی روشنی میں اور رات کو لالٹینوں کی لو میں۔ انسانوں سے اتنا مسلسل اور اعصاب شکن کام لینے کی شاید پوری تاریخِ انسانی میں، سوویٹ روس کے سوا کوئی نظیر نہیں ملتی" اس دور میں بھی جب غلامی کا رواج تھا اور کھیتوں میں غلاموں سے بیلوں کا کام لیا جاتا تھا لیں بے پناہ اور مشقت بھرے کام کے ساتھ ساتھ ارباب اقتدار پیداوار کو بڑھانے کی ہر ممکن تدبیر زور شور سے اختیار کر رہے ہیں۔

کھاد کے انبار کے انبار جمع کیے جا رہے ہیں۔ اور اس مہم میں ٹیکسیوں اور بسوں کے ڈرائیور تک حصہ لے رہے ہیں۔ اسکولوں کے بچے تعلیم چھوڑ کر خالی زمینوں میں سبزی ترکاری بونے میں لگے ہوتے ہیں۔ اخبارات اور پارٹی کے مبلغین عام آبادی کو دیہات کی طرف متوجہ ہونے کی ترغیب دے رہے ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں کہ اگر ہم نے زرعی پیداوار کو نظر انداز کیے رکھا اور صرف صنعت پر اپنی توجہات کو مرکوز رکھا تو ملک کی ترقی رک جائے گی۔ کسانوں کو کمیونزم کا ہیرو قرار دیا جا رہا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں کے ساٹھ لاکھ سے زائد طالب علم درس گاہوں میں پڑھنے کے بجائے دیہات میں کام کر رہے ہیں، چالیس ہزار سے زائد "لیڈر شپ کیڈر" سے تعلق رکھنے والے کمیونسٹ اور ریٹیر بنا کر دیہات میں بھیجے جا چکے ہیں۔ پیداوار کو ضیاع سے بچانے کا یہاں تک اہتمام کیا جا رہا ہے کہ پورے چین میں چڑیوں کا قلع قمع کر دیا گیا ہے اس لیے کہ وہ ہر سال لاکھوں من غلہ کھا جایا کرتی تھیں۔ اس طرح ملک کو غذائی قلت کے گرداب سے نکالنے کے لیے انسان کی سوچی ہوئی ہر تدبیر حرکت میں آ گئی ہے۔

یہ صورتِ حال ان لوگوں کے لیے بڑی ہی عبرت انگیز ہے جو چشمِ سر کے ساتھ ساتھ

بصیرت کا نور بھی تھوڑا بہت رکھتے ہیں۔ اس سے جو بنیادی بات آشکارا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا میں ایک بالاتر ہستی ایسی ضرور ہے جس کے آگے انسان اپنی ساری ترقیوں دل و دماغ کی عظیم صلاحیتوں اور سائنسی و علمی رفعتوں کے باوجود بے بس و لاچار ہے اگر وہ بالاتر ہستی نہ چاہے تو انسان خواہ کتنی ہی تدبیریں سوچتا ہے، کتنی ہی جدّوجہد کرتا اور اپنی قسمت کو سنوارنے اور اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، وہ اپنی ان تدبیروں اور جدّوجہد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس بالاتر ہستی کی مشیت کے آگے انسان کی ہر تدبیر اور ہر چال بے جان اور نامراد ہو کر رہتی ہے۔

دوسری بات اس سے یہ ظاہر ہوتی ہے کہ یہی بالاتر ہستی انسان کی رازقِ حقیقی ہے، اسی کے ہاتھ میں رزق کے خزانے اور وسائل ہیں، ہر جاندار کو اس کی ضرورتوں کے مطابق رزق پہنچانا اسی کی ذمہ داری ہے۔ وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (زمین میں کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو) اور یہ رزق رسانی اس نے کسی اور کے اختیار میں نہیں اپنے اختیار میں رکھی ہے۔ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ (ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی رزق دیں گے) اہلِ زمین کے رزق میں کمی بیشی کرنا بھی اس کے ہاتھ میں ہے۔ إِنَّ رَبَّكَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ (بے شک تیرا رب ہی جس کے لیے چاہے رزق فراخ کر دیتا ہے اور تنگ کر دیتا ہے) اس ہستی پر پورا پورا اعتماد و توکل ہو تو وہ انسان کی تھوڑی اور خام تدبیروں میں بھی برکت عطا کرتی ہے، اس کی جدّوجہد اور تگ و دو کو کامیابی سے بہرہ ور کرتی اور اپنے فضل سے نوازتی ہے، اس کے بوئے ہوئے ایک دانے سے سات بالیں نکالتی ہے اور ہر بال کا دامن سو دانوں سے بھر دیتی ہے۔ كَمَثَلِ حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِي كُلِّ سُنْبُلَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ (زمین آسمان کی ساری متعلقہ قوتوں کو ان دانوں کی نشوونما میں لگا دیتی ہے اور اس مقصد

کی راہ میں حائل قوتوں کی عنان تھام لیتی ہے۔ لیکن اگر انسان اس بالاتر ہستی کی رزاقی پر اعتماد اور توکل کرنے کی بجائے اپنا رزاق خود بننے کی کوشش کرتا ہے یا اپنے ذرائع اور وسائل اور تدبیروں اور منصوبوں ہی کو سب کچھ سمجھ لیتا ہے تو یہ ہستی بھی اسے اس کے وسائل اور تدبیروں کے حوالے کر دیتی ہے۔ اب وہ اسی حاصل سے دامن بھرتا ہے جو کشت کا طبعی نتیجہ ہوتا ہے۔ پھر کشت کے اس طبعی حاصل کا ملنا بھی ضروری نہیں ہوتا۔ زمین و آسمان کی وہی طاقتیں جو پہلی صورت میں اس بالاتر ہستی کے اذن سے انسان کے ساتھ پورا پورا تعاون کرتی ہیں، اب اپنا تعاون روک لیتی ہیں اور وہ مخالف طاقتیں جنہیں پہلے اس بالاتر ہستی نے روک رکھا تھا، کھلی چھوڑ دی جاتی ہیں۔ اناج کے دانے زمین کے پیٹ ہی میں مر جاتے ہیں یا کونپل بن کر پھوٹتے بھی ہیں تو بہت تھوڑی تعداد میں، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کھیتی لہلہا رہی ہوتی ہے اور کھیتی کا مالک اسے دیکھ دیکھ کر شاداں و فرحاں ہوتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی شب و روز کی محنت اور تگ و دو پھل لے آئی ہے اسے کاٹ کر گودام بھر لے گا، ناگہاں آسمان کے دہانے کھل جاتے ہیں اور اس بے وقت کی موسلادھار بارش تباہ اور ژالہ باری جلا کر رکھ دیتی ہے، دریاؤں میں سیلاب آتا ہے اور اسے بہا کر لے جاتا ہے، تندو تیز طوفان اٹھتا ہے اور اس کا صفایا کر دیتا ہے، ٹڈی دل حملہ آور ہوتا ہے اور آناً فاناً چاٹ کر رخصت ہو جاتا ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہاں کبھی روئیدگی کے آثار ہی نہ تھے۔

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعَامُ حَتّٰىٓ إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ أَتٰهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ (یونس ۲۴)

اور وہ جسے اپنی تدبیروں اور محنت پر ناز اور غرّہ تھا اور اس بالاتر ہستی کے فضل و کرم کو اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کا ثمرہ سمجھتا تھا۔ سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔

اشتراکی چین میں قحط کے جو اسباب وزیرِ اعظم چو این لائی نے بتائے ہیں وہ، اس حقیقت پر شاہد ہیں۔ پھر اس سے یہ بات بھی عیاں ہو جاتی ہے کہ اس بالاتر ہستی کی جسے اللہ کہتے ہیں، اپنے منکرین کے مقابلے میں چالیں اور تدبیریں کتنی مضبوط اور کامیاب ہوتی ہیں اور انسان کی تدبیریں کتنی کھوکھلی اور بودی۔

وَمَكَرُوا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ ؕ

(۲۵ جنوری ۱۹۶۱ء)

جُرم و سزا کے دو رُخ

کیرل چیسمین گزشتہ بارہ برس سے قانون کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ۱۹۴۸ء میں اغوا، ڈکیتی، راہزنی اور عورتوں پر مجرمانہ حملوں کے سترہ جرائم کی پاداش میں سزائے موت سنائی گئی تھی، مگر وہ اپنی ذہانت اور قانونی موشگافیوں کی بدولت اسے مسلسل ٹالتا چلا آ رہا تھا۔ ۲۹ اپریل ۱۹۶۰ء کو کیلی فورنیا کی سپریم کورٹ نے چیسمین کی رحم کی اپیل تیسری بار مسترد کر دی۔ اس استرداد کے بعد اس نے ایک نئی اپیل دائر کی۔ چونکہ اجلِ مسمّٰی آن پہنچی تھی اور ایک ثانیہ آگے پیچھے نہ ہو سکتی تھی اس لیے ۲ مئی ۱۹۶۰ء کو اسے زہریلی گیس کے ذریعے موت کی نیند سُلا دیا گیا۔

چیسمین اور قانون کی اس آنکھ مچولی نے چیسمین کو امریکہ ہی میں نہیں یورپ میں بھی شہرتِ عام بخش دی تھی۔ اس نے جیل ہی میں متعدد کتابیں تصنیف کیں جو لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہیں۔ ان کتابوں سے حاصل ہونے والی رائلٹی ہی کے سہارے اس نے یہ کھیل جاری رکھا اور اسی کے بل پر یورپ اور امریکہ کی رائے عامّہ کی اکثریت کو اپنے حق میں ہموار کیا ـــ چنانچہ ایک طرف امریکہ کے بڑے بڑے قانون دان چیسمین کا مقدمہ لڑنے میں مصروف تھے اور دوسری جانب یورپ اور امریکہ کے عوام چیسمین کو بے گناہ سمجھنے لگے۔ چیسمین ۱۹ فروری ۱۹۵۹ء کو موت

کے گھاٹ اتار جانے والا تھا مگر رائے عامہ کچھ اس طرح اُس کی حامی بن گئی کہ کیلی فورنیا کے گورنر نے پھانسی کے وقت سے صرف دس گھنٹے پہلے اس سزا کو دو ماہ کے لیے روک دیا، کیونکہ انہی دنوں صدر آئزن ہاور لاطینی امریکہ کا دورہ کرنے والے تھے اور چیس مین کو پھانسی دینے سے وہاں ان کے خلاف مظاہرہ ہونے کا اندیشہ تھا۔

چیس مین کا کہنا تھا کہ جن جرائم کی پاداش میں اسے موت کی نیند سُلانے کا فیصلہ کیا گیا ان کا اس نے ارتکاب نہیں کیا۔ وہ قطعاً بے گناہ ہے اور اس کی موت ایک بے گناہ کی موت ہو گی۔ مقدمے کے اصل مجرم اور ہیں اور مفرور ہو چکے ہیں۔ اُدھر استغاثہ کا موقف یہ تھا کہ چیس مین ہی مشہور عوام "سرخ روشنی کا بدمعاش" ہے۔ یہی وہ شخص ہے کہ جب وہ کسی جوڑے کو دیکھتا تو "سرخ روشنی" سے اسے روک لیتا (امریکہ میں پولیس کسی ملزم کو روکنا چاہتی ہے تو "سرخ روشنی" سے روکتی ہے) اور عورت سے بدکاری کر کے رفو چکر ہو جاتا۔ اسی لیے وہ "سرخ روشنی کے بدمعاش" کے نام سے مشہور ہو گیا۔ چیس مین بارہ برس کی عمر سے ۴۸ء تک بھیانک مجرمانہ زندگی گزارتا رہا اس عرصے میں اس نے بیسیوں چوریاں کیں، ڈاکے ڈالے، عورتوں پر مجرمانہ حملے کیے۔ ۱۹۴۱ء میں اسے متعدد جرائم کے سلسلے میں سولہ برس قید کی سزا ہوئی، مگر ۱۹۴۳ء میں وہ جیل سے بھاگ نکلا اور اپنی گھناؤنی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیا۔ کچھ مدت بعد پولیس اس کو دوبارہ گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ ۱۹۴۷ء میں وہ پیرول پر رہا ہوا اور ۱۹۴۸ء میں اُسے سترہ مزید جرائم کے سلسلے میں سزائے موت سنائی گئی جس کو وہ قانونی موشگافیوں کے بل پر ٹالتا چلا آیا۔

یہ ہے اس مجرم کی داستانِ حیات جو اپنے آپ کو بے گناہ قرار دیتا رہا۔

چیسمین کی موت اور زندگی کی یہ کشمکش بارہ برس تک دنیا بھر کے لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث بنی رہی۔ وہ جس طرح موت کو جُل دیتا رہا، اخبارات اُسے افسانوی انداز میں بیان کرتے رہے اور قارئین چٹخارے لے لے کر پڑھتے رہے، لیکن اس داستان میں جو باتیں گرہ باندھنے کی تھیں ان کی طرف کسی نے بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ چیسمین ایسے ایک عادی اور گھناؤنے مجرم کی یہ داستانِ زندگی اپنے دامن میں اربابِ عقل و دانش کے لیے سوچ بچار کا بڑا سرمایہ رکھتی ہے۔ اس داستان سے مغربی تہذیب کی کوکھ سے جنم لینے والے اس معاشرے کی عکاسی ہوتی ہے جس کا دل مجرموں کی ہمدردی اور محبت سے معمور ہے۔ ایک مجرم اپنے کیے کی سزا پانے لگتا ہے تو اس معاشرے کے افراد کی ایک عظیم تعداد تڑپ اٹھتی ہے۔ پیرس سے نیویارک تک اور واشنگٹن سے لندن تک بے شمار لوگ اس مجرم کو موت کے چنگل سے چھڑانے کے لیے بے قرار ہو جاتے ہیں (ایک خبر کے مطابق فرانس کے ایک لاکھ باشندوں نے ایک محضر نامے پر دستخط کیے تھے جس میں صدر آئزن ہاور سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ چیسمین کی جان بچا لیں) وہ معاشرہ جو اپنی استعماری اغراض کی خاطر قوموں کی قوموں کو ملیامیٹ کرتا ہے اور انہیں خاک و خون میں لوٹاتا ہے، ایک دنیا اس ظلم پر صدائے احتجاج بلند کرتی ہے' مظاہرے کرتی ہے، انسانیت' اخلاق اور انصاف کی دہائی دیتی ہے مگر اس کے دل کے تار ذرا بھی مرتعش نہیں ہو پاتے۔ ایک طرف اس کی بے حسی، انسانیت سے تہی دامنی اور ظلم سے محبت کا یہ عالم ہے اور دوسری طرف اس کی زود حسی کی یہ کیفیت کہ لوگوں کی جان و مال اور عزت و ناموس سے کھیلنے والے ایک مجرم کو کیفرِ کردار سے دوچار ہوتے دیکھ کر اس کا دل فرطِ الم سے خون ہونے لگتا ہے اور احساسِ انسانیت جاگ اٹھتا ہے ✦

اس داستان کا ایک اور پہلو جرم و سزا کے اس فلسفے کا تار و پود بکھیر دیتا ہے۔ جو دانشمندانِ مغرب نے تراش رکھا ہے۔ اس فلسفے کے مطابق جرم انسان کی نفسیاتی اور ذہنی الجھنوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور مجرم سزا کا سزاوار ہونے کی بجائے رحم اور ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے۔ اس فلسفے کے قائل بزرجمہر کہتے ہیں کہ مجرموں کو اپنے کیے کی سزا دینے کی بجائے ان کا نفسیاتی علاج کرنا چاہیئے، ان کی فکری و اخلاقی اصلاح کی طرف توجہ دینی چاہیئے۔ یہ کیا ظلم ہے کہ آپ ایک شخص کو قتل کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں یا کوئی غیر قانونی فعل اس سے سرزد ہوتا ہے تو اسے پسِ دیوارِ زنداں پھینک دیتے ہیں، اس کے ساتھ تو ہمدردی سے پیش آنا چاہیئے۔ ان اسباب کا کھوج لگانا چاہیئے جس نے اسے قاتل، خونی، چور اور غنڈا بنایا ہے اور ان اسباب و عوامل کے ازالے کی فکر کرنا چاہیئے۔

یہیں سے سزائے موت کو منسوخ کرنے کی تحریک نے جنم لیا۔ اور قید خانے اصلاح گھر بنا دیئے گئے لیکن جیس ہین کی داستانِ زندگی بتاتی ہے کہ یہ فلسفہ بہت بری طرح ناکام ہو چکا ہے۔ امریکہ سے بڑھ کر کون ملک ایسا ہوگا جہاں مجرموں کا نفسیاتی علاج جدید ترین طریقوں سے کیا جاتا ہوگا، مگر اس علاج کے اہتمام کا انجام کیا ہوا؟ جیس ہین سولہ برس کی عمر میں پہلی مرتبہ قید خانے پہنچا تھا، مگر وہاں اصلاح کی بجائے اس کا کردار اور بگڑتا چلا گیا۔ پہلے وہ چوری کرتا تھا، جیل سے فرار ہو کر باہر آیا تو ڈاکے ڈالنے لگا اور ۱۹۴۷ء میں جب پیرول پر رہا ہوا تو ڈاکے کے ساتھ ساتھ عورتوں کی عصمتیں لوٹنا بھی اس کا دل پسند مشغلہ بن چکا تھا۔

ممکن ہے کہا جائے کہ اب جیس ہین کی فکری و ذہنی کایا پلٹ ہو چکی تھی اور یہ قید خانے کی اصلاحی تدابیر ہی کا نتیجہ ہے۔ ہمیں اس استدلال کے قبول کرنے سے انکار ہے۔ ہمارے نزدیک جیس ہین کے فکر و کردار میں اگر کوئی تبدیلی آئی بھی تو

وہ محض سزائے موت کی تلوار سر پر لٹکے رہنے سے آئی ہے ۔ جن لوگوں کو پھانسی کی سزا پانے والے قیدیوں کی زندگی دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس بات کی شہادت دیں گے کہ جب انسان کو اپنی موت کا یقین ہو جاتا ہے اور اسے اپنی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب دیکھتا ہے، تو اس کی زندگی عموماً بدل جاتی ہے۔ اس کی سوچ اور عمل کے زاویے تبدیل ہو جاتے ہیں، وہ بدی سے نفور اور نیکی کی طرف راغب ہو جاتا ہے، اس کی جو اخلاقی کمزوریاں پہلے چھٹنے کو نہ آتی تھیں یک سر چھوٹ جاتی ہیں چلیس مین کی زندگی میں تبدیلی بھی موت کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھ کر رونما ہوتی ۔ اس سے دانشمندان مغرب کی فلسفیانہ موشگافیوں کی بجائے ہمارے اس مؤقف کو تقویت ملتی ہے کہ مجرم ذہن و کردار رکھنے والوں کو عبرت ناک سزا کا خوف ہی جرم سے باز رکھتا ہے

اس داستانِ زندگی کا ایک اور قابلِ غور پہلو یہ ہے کہ چلیس مین مسلسل بارہ سال تک اپنی بے گناہی کی دہائی دیتا رہا مگر امریکہ کی عدالتیں اسے مجرم قرار دیے چلی گئیں اور چلیس مین کسی نہ کسی قانونی موشگافی کے ذریعے اپنی سزا کو ٹالتا رہا۔ اگر چلیس مین واقعی بے گناہ تھا اور اس خطا میں اسے مارا گیا کہ خطاوار نہ تھا، تو اس سے امریکی عدالتوں اور قانون و انصاف سے متعلق دوسرے اداروں کی بے مائیگی کا پتہ چلتا ہے۔ اور اگر وہ مجرم تھا، لیکن صرف قانونی خامیوں اور موشگافیوں کی بدولت اپنے کیے کا خمیازہ بھگتنے سے بچتا رہا تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ امریکہ میں قانون اپنے جدید ترین فلسفوں اور اعلیٰ ترین ترقی یافتہ اداروں کے باوجود اپنی ذمہ داری کا حق ادا کرنے سے کس طرح مجبور ہے۔

ان دونوں میں سے امرِ واقعہ کوئی بھی ہو، اس سے قانون کی بے بسی ظاہر ہوتی ہے۔

مغربی معاشرے میں جرم و قانون کے درمیان آنکھ مچولی کا کھیل عام ہو چکا

ہے۔ مجرم ارتکابِ جرم کر کے قانون کی گرفت سے بچنے کی ہر ممکن تدبیر کرتے ہیں ادھر قانون ہے کہ اپنی ساری قوت واقتدار کے علی العموم مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں معذور رہتا ہے۔ کچھ اس لیے کہ قانونی نکتہ طرازیاں اسے کچھ کرنے نہیں دیتیں اور کچھ اس لیے کہ معاشرتی وتہذیبی فلسفے اور مرئی وغیر مرئی مصلحتیں اس کے لیے زنجیرِ پا بن جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جرائم کا ایک طوفان ہے جو مغربی معاشرے میں امڈ آیا ہے، مجرمانہ ذہنیت عام ہو چکی ہے، نچلے طبقے سے لے کر اعلیٰ طبقے تک سب اس ذہنیت کا شکار ہو چکے ہیں۔ نچلا طبقہ اور عام ذہن و کردار کے حامل افراد قتل، اغوا، ڈکیتی، چوری، عصمت دری اور دوغا فریب کے مرتکب کھلے عام ہو رہے ہیں اور اعلیٰ طبقے کے افراد ان جرائم کو غیر اہم اور صواب قرار دینے کی سعی میں مصروف ہیں۔

چیس مین کی اس وارداتِ حیات، اور مغربی معاشرے کے احوال پر ہمارے ذہن میں 'اسلامی معاشرے' کے دو واقعات تازہ ہو گئے ہیں۔

مدینہ کی ریاست کے ایک شہری ایک ایسے جرم کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں جس کی سزا سنگساری ہے۔ جرم کرتے ہوئے انہیں کسی نے نہیں دیکھا۔ وہ اگر چاہتے تو اسے پردۂ راز ہی میں رکھ کر سزا سے بچ سکتے تھے، نہ کسی نے انہیں گرفتار کیا تھا کہ وہ اقرارِ جرم کرنے پر مجبور تھے۔ ہاں ہمہ گناہ کی خلش ان کے ضمیر کو بے چین کر دیتی ہے۔ خدا کا خوف ان کی رگ و پے میں دوڑ جاتا ہے اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کرتے ہیں کہ ان پر حد جاری کر کے انہیں گناہ کی آلودگی سے پاک کر دیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان کی درخواست سن کر اعراض فرماتے ہیں۔ وہ دوبارہ درخواست کرتے ہیں۔ حضورؐ پھر ان سنی کر دیتے ہیں۔ وہ تیسری بار عرض کرتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلّم پھر اعراض فرماتے ہیں۔ حتّٰی کہ وہ چوتھی مرتبہ درخواست کر کے چار شہادتوں کی شرط خود ہی پورا کر دیتے ہیں اور اللہ کے رسول صلّی اللہ علیہ وسلّم ان پر حد جاری کرنے کا فرمان صادر کر دیتے ہیں۔

۲۔ صبحِ صادق ابھی نہیں ہو پائی، رات کا اندھیرا ہنوز باقی ہے۔ مدینہ کی ایک گلی میں ایک خاتون چلاتی ہے مجھے عصمت کے ڈاکو سے بچاؤ۔ ایک صاحب اس آواز کو سنتے ہیں اور مجرم کو پکڑنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں۔ آواز سن کر کچھ اور لوگ بھی دوڑتے ہیں۔ مجرم تو اندھیرے میں بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے مگر اس خاتون کی پکار پر سب سے پہلے مدد کو دوڑنے والے شخص کو وہ پکڑ لیتے ہیں۔ وہ لاکھ کہتا ہے کہ مجرم کوئی اور ہے، میں تو اسے پکڑنے کے لیے دوڑا تھا، لیکن عورت جس نے اندھیرے میں مجرم کی شکل صورت نہیں دیکھی، وہ اس عہد کے رواج کے مطابق شہر سے باہر منہ اندھیرے قضائے حاجت رفع کرنے کے بعد واپس آ رہی تھی کہ مجرم نے اسے راہ چلتے دبوچ لیا تھا، وہ کہتی ہے کہ مجرم یہی ہے۔ اسے محکمۂ احتساب کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ عدالت میں مقدمہ پیش ہوتا ہے۔ بے گناہ شخص فریاد کرتا ہے کہ میں تو اس خاتون کی پکار پر اسے بچانے اور مجرم کو پکڑنے کے لیے دوڑا تھا، لیکن عورت کا اصرار تھا کہ نہیں مجرم یہی ہے۔ ملزم شادی شدہ ہے۔ عدالت سنگسار کرنے کا فیصلہ سنا دیتی ہے۔

اور پھر لوگ میدان میں امڈ آتے ہیں جہاں "مجرم" کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ مجرم کو لایا جاتا ہے، اس کا چہرہ بے گناہی کے نور سے روشن اور پُرسکون ہے۔ وہ رضائے الٰہی پر اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ کمر تک کھودے ہوئے گڑھے میں اسے کھڑا کر دیا جاتا ہے، لوگوں نے پتھر ہاتھوں میں اٹھا لیے ہیں۔ اچانک ایک شخص مجمع سے نکلتا ہے اور بلند آواز سے چیختا ہے، "ٹھہرو، یہ شخص بے گناہ ہے، اصلی مجرم میں

ہوں، پتھر اس پر نہیں مجھ پر برسنے چاہئیں۔ میرا ضمیر مجھے کوس رہا ہے کہ میں نے نفسِ امّارہ کی برائی سے مغلوب ہو کر ایک پاک دامن خاتون کی عصمت دری کی اور میرے جرم کی سزا ایک بے گناہ کو مل رہی ہے۔ اسے چھوڑ دو اور حد مجھ پر جاری کرو۔ مجمع پر سنّاٹا طاری ہو جاتا ہے۔ پھر بے گناہ مجرم چھوٹ جاتا ہے اور اصلی مجرم پر حد نافذ کر دی جاتی ہے۔

کیرل چیس مین کی داستانِ زندگی ایک تہذیب کی نمائندگی کرتی ہے اور یہ دونوں واقعات دوسری تہذیب کی۔ پہلی تہذیب جرائم کی بیخ کنی کے لیے پہلے لوگوں کو جرائم کرنے کے لیے کھُلی فضا فراہم کرتی ہے، ان کے دل و دماغ میں اخبارات، فلموں، ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعے جرائم سے محبت بھر دیتی ہے اور جب وہ جرائم کا ارتکاب کر کے جیل پہنچتے ہیں تو وہاں ان کی اصلاحِ فکر و نظر اور تربیتِ کردار کا اہتمام کرتی ہے۔ دوسری تہذیب اپنے ماننے والوں کی فکر و نظر اور سیرت و کردار کی اصلاح و تربیت اپنا بنیادی فرض سمجھتی ہے اور اس کا پورا اہتمام کرتی ہے، اس طرح ان کے دل و دماغ میں برائی اور جرائم سے نفرت جاگزین کرتی ہے۔ ان میں آخرت کی پرسش اور جزا و سزا کا تصوّر بٹھاتی ہے، اتنا گہرا کہ ان سے کسی جرم کا ارتکاب بشریت کے تقاضے سے ہو بھی جاتا ہے تو وہ آخرت میں عذاب جھیلنے کے بجائے دنیا کی کڑی سے کڑی سزا کو ترجیح دیتے ہیں، خود آگے بڑھ کر جرم کا اعتراف کرتے ہیں اور عدالت سے کہتے ہیں کہ ان پر حد جاری کر کے اس نجاست سے پاک کر دیا جائے۔ دوسری طرف پہلی تہذیب کے ڈھالے ہوئے لوگ صرف یہی نہیں کہ جرم کے کھلے بندوں مرتکب ہو کر اس کا انکار کرتے ہیں بلکہ عدالت انہیں مجرم قرار دیتی ہے تو وہ اپنی ذہانت اور روپے پیسے کی ساری قوتیں اس بات پر صرف کر دیتے ہیں کہ وہ اس جرم کی سزا سے بچ جائیں۔

(۱۲ مئی ۱۹۶۰ء)

پھر روشن اندروں تاریک تر

روزوار برٹن ضلع شیخوپورہ کا ایک پرائمری ٹیچر اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا

اُگلے کہ اس نے بیس روپے رشوت لی تھی۔ یہ روپے ملزم نے اپنے ایک شاگرد کو امتحان میں پاس کرانے کے عوض وصول کیے تھے۔ جب سے یہ خبر میں نے پڑھی ہے۔ سوچ کی لہروں کے مدّوجزر نے مجھے آلیا ہے۔ میں رہ رہ کر سوچ رہا ہوں، ہمارا معاشرہ کس پستی میں گرتا جا رہا ہے؟ ہم جس دور میں رہتے ہیں اس کی قصیدہ سرائی کرتے ہوئے ہماری زبانیں نہیں تھکتیں۔ کتنا روشن و ترقی یافتہ دور ہے! علم کے نور نے زندگی کے تاریک ترین گوشوں کو منوّر کر دیا ہے۔ جگہ جگہ عالی شان یونی ورسٹیاں اور عظیم درسگاہیں قائم ہیں جہاں سے فضلائے روزگار اور علمائے عصر فکر و نظر کی تربیت پا کر نکل رہے ہیں۔ بڑے بڑے علمی تحقیقاتی ادارے وجود میں آچکے ہیں، جہاں قدرت کے پوشیدہ اسرار پر سے پردے اٹھائے اور انسان کی ذہنی ترقی اور فکری بالیدگی کے تازہ بتازہ، نو بنو وسائل ڈھونڈے جاتے ہیں۔ یہ جو سائنس کی دنیا میں حیرت ناک شعبدوں کا ظہور ہو رہا ہے، صنعت و زراعت کے میدانوں میں عظیم انقلاب برپا ہے، زمین کے بیچے کی خبر لانے کے بعد آسمان میں تھگلی لگانے کی سوچ رہے ہیں، یہ سب علم ہی کے معجزے تو ہیں!

پھر اپنے دور کی ان ترقیوں کے ساتھ ساتھ ماضی کا تاریک دور بھی ہماری آنکھوں

میں پھیر جاتا ہے۔ کتنا "وحشت ناک" اور "غیر مہذب" دور تھا جس کی فضا میں رجعت پسندی اور جمود کی گھٹا پھیلی ہوئی تھی، جس میں "جہالت" کا نام علم رکھ دیا تھا، جب چند کتابیں پڑھ لینا منتہائے کمال سمجھا جاتا تھا، جب زندگی تاریک خیالی اور اوہام کی اسیر تھی اور افکار عقائد و رسوم کے گنبد میں مقید! اس تقابل پر ہم اس تصور سے پھولے نہیں سماتے کہ ہمارا دور حقیقی علم اور روشن خیالی کا دور ہے، فکری و تہذیبی ترقی کا دور ہے، سائنسی کمالات کا دور ہے اور ہم سے بڑھ کر خوش نصیب نسلِ انسانی اس کرۂ ارض پہ آج تک پیدا نہیں ہوئی۔ ہم میں سے جو ملک اور قومیں ابھی پس ماندہ ہیں اور علمی ترقیوں کی ان رفعتوں پر پہنچ نہیں پائیں وہ اپنے سارے وسائل کو سمیٹے اس منزل کی جانب افتاں و خیزاں دوڑی جا رہی ہیں اور جن کے وسائل کا دامن تہی یا اس دوڑ کے لیے ناکافی ہے۔ وہ دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر اور دریوزہ گری کر کے "منزلِ عشق" کی جانب رواں دواں ہیں اس دوڑ میں زندگی کے کتنے ہی اہم تقاضے نظر انداز کیے جا رہے ہیں اور کتنے ہی فطری علائق ہیں جنہیں کاٹا جا رہا ہے۔ یہ دوڑ اتنی تیز ہے کہ اگر وہ ان تقاضوں اور علائق کو اپنے ہم رکاب رکھنا بھی چاہیں تو نہیں رکھ سکتے۔ یہاں تو بس منزل پر پہنچنے کی دھن سوار ہے، کوئی ساتھی رہے یا نہ رہے۔ گویا ٹھیک وہی عالم ہے جس کا ذکر فانی نے کیا تھا:

منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا

لیکن اس علمی ترقی اور فکری و تہذیبی عظمت کے باوجود کیا واقعی ہم "رجعت پسند" اور تاریک دور سے بہتر دور میں زندگی بسر کر رہے ہیں؟ ماضی کے رجعت پسند اور تاریک ادوار کے شب و روز آج بھی تاریخ کی تقویم میں محفوظ ہیں۔ اس تقویم کی ورق گردانی تو آپ نے کی ہو گی، کیا کہیں پڑھا ہے کہ اس وحشت ناک دور کے اساتذہ بھی رشوت لیا کرتے تھے؟ دورِ جدید کی عظیم الشان درس گاہوں میں تعلیم پانے والے

طلبہ کی ہنگامہ آرائیوں، ہلڑ بازیوں اور بد نظمیوں کی شکایات عام ہیں۔ بھارت کی کئی یونیورسٹیاں تو اپنے نونہالوں کی ایسی ہی سرگرمیوں کے طفیل بند ہو چکی ہیں۔ کیا اس تاریخ میں بھی آپ کی نظر سے کوئی ایسا واقعہ گزرا ہے؟ طلبہ کے بارے میں یہ شکایت بھی عام ہے کہ ان میں ماں باپ کا ادب رہا ہے نہ اساتذہ کا لحاظ اور حیا۔ کیا کہیں اس تاریخ کو بھی آپ اسی طرح شکوہ سنج پاتے ہیں؟ اساتذہ کی اخلاقی کمزوریاں آج مختلف صورتوں میں سامنے آرہی ہیں بھارت کی ایک یونیورسٹی میں طلبہ کی ہنگامہ آرائی کا سبب ایک استاذِ محترم ہی کی ایک اخلاقی کمزوری تھی، کیا آپ کو اس تقویم میں بھی کوئی ایسا استاد نظر آتا ہے جس کے کردار پہ کبھی کسی نے حرف گیری کی ہو؟

تاریخ کی تقویم تو شاید ہم میں سے بہت سوں کی دسترس سے باہر ہو، ذرا پینتیس چالیس برس ہی پیچھے کی طرف پلٹ جائیے۔ اس وقت استاد اور شاگرد کا جو باہمی تعلق اور درس گاہوں میں جو فضا تھی اور اساتذہ اور طلبہ کے گفتار و کردار کا جو رنگ تھا اس کا تصوّر کیجیے یا اپنے بزرگوں سے پوچھیئے۔ کیا اس وقت بھی اس قسم کی باتیں سننے اور دیکھنے میں آتی تھیں جو آج ہم سن اور دیکھ رہے ہیں؟ اس زمانے کے اسکول اور کالج یقیناً ترقی کی اس روشنی سے بہرہ ور نہ تھے جس سے آج ہیں۔ اساتذہ بھی وہ تھے جنہوں نے "رجعت پسند" اور "تاریک" دور میں آنکھیں کھولی تھیں اور اس دور کے علمی گھوارں میں پروان چڑھے تھے، مگر کیا ان درس گاہوں اور اساتذہ کے احوال و کردار وہی تھے جو آج ہیں؟ ذرا بزرگوں سے دریافت کیجیے، ان دنوں استاد اور شاگرد کے درمیان کس قسم کا رشتہ تھا؟ شاگرد، استاد کو اپنا روحانی باپ سمجھتا اور استاد شاگرد کو روحانی بیٹا۔ شاگرد اگرچہ کتنے ہی اونچے گھرانے کا چشم و چراغ ہوتا مگر استاد کی کفش برداری اپنی سعادت اور متاعِ فخر سمجھتا اور استاد کسی امتیاز کے بغیر تمام شاگردوں کے ساتھ یکساں شفقت و محبت سے پیش آتا۔ شاگرد، استاد کے سامنے نہایت ادب و احترام کے ساتھ بیٹھتے۔ استاد کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی بے ادبی و گستاخی

سمجھی جاتی۔ کچھ پوچھنا ہوتا تو مؤدب اور منکسر لہجے میں پوچھتے۔ استاد بھی رہنمائی کرتا تو شفقت اور رہبرانہ انداز میں۔ نہ تو شاگرد اس طالب علمانہ شوخی سے کام لیتے جسے آج ایک "وصف" سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو بہت سی گستاخیوں کا سرچشمہ بن رہی ہے نہ استاد میں علمی تکبر یا اوچھاپن پایا جاتا۔

"تادیب اور جسمانی سزا آج کے درخشاں دور میں "وحشیانہ" قرار دے دی گئی ہے، اس دور "تاریک" میں یہ وحشت تعلیمی نظام کا جزو لاینفک تھی۔ ماں باپ بچے کو مدرسے بھیجتے تو کہہ دیتے کہ استاد محترم! یہ بچہ آپ کے حوالے ہے، گوشت پوست آپ کی اور ہڈیاں ہماری، مگر لڑکا لائق نکلے۔ استاد تعلیم کے ابتدائی مراحل میں جہاں شاگرد کی تعمیر سیرت میں مشفقانہ ہدایات اور عملی نمونے سے مدد لیتا وہاں بوقت ضرورت مطعون و مردود "مولا بخش" سے بھی کام لیتا۔ استاد کی خدمت شاگرد کے سرپرست اپنا فرض سمجھتے، لیکن استاد ہمیشہ اس سے بے نیاز رہتا۔ قناعت، توکل اور چشم سیری اس کی زندگی کا طرۂ امتیاز تھا۔ تعلیم و تعلم اور درس و تدریس کو طلب زر کا ذریعہ بنانا علم کی اور اپنی توہین سمجھتا۔ شاگرد استاد کی خدمت امتحان میں اچھے نمبر یا نگاہ عنایت حاصل کرنے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ایک بزرگ کی خدمت اور حق سمجھ کر کرتے۔ خود استاد کی طرف سے اس خدمت کا کبھی اشارے کنایے میں مطالبہ نہ ہوتا۔ استاد کو رشوت دینے یا اس کے رشوت لینے کا تصور تو اتنا مکروہ ہے کہ آج کا ترقی یافتہ اور مہذب دور ہی اس پر فخر کر سکتا ہے۔ ع

چہرہ روشن اندرون چنگیز سے تاریک تر

یہ پینتیس چالیس برس پہلے کا رنگ فضا ہے۔ اس سے ایک آدھ صدی پہلے کا تو عالم ہی کچھ اور تھا۔ موجودہ صدی نصف صدی میں تعلیم و تعلم اور استاد اور شاگرد کے تعلقات میں جو انقلاب آیا ہے۔ اقبال مرحوم نے اس کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا تھا۔

وہ دن بھی تھے کہ خدمت استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجئے !
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ "بل پیش کیجئے"

بلکہ اب اس نقشے کا رنگ کچھ اور شوخ ہو گیا ہے۔ پہلے استاد، شاگرد کی درخواست پر بل پیش کیا کرتے تھے اب وہ شاگرد کو از خود اپنے علم اور صلاحیتوں کی قیمت بتاتے ہیں کہ جسے یہ قیمت ادا کرنے کی توفیق ہے وہ آئے اور ہمارے دریائے علم سے فیض یاب ہو۔

وہ حالت تھی اس وقت جب زمانہ "غیر ترقی یافتہ" تھا اور لوگ غیر مہذب تھے جب گھاس پھوس کے جھونپڑوں، مسجدوں کے صحنوں اور حجروں اور سیدھی سادی عمارتوں میں کسی تعلیمی و نفسیاتی فلسفے کے بغیر فرشِ خاک پر بیٹھ کر تعلیم دی اور حاصل کی جاتی تھی اور آج جبکہ زمانہ ترقی کر کے خلائی دور میں داخل ہونے کو ہے، تہذیب کا چار دانگِ عالم میں غلغلہ ہے طلبہ عظیم الشان عمارتوں میں میز کرسیوں پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں، عالی شان یونی ورسٹیاں قائم ہیں، علمی تحقیقات کے عظیم ادارے کام کر رہے ہیں، تعلیم و تعلّم کے نئے نئے رموز و اسرار عیاں کیے جا رہے ہیں، طلبہ اور اساتذہ کی رہنمائی کے لیے نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں، کانفرنسوں اور سیمناروں کی دھوم ہے۔ گراں بہا تعلیمی و نفسیاتی فلسفے گھڑ لیے گئے ہیں اور ایک ایک علم کی بیسیوں شاخیں نکالی جا رہی ہیں مگر اس سب کا حاصل وہ ہے جو ہم آنکھوں سے دیکھ اور کانوں سے سن رہے ہیں! انسان کے فکر و ذہن اور سیرت و کردار کو بگاڑنے میں یہ عالی شان درس گاہیں اور عظیم اسناد کے حامل اساتذہ جس قدر حصہ لے رہے ہیں، شاید دوسرے عوامل کا اس بگاڑ میں عشرِ عشیر ہاتھ بھی نہیں ہے۔ مشرق کے ایک صاحب نظر سے ایک مغربی نے اپنی تہذیب کے عظیم المرتبت کارناموں کا ذکر کیا تو اس نے جواب میں کہا تھا کہ بے شک انسان نے ہوا میں پرندوں کی طرح اڑنا

اور سمندر میں مچھلی کی طرح تیرنا سیکھ لیا ہے، مگر اسے زمین پر انسان کی طرح رہنا نہیں آیا۔
الفاظ کے تغیر سے میں کہتا ہوں کہ بے شک آج کا تعلیمی ماحول زیادہ شاندار ہے اور تعلیم و تعلّم کے عظیم فلسفے تراش لیے گئے ہیں۔ مگر یہ ماحول اور فلسفے علم کی حقیقی روح سے خالی ہیں۔
اے عصرِ حاضر کے دانش ورو! تم نے اپنی درس گاہوں میں سورج اور چاند کی کرنیں گرفتار کر کے بند کر لیں، مگر اس چراغ کو گل کر دیا جس سے ضیائے علم پھوٹتی اور ذہن و کردار کی تاریکیاں دور ہوتی تھیں۔ تم نے علم کے ظواہر کو عظیم الشان اور درخشندہ بنا دیا مگر اس کا باطن گھٹا ٹوپ اندھیروں میں لپیٹ دیا۔ زندگی اس سے منور ہو تو کیوں کر؟

کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ

علم اور تحصیلِ علم کا ایک مادی تصور وہ ہے جو جدید دور اور فکرِ فرنگ نے دیا ہے اور جس نے مادی نقطۂ نظر سے انسان کو چاہے جتنی ہی بلندیوں پر پہنچا دیا ہو روحانی اور اخلاقی طور پر وہ پستیوں میں جا گرا ہے۔ وہ کہلاتا انسان ہے مگر اس نے زندگی کا جو نمونہ پیش کیا ہے وہ حیوانوں سے بدتر ہے۔ اس کی کچلیاں اور پنجے درندوں سے زیادہ تیز اور مضبوط ہیں، اس کی ہوس کے آگے شاید سؤر اور کتے بھی شرمندہ ہو جائیں۔
ایک تصوّر وہ ہے جو اسلام ہمیں دیتا ہے۔ صاحبِ علم مومن اسلام کی نظر میں بڑا بلند مرتبت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ایمان بے لباس ہے اس کا لباس تقویٰ ہے، اس کی زینت حیا ہے اور اس کا حاصل علم ہے۔
ایک اور ارشاد ہے: صاحبِ علم اللہ کی طرف سے زمین پر صاحبِ امانت ہے۔ اور جب کوئی بندۂ مومن اس امانت سے بہرہ یاب ہونے کے لیے روانہ ہوتا ہے تو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فرشتے اس کے لیے اپنے پر اور بازو اس کی راہ میں بچھاتے ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا: کسی روز اٹھ کر علم کا کوئی باب حاصل کر دیں اس

سے بہتر ہے کہ اس روز سو رکعت نمازیں پڑھ لو" علم حاصل کرتے وقت یہ تصوّر طالب علم کے ذہن میں رہنا چاہیئے کہ وہ جہاد میں مصروف ہے۔ ابو درداءؓ کہتے ہیں جس نے طلب علم میں دن بسر کرنے کو جہاد نہ قرار دیا سمجھ لو اس کی عقل میں نقص ہے۔

علم کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ علم وہ ہے جو انسان کو ہدایت کا راستہ دکھائے اور انسان اسے صرف اللہ کے لیے یعنی اللہ کا کلمہ بلند کرنے، دنیا کو حق پر چلانے اور کفر کو سرنگون کرنے کے لیے حاصل کرے۔ معاذ بن جبل رضؓ تعلیم و تعلّم کے بارے میں حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم سے مرفوعاً روایت کرتے ہیں،

علم حاصل کرو، علم کا اللہ کے لیے حاصل کرنا نیکی اور عبادت ہے، اس سے شغل تسبیح ہے، اس پر بحث مباحثہ جہاد ہے۔ علم سکھاؤ، یہ صدقہ ہے، کسی باصلاحیّت کو علم سے بہرہ یاب کرنا تقرّبِ الٰہی کا ذریعہ ہے۔ علم اکیلے کا ساتھی، تنہائی کا رفیق، تنگی اور وسعت میں رہنما، دوستوں میں غمخوار دوست، بہترین ساتھی اور راہِ جنّت میں روشنی پھیلانے والا روشن ستارہ ہے۔ علم ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ قوموں کو سربلندی عطا کرتا ہے۔ بھلائی کی راہ میں قیادت اور رہبری کرتا ہے، لوگ ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں اور ان کے اعمال و کردار کو اپناتے ہیں۔ فرشتے اپنے پروں سے ان کے دامن کی گرد جھاڑتے ہیں اور دنیا کی ہر چیز ان کے لیے دعا کرتی اور مغفرت چاہتی ہے۔ حتّٰی کہ دریا کی مچھلیاں اور کیڑے، خشکی کے چوپائے اور درندے اور آسمانوں کے ستارے بھی ان کے لیے دعا کرتے ہیں اس لیے کہ علم، جہالت اور اندھے پن کی موت کے مقابلے میں دلوں کی زندگی اور تاریکی کے مقابلے میں آنکھوں کی بینائی ہے، ضعف کے مقابلے میں جسم کی توانائی ہے، انسان علم کے ذریعے نیک لوگوں اور مقرّبین کے اعلیٰ درجات تک پہنچتا ہے۔

علم میں تفکّر روزوں کے برابر اور علم کا مشغلہ نمازوں کے برابر ہے۔ علم ہی کی بدولت انسان اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کے طریقے سیکھتا ہے اور اسی سے توحید اور زہد و ورع

کے مقامات کھلتے ہیں۔ اور اسی کے ذریعے اہلِ قرابت کا حق ادا ہوتا ہے۔

اسلام میں علم کا مقام اتنا بلند ہے کہ اسے محض دنیا کمانے کے لیے حاصل کرنا جرم عظیم سے کم نہیں۔ ابو ہریرہ رضؓ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے اس علم کو جس سے اللہ کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے، اس غرض سے سیکھا کہ وہ اس سے دنیا کی متاع حاصل کرے قیامت کے دن اسے جنت کی خوشبو تک نہ آئے گی۔

اسلام چاہتا ہے کہ لوگ علم کے غرض و مطلب اور ریاکاری اور ایک دوسرے پر برتری جتانے کے لیے حاصل نہ کریں۔ کعب بن مالکؓ کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے علم اس غرض سے حاصل کیا کہ وہ دوسرے اہلِ علم پر برتری جتائے یا جاہلوں سے بحث و جدال کرے یا لوگوں کو اپنی جانب مائل و متوجہ کرے، اللہ اسے آگ میں میں داخل کرے گا۔

اسلام علم سکھانے والوں کے سیرت و کردار کا معیار بھی مقرر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اسلام کس قسم کے لوگوں سے حاصل کرنا چاہیئے۔ ابن سیرینؒ کہتے ہیں کہ علم حاصل کرتے وقت دیکھ لینا چاہیئے کہ وہ کس شخص سے اپنا دین حاصل کر رہا ہے۔

مسلمان علماء نے علم کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک علم شریعت اور دوسرا علم دنیا۔ احادیث میں علم کے متعلق جو ہدایات ملتی ہیں انہیں علماء نے علوم شریعت تک محدود کر دیا ہے؛ حالانکہ خود احادیث میں کہیں بھی اس طرح کی تحدید نہیں کی گئی۔ ایک صحیح اسلامی مملکت میں پورے تعلیمی نظام میں ان تمام ہدایات کو بنیادی اہمیت دی جائے گی۔ غیر شرعی علوم کو بھی اس طرح پڑھایا جائے گا کہ طالب علموں کا اللہ اور رسولؐ پر ایمان اور پختہ ہو اور وہ ان علوم کو حاصل کر کے دنیا پر اسلام کی برتری اور عظمت کا سکہ بٹھا سکیں۔

علم کے اس فلسفے پر مسلمان جب تک عامل رہے ان کی درس گاہوں میں وہ روحانی اور اخلاقی فضا قائم رہی جسے آج کے ترقی یافتہ اہلِ علم رجعت پسندی اور تاریکی قرار دیتے

ہیں اور جب تعلیم و تعلّم کے اس نظریّے کی گرفت ذہنوں اور عمل و کردار پر کمزور ہوتی چلی گئی تو اخلاقی خرابیاں پیدا ہوتی چلی گئیں۔ حتّٰی کہ تعلیم کے جدید نظریّے اور فلسفے نے رہی سہی اخلاقی خوبیوں کا صفایا کر دیا۔ اور نوبت بایں جا رسید کہ استاد، استاد اور شاگرد، شاگرد نہیں رہے اور تعلیم و تعلّم کا پیشہ تجارت بن گیا ہے اور جو خرابیاں اور مفاسد تجارت کے دوسرے شعبوں میں پائے جاتے ہیں وہی اس شعبے میں در آئے ہیں۔

(۲۹ جنوری ۱۹۶۰ء)

دو نظریے، دو انسان

ناگا لیڈر مسٹر فیزو جن کی قیادت میں ناگا قبائل گزشتہ پانچ برس سے بھارت سے آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے، کسی صورت لندن پہنچ گئے ہیں۔ اور اس خطے کے لوگ جن حالات سے دوچار ہیں، ان سے دنیا بھر کو آگاہ کر رہے ہیں۔ انہوں نے ایک پریس کانفرنس میں بڑی تفصیل کے ساتھ ان انسانیت سوز مظالم کا ذکر کیا ہے جو بھارتی فوج ناگا قبائل پر اس جرم میں توڑ رہی ہے کہ ان کے سینے میں آزادی کی شمع کیوں روشن ہے۔ مسٹر فیزو نے بتایا: بھارت بدترین فسطائیت اور نسل کشی کا مظاہرہ کر رہا ہے، جیل بھرے پڑے ہیں، زمین مکمل طور پر بنجر ہوتی جا رہی ہے اور ناگاؤں کو نیست و نابود کرنے کا سلسلہ جاری ہے ...... آپ پوچھیں گے ایک چھوٹی سی قوم بھلا ایسے مصائب کا کس طرح مقابلہ کر رہی ہے؟ اگر آپ کی بیوی کو ٹھوکریں مار مار کر ہلاک کر دیا جائے، آپ کی بیٹی کی عصمت آپ کی آنکھوں کے سامنے لوٹی جائے، آپ کا گھر اور غلّے کا گودام نذرِ آتش کر دیا جائے، آپ کے بھائی کو اتنا مارا جائے کہ اس کی ہڈی چٹخ جائے اور وہ تا عمر اپاہج ہو جائے تو بتائیے آپ کیا کریں گے؟ آپ کا جواب ہمارا جواب ہو گا!"

مسٹر فیزو نے صرف عورتوں کے ساتھ کیے جانے والے وحشیانہ سلوک کی جو مثالیں بیان کی ہیں وہ لرزہ خیز ہیں:

۱۔ مسز زوہوتو کی دو لڑکیوں کو مارچ ۱۹۵۶ء میں مالمھو گاؤں میں سپاہیوں نے پکڑا

اور دن بھر ان کی عصمت دری کرتے رہے۔ جب یہ لڑکیاں نیم مردہ ہوگئیں تو انہیں چھوڑا اور وہ گھسٹتی گھسٹتی اپنے گاؤں پہنچیں۔

(۲) ٹیلی زو، کر لہو اور کرومیا کے گاؤں میں صرف اس جرم میں عصمت دری کی گئی کہ اس گاؤں والوں نے ناگا ہوم گارڈز کو خوراک بہم پہنچائی تھی۔

(۳) فز ہوزو، کمونو اور ٹیسنگلا نامی تین لڑکیوں کی جو تیرہ، چودہ اور سولہ برس کی تھیں، جون ۵۶ء میں عصمت دری کی گئی۔

(۴) پیگاڈونگڈ انگ کی سربراہ نیز انجمن خواتین کی چیرمین تھی۔ اس کے گھر کو آگ لگا دی گئی، پھر اسے قتل کر کے اس کی لاش آگ میں پھینک دی گئی۔ اس کی ایک برس کی بچی کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

یہ واقعات مشتے نمونہ از خروارے ہیں۔ پنڈت نہرو نے لوک سبھا میں ان الزامات کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے اور کہا ہے کہ بھارتی فوجوں نے کہیں بھی کوئی ظلم نہیں کیا، لیکن وہ مسٹر فیزو کے اس مطالبے پر طرح دے گئے کہ ناگاؤں اور بھارتیوں پر مشتمل ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو ناگاؤں پر توڑے جانے والے مظالم کی تحقیقات کرے اور ان حالات کا جائزہ لے جن میں ناگا لینڈ کے باشندے زندگی بسر کر رہے ہیں، بین الاقوامی پریس کو بھی کمیشن کے ساتھ جانے کی اجازت دی جائے۔

پنڈت نہرو کی یہ تردید اپنے اندر کوئی وزن نہیں رکھتی۔ فوجیں کسی علاقے کو فتح کرنے کے بعد وہاں جو کچھ کرتی ہیں اس سے کون بے خبر ہے؟ اور یہ بات بھی کون نہیں جانتا کہ فاتح فوجیں کسی ملک میں داخل ہوتی ہیں تو اس ملک کا کوئی باشندہ ان کی ستم رانیوں سے محفوظ نہیں رہتا، چاہے وہ جنگ کے قابل ہو یا معذور، غیر مصافی عورتیں تو سب سے زیادہ ان کی وحشت ناکیوں اور ہوس رانیوں کا ہدف بنتی ہیں۔ ہزاروں برس پہلے جب انسان تہذیب و

تمدن کی اس روشنی سے نا آشنا تھا جس نے آج ایک دنیا کی آنکھیں خیرہ کر رکھی ہیں، اس وقت بھی مفتوح قوم کی عورتوں سے وہی سلوک ہوتا تھا آج جبکہ تہذیب جدید نے بڑے حسین و جمیل جنگی ضابطے اور دلکش فلسفے تراش لیے ہیں، ان کے ساتھ کیا جا رہا ہے۔ فاتح فوجیں، مفتوحہ ممالک میں اپنی سنگینوں ہی کے لیے خراج حاصل نہیں کرتیں بلکہ اپنی عشرت سامانیوں کا سرمایہ بھی حاصل کرنا اپنا حق سمجھتی ہیں۔ جب وہ کسی بستی اور قریہ میں داخل ہوتی ہیں تو ان کے ہاتھوں نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے نہ مال اور نہ عصمت و ناموس۔ اور یہ تو ہم فاتح فوجوں کا ذکر کر رہے ہیں جو دشمن کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوتی ہیں، وہ فوجیں بھی جو کسی علاقے میں فاتح کی حیثیت سے نہیں بلکہ دوست اور اس کے نجات دہندہ کی حیثیت سے داخل ہوتی ہیں، ان کی دست درازیوں سے بھی اس دوست قوم کی جان و مال اور عصمت و ناموس نہیں بچتی۔

دوسری عالمگیر جنگ میں اشتراکی روس کے فوجیوں نے اشتراکی یوگوسلاویہ میں عام خواتین کے ساتھ ہی نہیں وہاں کی کمیونسٹ خواتین کے ساتھ جس قسم کا شرمناک سلوک کیا اور بدکاری و بدکرداری کا مظاہرہ کیا۔ اس پر کمیونسٹ یوگوسلاویہ کے رہنما اور موجودہ صدر مارشل ٹیٹو تک چیخ اٹھے تھے۔ یہ اشتراکی فوجی، یوگوسلاویہ میں دشمن یا فاتح کی حیثیت سے نہیں ایک دوست کی حیثیت سے آئے تھے اور جرمنی کے خلاف جنگ میں یوگوسلاوی کمیونسٹ ان کے دوش بدوش حصہ لے رہے تھے۔ مارشل ٹیٹو نے اشتراکی روس کی کمیونسٹ فوج کے اخلاق کا ذکر مدت ہوئی ایک بیان میں اس طرح کیا تھا:

"جنگ کے دوران میں سرخ فوج کے کچھ دستے شمالی یوگوسلاویہ کی جانب سے جرمنی پر یلغار کر رہے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ انہوں نے بڑی جوانمردی سے جنگ کی اور بھاری نقصانات اٹھائے، مگر ساتھ ہی ساتھ جب یہ فوج یوگوسلاویہ سے گزر رہی تھی

اس کے اکثر افسروں اور عام فوجیوں کا اخلاق ہمارے عوام کی امیدوں کے بالکل برخلاف تھا۔ یہ دستے جہاں سے گزرے، عوام ان سے شاکی رہے۔ بہت سی عورتیں ان کی ہوس رانیوں کا شکار ہوئیں۔ کئی عورتوں کی انہوں نے جبراً عصمت دری کی اور لوٹ مار اور غارت گری کے بھی بہت سے واقعات رونما ہوتے۔ پہلے پہل ہم نے ان واقعات کو عام لوگوں سے چھپانے کی کوشش کی۔ مگر یہ روز بروز بڑھتے ہی گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے عوام کے دل میں سرخ افواج اور سوویٹ یونین کی قدر و منزلت گھٹ گئی اور ہمیں اپنی سیاسی راہ پر پیش قدمی میں سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ ہم دورانِ جنگ ہی میں نہیں، مدتوں پہلے سے سرخ افواج کا تصور اپنے عوام کے دلوں میں کچھ اور ہی بٹھاتے رہے تھے۔

ہمیں اپنے ذمہ دار افراد کی جانب سے جو اطلاعات پہنچائی گئیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرخ فوج کے افسروں اور فوجیوں نے ۱۲۱۹ یوگوسلاوی عورتوں کی جبراً عصمت دری کی، ۳۲۹ خواتین کو وہ اپنی ہوس رانی کا شکار بنانے میں ناکام رہے، ایک سو گیارہ عورتوں کو اپنی ہوس کا شکار بنانے کے بعد انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا لوٹ مار اور ڈکیتی کی بارہ سو چالیس وارداتوں کا ارتکاب کیا گیا۔ وجوڈونیا کاونٹی کی کمیٹی کی منتظمہ کو بھی بدکاری کا نشانہ بنایا، حتیٰ کہ نیشنل کمیٹی کے ایک رکن کی بیوی بھی ان سے محفوظ نہ رہ سکی۔ بلغراد میں زنا بالجبر کے کئی واقعات ہوتے۔ اکتوبر ۱۹۴۴ء میں جب بلغراد میں جنگ ہو رہی تھی، چھٹے ریکارڈ ڈویژن کی ایک لڑکی اگلی صف میں چند احکامات پہنچانے جا رہی تھی کہ ایک روسی کیپٹن نے چاقو دکھایا۔ جب وہ بے ہوش ہو گئی تو اس سے ارتکاب فعل کیا۔ کسکار کا کی کمیونسٹ پارٹی کی ایک رکن خاتون کی کئی روسی فوجیوں نے یکے بعد دیگرے عصمت دری کی۔ ایک لڑکی ایسی ہی درندگی کا شکار ہونے کے بعد سیاسی سرگرمیوں ہی سے دامن کش ہو گئی۔ کسکار کا کے ایک شہری نے سرخ فوج کے چند افسروں کو دعوت دی۔ کھانے کے بعد فوجی افسروں نے اس کی آنکھوں کے سامنے ہی اس کی بیوی پر مجرمانہ حملہ کر دیا۔ جب اس

شخص نے مزاحمت کی تو روسی فوجیوں نے اسے گھر کے باہر پھینک دیا۔ دوسرے لوگوں کے مدد کو پہنچنے تک، اس کی بیوی سات درندوں کا شکار ہو چکی تھی۔

اور جب سوویٹ ملٹری جنرل سے اس امر کی شکایت کی گئی تو اس نے تمام واقعات کو بے بنیاد اور من گھڑت قرار دیا۔

درندگی کی یہ داستان اس نظریہ حیات کے علمبرداروں کی ہے جو دنیا کو امن کا گہوارہ اور جنت بنانے کے مدعی ہیں اور اس درندگی کی شکار ہونے والی عورتوں کا دشمن قوم سے تعلق نہ تھا بلکہ وہ دوست قوم کی بیٹیاں تھیں اور صرف یہی نہیں بلکہ اس نظریہ حیات کی مومنہ تھیں اور اس کے لیے جدوجہد کر رہی تھیں جس کے مومن وہ خود تھے۔

دنیا کی تاریخ میں صرف ایک قوم ایسی نظر آتی ہے جو مؤرخین کے بقول نصف صدی کے اندر اندر نصف دنیا پر چھا جاتی ہے۔ اس عرصے میں وہ سینکڑوں جنگیں لڑتی ہے اور سینکڑوں شہر اور بستیاں اس کے قبضے میں آتی ہیں، لیکن اس کے فوجیوں کے پاکیزہ اور شفاف اجلے دامن پر ایک داغ بھی پڑنے نہیں پاتا جس پر کوئی حرف گیری کر سکے۔ دنیا نے دیکھا ہے کہ جب فاتح فوجیں اندرون ملک میں آگے بڑھتی ہیں تو راہ میں آنے والی بستیاں بالکل خالی ہو جاتی ہیں، لوگ باگ اپنی جانیں اور عزت و آبرو بچانے کے خیال سے جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے ہیں، لیکن جب اس قوم کی فوجیں ملک اور علاقے فتح کرتی بڑی بڑی سلطنتوں اور تہذیبوں کو تہ و بالا کرتی بڑھ رہی تھیں تو آسمان نے یہ نظارہ کیا کہ مفتوح قوموں کے افراد ان کی یلغار کی خبر سن کر بھاگنے کے بجائے استقبال کر رہے ہیں اور جب انہیں حالات سے مجبور ہو کر کسی شہر کو خالی کرنا پڑا ہے، تو اس کے باشندوں کو گریہ و زاری اور یہ دعائیں کرتے ہوئے پایا ہے کہ اللہ تمہیں اس شہر میں واپس لائے۔

تاریخ میں کسی دوسری فوج کا ذکر نہیں ملتا جس کا گزر کسی غیر علاقے میں ہوا ہو اور اس کے

ہاتھوں اس شہر کے باشندوں کی جان و مال اور اس کی عورتوں کی عصمت محفوظ رہی ہو ۔۔
لیکن اس قوم کی فوجیں جہاں بھی گئیں، وہاں کی عورتوں نے انہیں اپنی عزّت و عصمت کا محافظ
اور پاسبان سمجھا۔ ان کی پاکیزگیٔ قلب و نظر اور طہارتِ کردار کا یہ عالم تھا کہ شام کے
ایک شہر ۔۔ حمص ۔۔ میں داخل ہوتی ہیں تو شہر کا سارا حسن و جمال مکانات کی چھتوں
پر امڈ آتا ہے مگر ان کے جوان نظریں جھکائے شہر کے بازاروں میں سے اس طرح گزر
جاتے ہیں کہ انہیں یہ پتہ تک نہیں چلتا کہ جو قوم ان کے تیر و سنان کی تاب نہیں لا سکی
تھی اس کی عورتوں نے انہیں اپنے دامِ حسن میں پھانس کر ان کے کردار کی شکست کے
لیے کیا تدبیر کی تھی!

ایسا پاکیزہ لشکر اور ایسی بلند اخلاق فوج، نوعِ انسان کی پوری تاریخ پیش کرنے
سے قاصر ہے! اور یہ وہ قوم تھی جو اللہ اور اس کے رسول حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم پر
ایمان لائی تھی اور اسلامی نظامِ حیات کو دنیا میں نافذ کرنے کے لیے عرب کے صحراؤں
سے اٹھی تھی اور کردار و اخلاق کی یہی وہ عظمت و قوّت تھی جو اسلام کی تعلیمات نے
اس کے اندر پیدا کی اور جس کے آگے قوموں کی قومیں سرنگوں ہوتی چلی گئیں ۔

(۲۰ر اگست ۱۹۶۰ء)

مذہب اور قاطع رنگ و نسب

امریکہ مغربی تہذیب کا امام ہے، سائنس اور تمدن کے میدان میں دنیا بھر سے بڑھا ہوا اور روشن خیالی اور ترقی پسندی کی ان رفعتوں پر پہنچا ہوا کہ ایک دنیا اس کی تقلید میں مری جارہی ہے اور سمجھتی ہے کہ جو فکر و نظر، تہذیب و ثقافت اور معاشرت و سیاست میں اس کا مقلد نہیں وہ پس ماندگی اور رجعت پسندی کی دلدل سے نکل ہی نہیں سکتا۔ خود امریکہ کے باشندوں کو اپنی تہذیب و ثقافت اور روشن خیالی و ترقی پسندی پہ ناز ہے۔ وہ اپنے آپ کو دنیا بھر میں انسانی حقوق کا محافظ اور انسانی مساوات کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ اسی امریکہ کی ریاست فلوریڈا کے شہر جیکسن ول کی تازہ ترین خبر ہے کہ وہاں حبشیوں اور گوروں میں شدید تصادم ہو گیا ہے اور اس تصادم کے بعد شہر کے مختلف اطراف میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔

فسادات کا سبب یہ ہے کہ حبشیوں نے رنگ دار لوگوں کے تحفظ کے لیے ایک ایسوسی ایشن بنا رکھی ہے۔ اس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک گرجا میں انہوں نے ایک اجلاس منعقد کیا جس میں فیصلہ کیا کہ نسلی تفریق اور لونی امتیاز کے خلاف پرامن جدوجہد کی جائے۔ یہ خبر گوروں کے کانوں تک پہنچی تو وہ آپے سے باہر ہو گئے۔ انہوں نے لاٹھیاں، ڈنڈے اور کلہاڑیاں سنبھالیں اور گروہ در گروہ حبشیوں کو اس جسارت کا مزا چکھانے نکل کھڑے ہوئے۔ ایک گروہ نے جو ایک سو افراد پر مشتمل تھا ہاتھوں میں جھنڈے اٹھا رکھے تھے جن پر جلی حروف میں "نسلی علیحدگی" لکھا ہوا تھا جس کالے کو دیکھا اس پر پل پڑے۔ جواب

میں کالے بھی منظم ہو کر میدان میں اُتر آتے اور پھر وہ رن پڑا کہ پولیس کی مداخلت ہی سے رک سکا۔

جیکسن ول کے حبشیوں پر کیا منحصر ہے، امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں ہر جگہ یہی حال ہے کہ حبشی بنیادی شہری حقوق سے محروم ہیں اور گوری آبادی باوجود پے در پے مطالبات کے انہیں اُن حقوق سے نوازنے پر آمادہ نہیں۔ ان ریاستوں میں حبشیوں کی حیثیت ازمنۂ وسطیٰ کے غلاموں سے کسی صورت بہتر نہیں۔ ان ریاستوں میں وہ آزادی کے ساتھ چل پھر سکتے ہیں نہ خاطر خواہ ذریعۂ معاش اختیار کر سکتے ہیں۔ بعض ریاستوں میں وہ ووٹ دینے کے حق سے بھی محروم ہیں۔ ان کے ساتھ زندگی کے ہر معاملے میں نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ ان کے لیے سینما اور تفریح گاہیں الگ الگ ہیں۔ ان کے بچے، گورے بچوں کی درس گاہوں میں تعلیم حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ گورے لوگوں کے ہوٹل میں کھانا نہیں کھا سکتے۔ کوئی گورا انہیں اپنا مکان کرایے پر نہیں دیتا۔ ان ریاستوں کا قانون بھی ان کے ساتھ امتیازی برتاؤ کرتا ہے۔ جن جرائم کی پاداش میں گوروں کو محض سزائے قید دی جاتی ہے، حبشیوں کو موت کی سزا ملتی ہے۔ پھر گورے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور حبشیوں کو معمولی معمولی جرموں پر سنگسار (LYNCH) کر دیتے ہیں۔ امریکی دستور اگرچہ حبشیوں کو گوروں کے برابر حقوق دیتا ہے مگر جنوبی ریاستوں کے نزدیک دستور کی وہ دفعات قطعی ناقابلِ عمل ہیں جو حبشیوں کو گوروں کی صف میں کھڑا کرتی ہیں اور جب بھی دستور کی ان دفعات کے تحت کسی کالے نے اپنا حق لینے کی کوشش کی، جنوبی ریاستوں کے گورے باشندوں نے ان دفعات کو تسلیم کرنے اور ان کے آگے سر جھکانے سے انکار کر دیا۔ گزشتہ سے پیوستہ سال کی بات ہے البامہ کی ایک حبشی لڑکی کو ایک گورے اسکول نے داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا اس پر اس نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ معاملہ بڑھتے بڑھتے سپریم کورٹ تک پہنچا

سپریم کورٹ نے فیصلہ لڑکی کے حق میں دیا اور متعلقہ اسکول کو حکم دیا کہ وہ اس لڑکی کو داخل کرنے سے انکار نہ کرے۔ اس پر گورے تن گئے اور الباما کے گورنر نے لڑکی کو اسکول میں داخل ہونے سے روکنے کے لیے پوری ریاست کے وہ اسکول بند کر دیئے۔ جہاں خالص گوری چمڑی کے طلبہ پڑھتے تھے۔ یہی کیفیت بعض دوسری جنوبی ریاستوں میں پیدا ہو گئی۔ سپریم کورٹ حکم پر حکم دے رہی تھی مگر گوروں کا جواب تھا "پنچوں کا کہا سر آنکھوں پہ، مگر پرنالہ وہیں رہیگا۔"

— اور پرنالہ ابھی تک وہیں ہے۔ حبشیوں کے ساتھ امتیازی سلوک ہی نہیں جذبۂ انتقام برتاؤ بدستور ہو رہا ہے اور گوروں میں اس جذبے کی اتنی فراوانی ہے کہ بیرونی ملکوں کے معزز مہمان بھی اگر بھولے چوکے ان علاقوں میں پہنچ جاتے ہیں تو محض اس بنا پر کہ ان کا رنگ گورا نہیں ہوتا ان کے ساتھ حبشیوں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے۔ ایک معاصر کے نمائندہ خصوصی نے اپنے مکتوب واشنگٹن میں لکھا ہے:

"پاکستانی سفارت خانے کے اقتصادی وزیر مسٹر وزیر علی اپنے اہل و عیال سمیت امریکہ کی جنوبی ریاست جارجیا میں سیر و تفریح کی غرض سے گئے۔ انہوں نے اٹلانٹا شہر کے نزدیک پڑنے والی ایک ٹیسٹ پارک میں رات گزارنا چاہی۔ سپرنٹنڈنٹ سے کیمپ لگانے کے لیے زمین کرایہ پر مانگی لیکن اس نے یہ کہہ کر جگہ دینے سے انکار کر دیا کہ وہ عام حبشیوں کی طرح ہیں اور عام امریکی لوگ جو یہاں پارک میں تفریح کے لیے قیام کر رہے ہیں وہ ان کی رنگت اور خدوخال کی وجہ سے ممکن ہے انہیں حبشی سمجھنے لگیں۔ اس لیے یہ بات نہ ان کے تحفظ کے لیے اچھی ہے نہ میرے لیے۔"

مسٹر وزیر علی آزردہ خاطر وہاں سے چلے آئے اور قریبی شہر کے ایک ہوٹل میں رات گزاری۔ — یہ تو ہم امریکہ کی جنوبی ریاستوں کی بات کر رہے ہیں۔ خود واشنگٹن میں بھی ایسے بے شمار

امریکہ موجود ہیں جو کالی رنگت کے افراد کو اپنے گھروں میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دیتے
اسی مکتوب نگار نے چند مسلمان افریقی طلبہ کے ساتھ ایک ایسے ہی تلخ واقعے کا ذکر کیا ہے
جس سے وہ واشنگٹن میں دوچار ہوتے ہیں۔ یہ طلبہ امریکہ تخیر سگالی کے دورے پر آئے ہوئے
ہیں مس گیلی کونسبری نے جو افریقن امریکن انسٹی ٹیوٹ کے ماہانہ رسالے "اسپیشل رپورٹ"
میں نائب مدیر کی حیثیت سے کام کرتی ہیں، ان کو پارٹی پر بلایا۔ چار طلبہ وقتِ معیّن پر آئے
انہیں دیکھتے ہی مکان کی سپرنٹنڈنٹ فرانسس ہی کٹ نے روکا اور صاف صاف کہہ دیا کہ یہ
مکان حبشیوں کے لیے نہیں ہے، نہ وہ بطور مہمان آسکتے ہیں۔ دو طالب علم تو سُنی اَن
سُنی کر کے اوپر مس کونسبری کے فلیٹ کی طرف چلے گئے، باقی دو مسٹر زکریا یوسف (جمہوریہ
جمہوریہ چاڈ کے شہری ہیں) اور عدنان احمد (جمہوریہ صومالیہ) واپس چلے گئے۔ مکان کی
سپرنٹنڈنٹ، مس کونسبری کے فلیٹ میں پہنچی اور غصّے میں بے قابو ہوتے ہوئے چلائی
"حبشیو! یہاں سے نکل جاؤ" چنانچہ یہ پارٹی بدمزگی میں ختم ہوگئی۔

اگلے روز مس کونسبری کو مکان کی سپرنٹنڈنٹ نے نوٹس دے دیا کہ وہ تیس دن کے اندر
اندر مکان خالی کر دے۔ کیونکہ مکان محض رہائش کے لیے ہے، پارٹیاں دینے کے لیے نہیں!

یہ ہے عصرِ حاضر کے امام تہذیب و تمدن ملک اور معاشرے کا سراپا۔ یہ معاشرہ ان معاشروں
میں سے ایک ہے جن کا دعویٰ ہے کہ انسانیت کے دکھوں کا درماں انہی کے پاس ہے۔
اسی کرۂ ارض پر ایک معاشرہ ایسا بھی گزرا ہے جس میں آدمی سے زیادہ دنیا کی مختلف نسلوں
اور رنگوں سے تعلق رکھنے والی قومیں شامل تھیں لیکن نسل و رنگ یا قوم و وطن کی بنا پر اس
معاشرے میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا جاتا تھا۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس میں ایک کالے کلوٹے
حبشی بلال رضؓ کو بڑے بڑے شرفاء سے بڑھ کر عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا
اس لیے کہ اس نے اللہ کے دین کو ان شرفاء سے پہلے قبول کیا تھا اور حق کی راہ میں

گوناگوں مصائب جھیلے تھے۔ مسجد الحرام کے بعد اس معاشرے کی مقدس ترین عبادت گاہ مسجدِ نبوی کا وہ مؤذن تھا جس کے بارے میں اس معاشرے کے عظیم و جلیل فرد (عمرؓ بن خطاب) کہا کرتے تھے کہ بلالؓ ہمارے سردار ہیں۔ جب انہوں نے نکاح کرنا چاہا تو جس طرف پیغام لے کر جاتے تھے گردنیں خم ہو جاتی تھیں کہ ہمیں یہ رشتہ منظور ہے اور جب وہ فوت ہوئے تو عمر فاروقؓ نے باچشمِ تر فرمایا "آج ہمارا آقا دنیا سے اٹھ گیا۔"

یہ وہ معاشرہ تھا جس میں ایک فارسی غلام (سلمانؓ) کو اس معاشرے کے بانی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اہلِ بیت کا ایک فرد بنایا تھا۔ اسی معاشرے میں ایک غلام صہیب رومیؓ تھے جنہیں لسانِ رسالت سے نعم العبد کا خطاب عنایت ہوا۔ یہ وہ معاشرہ تھا جس میں غلام اور حبشی حکومت و اقتدار کے مناصب پر فائز ہوتے اور بڑے بڑے شریف گھرانے ان کی انقیاد و اطاعت پر فخر محسوس کرتے تھے۔ ائمہ تابعین اور تبع تابعین پر نظر ڈالیئے۔ آپ کو ان صلحاء اور اتقیاء کی صف میں اکثر وہ لوگ نظر آئیں گے جو کسی اور معاشرے کے فرد ہوتے تو ان کی حالت اس سے کچھ مختلف نہ ہوتی جو آج کے مہذب اور ترقی یافتہ امریکہ میں حبشیوں کی ہے۔ امریکہ کے کالے ان غلاموں کی اولاد ہیں جنہیں امریکی نوآبادکار اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں افریقہ سے پکڑ کر لے جاتے اور وہاں مویشیوں کی طرح بیچ ڈالتے تھے۔ اُمتِ مسلمہ کے یہ گلہائے سرسبد بھی یا تو غلام تھے یا ان غلاموں کی اولاد جو روم و ایران اور شمالی افریقہ میں اسلامی فتوحات کے نتیجے میں مسلمان افواج کے ہاتھ آئے تھے۔ ان میں کالی رنگت والے حبشی بھی تھے اور سفید چمڑی والے رومی اور ایرانی بھی اور پھر عربوں اور ان قوموں سے تعلق رکھنے والی باندیوں کے اختلاط سے پیدا ہونے والے افراد بھی، لیکن اسلامی معاشرے میں انہیں وہ مقامِ بلند و عظیم حاصل تھا کہ رنگ و نسل کے امتیازات میں ڈوبے ہوئے لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہ وہ گل و لالہ ہیں جن کے بغیر اس چمن کی بہارِ جانفزا کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کیا جا سکتا، جنہوں نے اس اُمت کی دینی تہذیبی اور سیاسی

تاریخ بنانے میں اعلیٰ نسل و نسب کے آزاد عربوں سے کم حصہ نہیں لیا۔ جو اپنے عہد میں مرجع خلائق تھے، جن کی طرف علم کے پیاسے اسلامی سلطنت کے دور دراز گوشوں سے آیا کرتے تھے، بڑے بڑے اونچے گھرانوں کے لوگ، امراء، اعیانِ سلطنت حتیٰ کہ خلفاء تک جن کی کفش برداری اپنے لیے باعثِ فخر و ناز سمجھتے تھے اور ان سے ذہن و قلب کی آسودگی اور طمانیت کا سرمایہ حاصل کرنے کے لیے ان کے آستانوں پر حاضر ہوتے تھے۔

انہی عظیم لوگوں میں حسنؒ بصری ہیں۔ جامع کمالات، بلند مرتبت عالم، ظاہری اور باطنی اوصاف کا دلکش و جمیل پیکر۔ اُمّ المؤمنین حضرت اُمّ سلمہ کے سایۂ شفقت میں پلے۔ بڑے ہی عابد و زاہد۔ وہ شجرِ طوبیٰ جس سے تصوّف کی تمام شاخیں پھوٹیں، آج تک جتنے اکابر صوفیاء گزرے ہیں سب انہیں شیخ الشیوخ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ابو حازم سلمہؒ بن دینار ہیں۔ مومن قانت، حق گو، حق پسند، سلک کی مذمّت میں کسی ملامت گر کی پروا نہ کرنے والے، ایک دنیا ان کی مجلس میں حاضر ہو کر فیض یاب ہوتی ہے، خلیفۂ وقت تک حاضری دیتا ہے اور اپنے بیمار قلب و نظر کا مداوا چاہتا ہے۔ وہ خلیفہ کے منہ پر بلے لاگ باتیں کہتے ہیں۔ ایسی باتیں جنہیں سن کر اس کے مصاحب تلملا اُٹھتے ہیں، لیکن وہ ذرا مداہنت نہیں کرتے۔ خلیفہ اپنی حکومت کے بارے میں ان کی رائے پوچھتا ہے اور وہ چند الفاظ میں اس حکومت کی قانونی حیثیت اور اس کے شب و روز کا نقشہ کھینچ دیتے ہیں۔ کہتے ہیں تم لوگ مسلمانوں کے مشورے اور اُمت کی مرضی کے بغیر حکومت و اقتدار پر مسلط ہو گئے ہو، دنیوی اغراض کی خاطر لوگوں کے خون سے کھیلتے اور من مانی کرتے ہو۔۔۔ اور جب خلیفہ کوئی وصیّت کرنے کی درخواست کرتا ہے تو ایسی نصیحت کرتے ہیں کہ اگر اصحابِ اقتدار اس پر کان دھریں تو دنیا میں ایک حیرت ناک انقلاب آ سکتا ہے: "یہ اقتدار جو تمہارے پاس ہے تمہیں اپنے مرنے والے پیشرو سے ملا ہے اور تمہارے ہاتھ سے اسی طرح نکل جائے گا جس طرح تمہارے پیشرو کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔"

وہ ابو عبداللہ مکحولؒ ہیں۔ دمشق کے باشندے۔ اپنے عہد میں عالمِ اسلام کے چار بڑے بڑے علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ علم کے شائقین دور دراز سے آتے اور ان کے حلقہ درس سے بہرہ یاب ہوتے ہیں۔ ان کی عظمت کا یہ حال ہے کہ ایک شہزادہ ان کی مجلسِ درس میں حاضر ہوتا ہے تو مجلس میں حاضر لوگ اسے سب سے آگے جگہ دینے کے لیے کھل کر بیٹھنے لگتے ہیں۔ مکحولؒ انہیں فوراً روک دیتے ہیں اور فرماتے ہیں اپنی جگہ پہ بیٹھے رہو، اسے جہاں جگہ مل جائے گی بیٹھ جائے گا، یہ علم کی مجلس ہے یہاں اسے خاکساری اور عاجزی کے ساتھ حاضر ہونا چاہیئے۔

سعید بن جبیر، ایوب سختیانی، بسر بن سعید، داؤد بن دینار، ربیعہ بن فروخ، زید بن اسلم، سلمہ بن دینار، سلیمان بن یسار، طاؤس بن کیسان، عبداللہ بن عون، عطاء ابن ابی رباح، عمرو بن دینار رحمہم اللہ۔ کہاں تک گنا جائے۔ تاریخ کے ایوان میں علم و عمل کی عظمتوں پر فائز ایسے ہزاروں لاکھوں اصحاب ہر دور اور ہر عہد میں نظر آتے ہیں۔ پھر صرف ایک شعبے میں نہیں ہر شعبۂ زندگی میں غلاموں اور غلام زادوں نے رہنمایانہ کردار ادا کیا، یہاں تک کہ اسلامی تاریخ میں غلام اور ممالیک بادشاہت کے تخت پر بھی جلوہ افروز نظر آتے ہیں۔ اُمتِ مسلمہ میں نسل و نسب اور رنگ و وطن کی بنیاد پر کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اس قسم کے تمام امتیازات کو پاؤں تلے روندنے کا اعلان کر دیا تھا اور فرمایا تھا:

اے لوگو! تم سب کا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک۔ تم سب آدمؑ کی اولاد ہو اور آدمؑ کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ صاحبِ عزت وہ شخص ہے جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہے، کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر کسی قسم کی کوئی برتری نہیں، اگر کوئی برتری ہے تو صرف تقویٰ کی بنا پر۔

(۸ ستمبر ۱۹۹۶ء)

حذر اے چیرہ دستاں!

۱۴ر جولائی کو عراقی فوج کے ایک افسر بریگیڈیر عبدالکریم قاسم نے نوری السعید کی حکومت کا تختہ الٹ دیا، شاہ فیصل اور عبدالالٰہ قتل کر دیے گئے، مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور عراق کو جمہوریہ قرار دے دیا گیا۔ شاہ اور ریجنٹ کے قتل کے بعد گلی کوچوں میں خونریزی ہونے لگی اور سابق حکومت کے حامی مارے جانے لگے۔ نوری السعید اس روز بچ نکلا، اگلے روز عورت کے بھیس میں شہر سے نکلتے ہوئے پکڑا گیا اور لوگوں نے مار ڈالا اور اس کی لاش گلی کوچوں میں گھسیٹی گئی۔

عراق کے اس انقلابِ خونیں پر دنیا بھر میں تبصرے ہوتے ہیں مگر صرف سیاسی نقطۂ نظر سے۔ کس کی ہار ہوئی؟ کون جیتا؟ دوست اشک بار اور اندوہ گیں ہیں کہ ایک دوست مارا گیا جو آڑے وقت میں کام آتا تھا اور جس پر مشرقِ وسطیٰ میں کامل اعتماد کیا جاتا تھا۔ دشمن رقص مسرت کر رہے ہیں، ان کے نعرہ ہائے ابتہاج و نشاط سے دنیا گونج اٹھی ہے کہ جو لوگ ان کے عزائم کی راہ میں حائل تھے ان کا تیا پانچا ہو گیا، اب راستہ صاف ہے یہ خونیں ڈرامہ بچے کھچوں کے لیے نوشتۂ دیوار کا کام دے گا۔

لیکن اس حادثۂ خونیں کا ایک پہلو اور بھی تھا جس کی طرف دوستوں کی نظر گئی نہ دشمنوں کی۔ مادیت پرست اور سیاست زدہ دنیا عبرت کے پہلوؤں پر کم ہی نگاہ رکھتی ہے۔ کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو وہ نفع نقصان کی میزان لگا کر بیٹھ جاتی ہے، لیکن اس

واقعے کے دامن میں عبرت کے جو سبق ہوتے ہیں ان پر نگاہ غلط تک نہیں ڈالتی، عراق کا یہ خونیں انقلاب پکار پکار کر کہہ رہا ہے:

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہو

یہ واقعہ انسان کو متنبہ کر رہا ہے کہ زندگی اور موت کے درمیان کوئی حدِ فاصل نہیں ہے۔ یہ زندگی جو تمناؤں اور آرزوؤں سے لبریز ہے، کسی وقت بھی دم توڑ سکتی ہے۔ قدرت کا غیر مرئی ہاتھ اس طرح آگے بڑھتا ہے کہ خبر اس وقت ہوتی ہے جب انسان کی رگِ جاں اس کی گرفت میں آ جاتی ہے۔ تمنائیں اور آرزوئیں تڑپتی رہ جاتی ہیں اور زندگی موت کی سرحد میں داخل ہو کر ایک نئی دنیا کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہے۔ قدرت کا یہ انتباہ ہر آن جاری ہے مگر انسان پر فریب تمناؤں اور دلکش آرزوؤں میں کچھ اس طرح کھویا ہوا ہے کہ اسے اس انتباہ پر ہوش نہیں آتا۔ امیر مینائی نے قدرت کے اس انتباہ اور انسان کی بے حسی ہی کا خاکہ کھینچا تھا جب کہا تھا: ؎

کیا رنگ جہاں میں ہو رہے ہیں
دو ہنستے ہیں چار رو رہے ہیں
برخاست ہے محفل اور پتنگے
رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر
تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم
یہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ رنگ اور ہم کو
کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں

انسان کی اس بے حسی کو توڑنے اور اسے جھنجھوڑ کر بیدار کرنے کے لیے ایسے عظیم حادثات رونما ہوتے ہیں جو اپنی جانب اس کی توجہ کھینچ لیتے ہیں، مگر اس کی غفلت و سر گرانی کا پھر بھی یہ عالم ہے کہ وہ ان حادثات کو بھی مادی پیمانوں سے تولنے بیٹھ جاتا ہے ـــــ آہ انسان کس قدر ظلوم اور جہول ہے!

عراق کا یہ خونیں انقلاب بادشاہوں، آمروں اور انسان پر خدائی کا سکہ جمانے والوں کو متنبہ کر رہا ہے کہ تمہارا یہ جاہ و جلال عارضی، تزک و احتشام فریب نظر اور اَنا و لاغیری کے دعوے کھوکھلے ہیں۔ تم نے ریت کی بودی بنیادوں پر اپنی خدائی کے محل تعمیر کر رکھے ہیں۔ قدرت کے ایک اشارے پر یہ محل زمین پر آ رہنے والے ہیں۔ تم حکومت و فرماں روائی کی جس قوت پر نازاں ہو، وہی قوت تمہارے گلے کا ہار بن سکتی ہے۔ لوہے میں غرق اور ہلاکت آفریں اسلحہ سے لیس جو لوگ تم نے اپنی جان کی حفاظت کے لیے مقرر کر رکھے ہیں وہی تمہارے لیے فرشتۂ اجل بن سکتے ہیں۔ جن افواجِ قاہرہ کے بل بوتے پر تم بے گناہوں کے خون سے ہاتھ رنگتے ہو، عدل و انصاف کا گلا گھونٹتے ہو، اپنے ہم جنس انسانوں کو ذلیل و محکوم بناتے ہو اور ان کی لاشوں سے اپنی عظمت و جبروت کے مینار تعمیر کرتے ہو، انہی افواجِ قاہرہ کے ہاتھوں تم ذلت کی موت سے دوچار ہو سکتے ہو۔ تم اپنی حکومت و اقتدار کو خضر کی زندگی دینے کے لیے جو تدبیریں کرتے ہو، یہی تدبیریں الٹ کر تمہارے اس اقتدار کی موت کا پیغامبر بن سکتی ہیں۔ ع

خدا رے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(۲۰ جولائی ۱۹۵۸ء)

عراق میں ایک انقلاب اور آیا اور عبدالکریم قاسم سا رسے چار برس تک اَنا و لاغیری

کاؤنٹ کا بجانے کے بعد اپنے قریبی ساتھیوں سمیت اپنی ہی فوج کی گولیوں کا شکار ہو گیا۔ پہلے پہل یہ خبر سنی تو لوحِ ذہن پر نظیر اکبر آبادی کے وہ شعر ابھر آئے جو پانچویں جماعت میں پڑھے تھے

کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

یہ ایک طویل مسدس ہے جس کا صرف ایک بند دھندلا سا شعور کے کسی گوشے میں محفوظ رہ گیا ہے۔ ساتھ ہی وہ منظر بھی ذہن میں ابھر آیا جو اس نظم کو پڑھتے وقت نگاہوں کے سامنے تھا۔ اسے اتفاق ہی کہہ سکتے ہیں، مگر اس منظر نے ہمارے دل و دماغ پر ایک عجیب سی کیفیت طاری کر دی تھی۔ اس نظم میں پوشیدہ درس گویا مجسم صورت میں ہمارے سامنے تھا۔ ہم اسکول گراؤنڈ میں بیٹھے تھے۔ اردو کا پیریڈ تھا۔ ماسٹر صاحب ہمیں یہ نظم پڑھا رہے تھے۔ گراؤنڈ کی سرحد سے ملے ہوئے سبزی کے کھیتوں کے اس پار کچھ مکانات تھے جہاں ایک کہرام برپا تھا۔ مکان کے باہر ایک چارپائی پر لاش پڑی تھی جس کے ارد گرد عورتیں نالہ و بکا میں مصروف تھیں۔ یہ ایک نوجوان تھا جسے رات سوتے میں قتل کر دیا گیا تھا۔ بے جرم و خطا نہیں، بلکہ پہل اس نے کی تھی اور پھر دنیاوی انصاف کی گرفت سے صاف بچ نکلا تھا، مگر انصاف کی ایک عدالت اور بھی ہے جس کے مطابق دیر تو ہوتی ہے اندھیر نہیں ہے، چنانچہ اب اس عدالت کا انصاف عمل میں آگیا تھا۔ نظیر نے کتنی بڑی بات کہی تھی!

جو اور کا اونچا بول کرے اس کا بول بھی بالا ہے
اور دے پٹکے تو اس کو بھی کوئی اور پٹکنے والا ہے
بے جرم و خطا جس ظالم نے مظلوم ذبح کر ڈالا ہے
اس ظالم کے بھی لہو کا پھر بہتا ندی نالا ہے
کچھ دیر نہیں اندھیر نہیں انصاف اور عدل پرستی ہے
اس ہاتھ کرو اس ہاتھ ملے یاں سودا دست بدستی ہے

اس واقعے اور نظم کی یاد تازہ ہوئی تو سوچ کی لہریں ابھرنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ کا اصولِ عدل اس دنیا میں بھی کس طرح کار فرما ہے! سچ ہے اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ ساڑھے چار برس کی مدت بھی کوئی مدت ہے؟ بالکل کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسان بے صبر اور عجلت پسند ہے اور اپنی اس بے صبری اور عجلت پسندی کی بنا پر سمجھتا ہے کہ اللہ کے ہاں اندھیر تو بے شک نہیں ہے لیکن دیر ضرور ہے۔

عبدالکریم قاسم نے انقلاب برپا کیا، تو لوگوں نے کیا کیا رقصِ مسرت نہ کیا اور کیا کیا خوش آئند امیدوں کے محل نہ تیار کیے۔ خود عراقی قوم کے اس نام نہاد بطلِ جلیل اور مردِ انقلاب نے بڑے دلکش اور سحر طراز خواب دکھائے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا فرشتے پردۂ غیب سے نمودار ہو گئے ہیں، ظلم و استبداد کی بھیانک رات کی سحر ہو چلی ہے۔ عدل و انصاف کے ابدی نور سے عراق کی جبیں جگمگا اٹھے گی، لیکن حسین خوابوں کے محل چند روز کے اندر اندر زمین پر آ رہے جبر و استبداد کے اندھیرے اور گھنیرے ہو گئے جنہوں نے دین و اخلاق، تہذیب و شرافت اور انسانیت، غرض زندگی کی ہر عزیز متاع کو نگل لیا۔ عبدالکریم قاسم نے اپنے اقتدار کو بقائے دوام بخشنے کے لیے قاتلوں اور بدمعاشوں کو کھلی چھٹی دیے رکھی انہوں نے اہلِ حق کو بے دریغ قتل کیا، مسجدوں کی بے حرمتی کی، عصمتوں کے آبگینے خاک میں ملائے، ظلم کے خلاف بولنے والی زبان کو کاٹا اور اپنی آمریت کی راہ میں حائل ہر جاندار و لیار کو منہدم کیا۔

اقتدار زمین پر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی امانت ہے۔ امانت دار اور آخرت کی جواب دہی سے ڈرنے والے لوگ اس کو اٹھانے سے ہمیشہ دور بھاگتے ہیں اور جب یہ بوجھ ان پر ڈال دیا جاتا ہے تو وہ اسے کپکپاتے ہوئے اٹھاتے ہیں۔ راتوں کی نیند اور دن کا چین ان پہ حرام ہو جاتا ہے اور وہ ہر وقت اس بات کے خواہاں رہتے ہیں کہ کوئی اللہ کا بندہ آئے اور ان کا یہ بوجھ خود اٹھا لے ــــ لیکن خائن، کتوں کی طرح اس کی طرف لپکتے

ہیں، ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے اور کاٹتے ہیں اور اسے صرف اپنے قبضے میں رکھنے کی جدّوجہد میں اپنی ساری زندگی کھپا دیتے ہیں۔ امانت دار اور خدا ترس حکمران ایک گلہ بان کی طرح ہوتا ہے جو اپنے گلّے کے ایک ایک چھوٹے بڑے جانور کی نگہبانی کرتا ہے انہیں سرسبز و شاداب چراگاہوں میں چرانے کی کوشش کرتا ہے، چور اچکّوں اور درندوں سے بچاتا ہے، لیکن خائن حکمران جن لوگوں پر مُسلّط ہوتے ہیں: انہیں درندوں کی طرح چیرتے پھاڑتے اور اپنی حرص و ہوس کا نشانہ بناتے ہیں، اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے استبداد کے کوڑے کو تیزی اور بے رحمی سے حرکت دیتے ہیں۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ عزّت و عظمت کی زندگی اس امانت کو امانت سمجھنے، لوگوں کے ساتھ رحمت و شفقت سے پیش آنے اور ان کی خدمت گزاری اور غم گساری میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات بڑی رحیم و شفیق ہے۔ وہ اپنے بندوں پر کفر کا تسلّط تو گوارا کر لیتی ہے، لیکن ظلم کی حکومت کو کبھی برداشت نہیں کرتی۔ کبر اور بڑائی اللہ تعالیٰ کی چادر ہے۔ جو شخص اس چادر کو اپنا اوڑھنا بناتا اور بے گناہوں کے لہو سے ہولی کھیلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو پارہ پارہ کر دیتا ہے۔ وہ اپنی کبریائی کے تصوّر میں اندھا ہو کر ہر اس دروازے کو بند کر دیتا ہے جسے اپنے اقتدار کے لیے ذرا سا بھی خطرہ سمجھتا ہے، لیکن اپنی ساری ہوشیاری و عیّاری کے باوجود اس ایک دروازے کو بند نہیں کر پاتا جسے اللہ اس کی سرکوبی کے لیے چن لیتا ہے۔ یہی دروازہ عبدالکریم قاسم بھی بند نہ کر سکا اور وہ عبرت ناک حشر سے دوچار ہوا اور یہ تو وہ سزا ہے جو اسے صرف دنیا میں ملی، اس نے ہزاروں بے گناہوں کو جس طرح موت کے گھاٹ اتروایا اور ملک میں جس نظام کی بنیاد رکھی اس نے اپنی خرابیوں اور مفاسد سے ایک مسلمان قوم کی اجتماعی زندگی کو جس طرح تباہ کر کے رکھ دیا ہے اس کی سزا سینے میں لگنے والی محض ایک گولی نہیں ہو سکتی۔ اس کی ٹھیک ٹھیک سزا تو اسے آخرت ہی میں ملے گی۔

انقلاب اے انقلاب!

افغانستان کی خبر ہے کہ اب کے تیسواں جشنِ استقلال اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لانے والوں نے اپنی عورتوں کو بے نقاب کر کے بازاروں اور محفلوں کی زینت بنا کر منایا۔ اس تقریب پر سینکڑوں افغانی خواتین گلی کوچوں میں کھلے بندوں پھرتی رہیں اور وہی افغان مسلمان جنہوں نے کوئی تیس بتیس برس پہلے ملکہ ثریا کے بے نقاب فوٹو دیکھ کر امان اللہ خان کی حکومت کا تختہ الٹ دیا تھا، راوی کا بیان ہے کہ وہ اپنی عورتوں کو بے پردہ بازاروں میں سرگشت کرتے دیکھ کر خوش تھے اور اپنے اس ارتقاء پر کلماتِ ابتہاج و مسرت بلند کر رہے تھے۔

انقلاب! انقلاب اے انقلاب!

اقبال مرحوم کی روایت ہے کہ افغانیوں کی غیرتِ دین ابلیس کو بڑی کھلتی تھی؛ چنانچہ اس نے اپنے سیاسی فرزندوں کے نام فرمان جاری کرتے ہوئے کہا تھا:

افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج
مُلّا کو اس کے کوہ و دمن سے نکال دو

مُلّا تو افغانستان کے کوہ و دمن میں آج بھی موجود ہے مگر افغانیوں کی غیرت کا جنازہ نکلا جا رہا ہے۔ جن اربابِ تقدس کا ارشاد ہے کہ سیاست اہلِ دین کے لیے شجرِ ممنوعہ ہے اور اہلِ ورع و تقویٰ کو اقتدار سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیے اور بس وعظ و ارشاد

کی مسند بچھا کر اور تزکیۂ نفس کی خانقاہیں کھول کر بیٹھ جانا چاہیئے، ان کے لیے یہ خبر اپنے دامن میں بڑا درسِ عبرت رکھتی ہے۔ اقتدار و حکومت — اور وہ بھی آج کے زمانے میں جبکہ وہ پوری انسانی زندگی پر چھاتے جارہے ہیں — کسی قوم کی اجتماعی زندگی کو کس طرح متاثر کرتے ہیں، اس کے فکر و نظر کے زاویوں اور جذبات و احساسات کے دھاروں کو کس طرح بدل دیتے ہیں اور اقتدار سے محروم وعظ و ارشاد کے اثرات کتنے بے مایہ اور نقش بر آب ہوتے ہیں، اس خبر سے شاید ان کی آنکھیں کھل سکیں۔ ع

عبرتے از سر گزشتِ ما بگیر

افغانستان "پس ماندہ" اور تہذیب و تمدّن سے عاری ملکوں میں گنا جاتا تھا اور اس کے لیے "فرشتۂ تہذیب" کی سخت ضرورت محسوس کی جاتی تھی اس لیے کہ بقول اقبالؒ

جہاں قمار نہیں، زنِ تنک لباس نہیں
جہاں حرام بتاتے ہیں شغلِ مے خواری
بدن میں گرچہ ہے ایک رُوحِ ناشکیب و عمیق
طریقۂ اَب و جد سے نہیں ہے بیزاری
جسور و زیرک و پُردم ہے بچۂ بدوی
نہیں ہے فیضِ مکاتب کا چشمۂ جاری
نظر وران فرنگی کا ہے یہی فتویٰ
وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری

اب معلوم ہوتا ہے کہ "فرشتۂ تہذیب" نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے اس "پسماندہ" سرزمین کو نواز دیا ہے ہمیں یہ تو خبر نہیں کہ افغانستان میں قمار و مے خواری کی برکات کا کیا عالم ہے البتہ اتنا جانتے ہیں کہ "جسور و زیرک و پُردم" "بچۂ افغان" زنگی و اشتراکی مکاتب

کے فیض سے بہرہ ور ہو چکا ہے اور اس فیض کی بدولت وہ اغیار کا آلۂ کار بن چکا ہے۔ اب اس خبر سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ اس میں طریقۂ آب وجد سے بیزاری بھی پیدا ہو گئی ہے۔ وہ اپنی عورتوں کو گھر کی چار دیواری سے باہر کھینچ لایا اور اس ارتقاء پر شاداں و فرحاں ہے اور پھولے نہیں سمارہا ہے۔ ابھی آغاز ہے اس لیے یہ افغان مسلمات زیادہ تر ڈھیلے ڈھالے لباس میں ملبوس ہوں گی، کوئی دن کی بات ہے آپ سنیں گے کہ اس کی جگہ تنگ لباس اور نیم عریانی نے لے لی ہے۔

مسلمان ملکوں نے آزادی کا اوّلین تقاضا یہ سمجھ رکھا ہے کہ طریقۂ آب وجد سے بیزار ہو کر مغربی طور طریق اختیار کر لینے چاہئیں۔ جونہی وہ آزادی کی نعمت سے بہرہ ور ہو کر تعمیر و ترقی کی راہ میں پہلا قدم رکھتے ہیں اپنی عورتوں کو گھروں سے باہر نکال لاتے ہیں اور مغربی طرزِ معاشرت لباس، وضع قطع اور رقص و سرود کے فروغ میں لگ جاتے ہیں۔ شام اور عراق، فرانس اور برطانیہ کے انتداب سے آزاد ہوئے تو انہوں نے پہلا قدم عورتوں کو بے نقاب کرنے کی صورت میں اٹھایا۔

مراکش کو آزادی نصیب ہوئی تو وہاں بھی پہلا جشنِ آزادی چہروں سے نقاب اتار پھینکنے کی شکل میں منایا گیا۔ بسم اللہ شاہ مراکش کی صاحب زادی نے قربانی اور ان کے تتبع میں دیکھتے ہی دیکھتے نقاب چہروں سے اتر آئے۔ تونس نے بھی اپنی آزادی کا شکرانہ عورتوں کو بے پردہ کر کے ادا کیا۔ افغانستان بھی انگریزوں کی سیاسی بالادستی سے آزاد ہو جانے کے بعد امان اللہ خان کی قیادت میں اس راہ پر گامزن ہوا تھا۔ مگر امان اللہ خاں اس نصیحت کو فراموش کر گئے جو ایک فرنگی لارڈ نے اپنے فرزند عزیز کو اور اس کی وساطت سے فرنگ زدوں کو مشرقی قوموں کو آب وجد کے طریقے سے بیزار اور ان کی ملی خودی قتل کرنے کے سلسلے میں کی تھی۔

سینے میں رہے رازِ ملوکانہ تو بہتر!
کرتے نہیں محکوم کو تیغوں سے کبھی زیر
تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر
تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر

انہوں نے ملتِ اسلامیہ افغانیہ کی خودی کو تعلیم کے تیزاب میں ڈالے بغیر اسے فرنگی تہذیب کے سانچے میں ڈھالنا چاہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ڈھلنے سے انکار کر دیا اور امان اللہ خاں کو تخت و تاج سے محروم ہو کر یورپ کی راہ لینی پڑی۔

امان اللہ خاں کے جانشین اس معاملے میں ان سے زیادہ ہوشمند نکلے۔ انہوں نے پورے تیس برس اس سونا صفت ملت کی خودی کو تعلیم کے تیزاب میں ڈالے رکھا۔ اب جا کر وہ سونے کے اس ہمالہ کو مٹی کا ڈھیر بنانے کے قابل ہوئے ہیں اور جس طرف چاہتے ہیں اسے پھیرنے لگے ہیں۔ تیس برس کے اس عرصے میں ملاّ کے وعظ و پند سے افغانستان کے کوہ و دمن گونجتے رہے ہیں، مسجدیں اور خانقاہیں آباد رہی ہیں اور منبر و محراب سے غیر اسلامی زندگی سے بچنے اور اسلامی زندگی اپنانے کی تلقین ہوتی رہی ہے مگر ملاّ کے سارے وعظ و پند، تصوف کی ساری گرم بازاری اور ارشاد و تلقین کی ساری کوششوں کے علی الرغم افغان معاشرہ فرنگی تہذیب میں ڈھلتا رہا ہے اور اب نوبت بایں جارسید کہ عورتیں نقاب نوچ پھینکنے کے بعد گلی کوچوں میں آتی ہیں تو مسرت و ابتہاج کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں کہ روایات آب و جد کی کہنہ زنجیریں بالآخر کاٹ دی گئیں اور زندگی کی طرحِ نو ڈال دی گئی۔

بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم

اور شاید مُلّا کو وہ وطن میں بیٹھا مطمئن ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کر رہا ہے اور تبلیغ اشاعتِ دین کا کام جاری ہے۔ ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اُنیس برس کے بعد:

افغانیوں کی خودی کے طلائی ہمالے کو مٹی کا ڈھیر ہوتے دو عشرے بھی پورے نہیں گزرے کہ افغانستان میں اشتراکی انقلاب آ گیا (اپریل ۱۹۷۸ء) اس سفر کی آخری منزل یہی ہو سکتی تھی جو افغان حکمرانوں نے اپنے لیے چُنا تھا۔ وہ چھپّن ستاون برس سے اس ملک پر مسلط تھے۔ اس عرصے میں دنیا میں بڑے بڑے اتار چڑھاؤ آئے، کتنے ہی ملک سامراجیوں کی غلامی سے چھوٹ کر رفعت و سربلندی کی راہ پر چلتے ہوئے کہیں سے کہیں جا پہنچے، کتنی ہی قومیں دوسری عالمی جنگ میں تباہی سے دوچار ہونے کے بعد پھر سے زندگی کی عظمتوں سے ہم کنار ہو گئیں، مگر یہ لوگ ایک مدت تک تو گردو پیش سے بے نیاز اور آنے والے کل سے بے خبر اصحابِ کہف کی طرح اناٹ غفیل پڑے رہے اور جب ہوش میں آئے تو یورپ کی ذہنی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال لیا۔ انہوں نے یورپ کی نقالی کو ترقی قرار دیا، مغرب سے مرعوب دوسرے مسلمان حکمرانوں کی طرح انہوں نے بھی مغربی قوموں کی ترقی کا راز اس بات میں سمجھا کہ ان کا رسم الخط رومن ہے، وہ شراب کے رسیا اور چنگ و رباب کی شیدائی ہیں، لادینی ان کا اوڑھنا بچھونا ہے، ان کی عورتیں بال کاٹے، نیم عریاں اور بے حجاب گھروں سے نکلتی ہیں اور کارخانوں اور دفتروں میں کام کرتی، کلبوں اور تھیٹروں

ہیں ناچتی، بازاروں میں شاپنگ کرتی اور سیل گرلز کی خدمات انجام دیتی نظر آتی ہیں۔ انہوں نے ذرا نہ سوچا کہ مغرب نے مادی میدان میں جو ترقی کی ہے اس کے اسباب کچھ اور ہیں بقول حضرت علامہ اقبال مرحوم :-

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقصِ دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحرانِ لالہ رُوست
نے ز عریاں ساق و نے از قطعِ مُوست
محکمی اورا نہ از لادینی است
نے فروغش از خطِ لاطینی است
قوتِ افرنگ از علم و فن است
از ہمیں آتش چراغش روشن است
حکمت از قطع و برید جامہ نیست
مانعِ علم و ہنر عمامہ نیست
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ
مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ
اندریں رہ جز نگہ مطلوب نیست
ایں کلہ یا آں کلہ مطلوب نیست
فکرِ چالاکے اگر داری بس است
طبعِ درّاکے اگر داری بس است

(مغرب کی قوت کا راز نہ تو چنگ و رباب میں ہے نہ بے حجاب بیٹیوں کے رقص، گل رُو ساحروں کے سحر، عریاں پنڈلیوں اور بال تراشنے میں۔ ان کا استحکام اور مضبوطی کا

انحصار نہ تو لادینی نظامِ زندگی پر ہے اور نہ رومن رسم الخط کے فروغ پر۔ افرنگیوں کی قوت ساری کی ساری علم و فن کی بدولت ہے۔ یہی وہ آگ ہے جس سے مغربی قوموں کا چراغ روشن ہے۔ حکمت و دانش لباس کی وضع قطع سے پیدا نہیں ہوتی اور نہ پگڑی علم و ہنر کو اپنانے کی راہ میں حائل ہوتی ہے۔ ایسے کھلنڈرے جوان علم و فن کے لیے فرنگی لباس کی نہیں عقل کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں کوئی شے اگر مطلوب ہے تو وہ نگہ ہے نہ یہ کہ ٹوپی کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اگر تو فکرِ چالاک کا مالک ہے اور گہرائیوں تک پہنچنے والی سوجھ بوجھ تجھ میں پائی جاتی ہے تو ان سے کام لے کر وہ علوم و فنون حاصل کر سکتا ہے جو مغرب کی مادی قوت کی اصل بنیاد ہیں)۔

عقل کے ان پتلوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ جس طرح بھیڑ اپنے گلے سے الگ ہو جائے تو وہ بھیڑیوں کا شکار ہو جاتی ہے اسی طرح کوئی قوم اگر اپنی نظریاتی اور تہذیبی اقدار کو چھوڑ دے تو سامراجی بھیڑیے اپنی نظریاتی کچلیاں چمکاتے ہوئے اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اور عقل کے یہ پتلے سوچتے بھی کیا؟ ان کی "فکرِ چالاک" اور "طبع دراک" کا تو یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنے جوانوں کو جدید تکنیکی اور غیر تکنیکی علوم سکھانے کے لیے جس ملک کی یونی ورسٹیوں اور فنی اداروں کو منتخب کیا وہ وسطِ ایشیا اور کریمیا کے کروڑوں مسلمانوں پر غلامی کا بدترین جوا مسلط کر چکا تھا اور ہر اس ملک کو فتح کرنے کے منصوبے پر صدیوں سے عمل پیرا ہے جو اس کی ایشیا کے گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرنے کی راہ میں آتا ہے! بدل اورال، قازان، استرخان، داغستان، ترکستان اور سمرقند و بخارا فتح کرنے کے بعد افغانستان اس کے منصوبے کا اولین ہدف تھا۔ یہی نہیں ان کی عقل و فہم کا شاہکار یہ تھا کہ انہوں نے اپنے فوجیوں کو تربیت بھی اسی ملک کے حربی اداروں میں دلوائی، جہاں فوجی تربیت سے زیادہ "نظریاتی تربیت" پر زور دیا جاتا ہے اور ایسے آدمی تیار کیے جاتے ہیں جو اپنے ملکوں میں جا کر اس کا کھیل کھیلیں۔

پھر ان حکمرانوں کی آنکھیں اس طرح بند ہو چکی تھیں کہ ملک میں انھوں نے اس دینی قوت کو کچل ڈالا جو اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا پرچم اٹھائے اس سامراج کی بڑھتی ہوئی یلغار کے آگے روک بن کر کھڑی ہو گئی تھی!! ان کی یہ بے بصیرتی نہ صرف خود ان کے اپنے پورے خاندان کو خون میں نہلا گئی بلکہ ملک کو ایک ایسے سامراج کے چنگل میں جکڑ گئی جس سے چھٹکارا پانے کے لیے نہ جانے کتنی نسلوں کو اپنے خون کا کفارہ دینا پڑے گا۔

(۲۶ جنوری ۷۹ء)